

دی مالِپ

Last Slave of the World



متحدہ ہندوستان کی آخری غلامِ عالیہ کی داستانِ عشق جو امریکی سول وار کا باعث بنی
اٹھارویں صدی کے پس منظر میں لکھی گئی ایک سلگتی ہوئی تحریر

رضوان علی گھمن

دی عالیہ

ایک امریکی رانجھے کی داستان عشق
اسے متحدہ ہندوستان کی غلام ہیر سے محبت ہو گئی تھی

انسانی حقوق کے لئے لڑی جانے والی دنیا کی طویل ترین جنگ
امریکن سول وار کے پس منظر میں لکھا گیا ایک رومانوی ناول

غلامی کے آخری چند سالوں کی داستان

رضوان علی گھمن

Whatsapp: 0049 152 1122 9099

Facebook: Rizwan Ali Ghuman

انتساب

امریکی صدر ابراہم لنکن کے نام۔۔۔۔

جس نے اس دنیا سے انسانی غلامی کو ہمیشہ ہمیشہ

کے لئے ختم کر دیا۔

پیش لفظ

دی عالیہ ناول انسانی غلامی پر لکھا گیا اردو کا پہلا ناول ہے۔ یہ متحدہ ہندوستان کی ریاست بہاولپور کی ایک نوجوان لڑکی عالیہ کی کہانی ہے جو اٹھارویں صدی کے وسط میں غلام بن کر امریکہ چلی جاتی ہے۔ وہ امریکہ میں غلام بنا کر بیچی جاتی ہے اور پھر اس غلامی کو ختم کرنے کے لئے جدوجہد کرتی ہے۔

دی عالیہ ناول اسی جدوجہد کی کہانی ہے۔ وہ ٹوٹی ہے، بکھرتی ہے، محبت کرتی ہے اور اس غلامی کو ختم کرنے کے لئے پورے امریکہ سے لڑتی ہے۔

دی عالیہ ناول بنیادی طور پر انسانی غلامی اور اس کے خلاف لڑی جانے والی جنگ امریکن سول وار پر لکھا گیا ہے۔ امید کرتا ہوں کہ دوست اسے پسند کریں گے اور آگے شیئر بھی کریں گے۔ دوستوں کی محبت اور ان کی مفید آراء کا منتظر

رضوان علی گھمن

Whatsapp: 0049 152 1122 9099

Facebook: Rizwan Ali Ghuman

دی عالیہ

”ابا! پروین کا رشتہ آیا ہے ساتھ والے گاؤں سے۔۔۔ وہ لوگ اس کی شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔“
عدنان نے گھر میں آتے ہی شور کرنا شروع کر دیا۔

میں صحن میں بچھی ہوئی ایک چار پائی پر تکیے سے ٹیک لگا کر لیٹا ہوا تھا۔ ہمارے گھر کے صحن میں نیم کا ایک درخت تھا۔ میں اسی نیم کے درخت کے سائے میں چار پائی پر لیٹا ہوا تھا جبکہ باقی گھر والے چولہے کے گرد اکٹھے ہو کر بیٹھے ہوئے تھے۔ عدنان میرے پوتے کا نام تھا۔ میری عمر اس وقت ایک سو بیس سال سے زیادہ ہو گئی ہے۔ اتنی زیادہ عمر ہونے کے باوجود ابھی تک میں اپنے پیروں پر قائم تھا۔ میری نظر تھوڑی کمزور ہو گئی تھی اور کمر میں بھی درد رہنے لگا تھا لیکن پھر بھی میں ابھی تک کسی کا محتاج نہیں ہوا تھا۔

میری عمر کے سبھی بزرگ کب کے مر چکے تھے لیکن مجھ سے شاید موت ہی روٹھ گئی تھی۔ اصل میں میری موت راجھستان کے ان صحراؤں میں لکھی ہی نہیں تھی، میں نے کہیں اور جا کر مرنا تھا۔ لیکن میں اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ یہ میرے محبوب کی زمین تھی۔ میری عالیہ روہی کے انہی ٹیلوں پر بھاگتی دوڑتی جوان ہوئی تھی۔ اس کا بچپن بہا پور کے اسی گاؤں میں گزرا تھا جہاں میں پچھلے سو سال سے ڈیرا ڈال کر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے عالیہ کو اس گاؤں میں کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن پھر بھی سو سال گزر جانے کے باوجود بھی مجھے ریگستان کے ایک ایک ذرے سے اس کی خوشبو محسوس ہوتی تھی۔

میں یہاں سے بہت دور کسی اور جگہ کا رہنے والا ہوں۔ عالیہ کی محبت مجھے یہاں کھینچ کر لائی تھی۔ میں

روہی کے سحر میں ایسا گرفتار ہوا کہ پھر دوبارہ واپس اپنے گھر جا ہی نہ سکا۔ میں پچھلے سو سال سے اس علاقے میں مقید ہو کر رہ گیا تھا۔ شاید میری موت میرے آبائی گھر میں لکھی تھی۔۔۔ لیکن میں اس علاقے کو چھوڑ کر اور کہیں بھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اپنی زندگی کے سو سال یہاں عالیہ کی محبت میں ڈوب ڈوب کر گزارے تھے اور اب مر کر اسی مٹی میں دفن ہونا چاہتا تھا۔ موت کو بھی اب مجھ سے ضد ہو گئی تھی۔ وہ مجھے یہاں مارنا نہیں چاہتی تھی اور میں اس جگہ کے علاوہ اور کہیں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ بس اسی مقابلے بازی میں بے مقصد جئے جا رہا تھا۔ میرے اندر جینے کی آس تو سو سال پہلے ہی ختم ہو گئی تھی لیکن میں خودکشی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ خودکشی محبت کی توہین ہوتی ہے۔ میں بزدل نہیں ہوں جو محبت کی آزمائشوں سے گھبرا کر موت کو گلے لگا لیتا۔ مجھے اسی دنیا میں رہتے ہوئے موت کا انتظار کرنا تھا۔

”ابا! وہ لوگ پروین کا رشتہ کہیں اور کر دیں گے۔ آپ ایک بار پھر اماں اور بھابی کو لے کر رشتہ مانگنے جائیں۔ بھابھی کی وہ لوگ بہت عزت کرتے ہیں اور وہ بھابھی کو رشتے سے جواب نہیں دیں گے۔“ عدنان اب چولہے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

میرا ایک ہی بیٹا تھا جس کا میں نے عبداللہ نام رکھا تھا۔ عبداللہ کی عمر 60 سال کے قریب تھی۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام عرفان تھا۔ اس کی شادی ہو چکی تھی اور اس کے دو بچے تھے۔ بڑے لڑکے کی عمر دس سال جبکہ چھوٹی بیٹی عالیہ جو کہ 6 سال کی بہت پیاری سی بچی تھی۔ سنہری بال اور نیلی آنکھیں وہ ڈرنی لینڈ کی فلموں کی ہیروئن کی طرح لگتی تھی۔ میرا بیٹا، پوتے اور پڑپوتے سارے مجھ پر ہی لگے تھے۔ میں راجھستان کا نہیں تھا اس لئے میرا رنگ اور نین نقش راجھستانی نہیں تھے۔ میں اور میری فیملی روہی میں رہنے کے باوجود روہی کے لوگوں سے مختلف تھے۔ عدنان عبداللہ کا چھوٹا بیٹا اور میرا پوتا تھا۔ یہ ابھی بیس سال کا تھا اور اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ نوجوان لڑکا تھا اس لئے محبت کے چکروں میں پڑ گیا تھا۔ چونکہ میرا پوتا تھا اس لئے دادا کا خون اس کی رگوں میں بھی دوڑ رہا تھا۔ پروین ہمارے ہی گاؤں کی رہنے والی تھی۔

”بھابھی! آپ بھی چلی جائیں نا ایک بار امی ابا کے ساتھ۔۔۔ وہ لوگ آپ کو رشتے سے انکار نہیں کریں گے۔“ عدنان اب اپنی بھابھی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

گاؤں میں ہماری مالی حیثیت کافی اچھی تھی۔ ہماری بیس ایکڑ زمین تھی جو دونوں بھائیوں عرفان اور عدنان کو دس دس ایکڑ آتی تھی۔ یہ بہت تھی لیکن عرفان کی بیوی فاطمہ کے گھرانے کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں

تھی۔ فاطمہ کے والد کی گاؤں میں 5 مربع زمین تھی جو کہ 125 ایکڑ بنتی ہے۔ گاؤں میں سب سے زیادہ زمین انہی کی تھی اور پورے گاؤں میں حکم بھی انہی کا ہی چلتا تھا۔ گاؤں کے لوگ فاطمہ کے والد کی عزت کرتے تھے۔ عدنان اسی لئے اپنی بھابھی فاطمہ کو بھی رشتے کے لئے بھیجنا چاہتا تھا۔

”دیکھو عدنان! ہم دونوں پہلے بھی تین بار ان کے گھر رشتہ لے کر جا چکے ہیں لیکن وہ لوگ تمہارے ساتھ اپنی لڑکی کا رشتہ نہیں کرنا چاہتے۔ اب ہم ان کے گھر کبھی نہیں جائیں گے۔ ان کی بیٹی ہے وہ جہاں اپنی بیٹی کا رشتہ چاہیں کریں، ہمیں کسی اعتراض کا کوئی حق نہیں ہے۔“ عبداللہ کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

”ابا! پروین کسی اور کے ساتھ شادی کر کے خوش نہیں رہے گی۔ ہم دونوں ایک دوسرے محبت کرتے ہیں۔“ عدنان نے پر زور لہجے میں کہا۔ میں بھی بستر پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے اپنے پوتے عدنان میں اپنا عکس نظر آنے لگا تھا۔

”بیٹا! وہ شریف لوگ ہیں اسی لئے تم دونوں بچ گئے ہو۔ یہ تمہارے والد کی بنائی ہوئی عزت ہے جس کی وجہ سے گاؤں والے تمہارا لحاظ کرتے ہیں۔ ورنہ اب تک تم دونوں گاؤں کے چوراہے میں پتھر مار مار کر مار دیئے گئے ہوتے۔ بیٹا یہ روہی ہے اور یہاں سب چلتا ہے لیکن محبت نہیں چلتی۔ بلکہ محبت تو پورے ہندوستان میں نہیں چلتی۔“ عبداللہ نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

پاکستان کو وجود میں آئے ہوئے 13 سال ہو چکے تھے لیکن ابھی بھی پرانے بوڑھے لوگ متحدہ ہندوستان کی ہی بات کرتے تھے۔ بہاولپور ریاست انگریزوں کے دور حکومت میں ایک آزاد ریاست تھی جسے پاکستان بننے کے آٹھ سال بعد 1955ء میں پاکستان میں شامل کیا گیا تھا۔ یہ 1960ء کا دور تھا اور ہمیں پاکستان میں شامل ہوئے ابھی صرف پانچ سال ہی ہوئے تھے۔ میری پیدائش 1839ء میں ہوئی تھی۔ یہ سکھوں کی سلطنت کے بانی مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات کا سال تھا۔ سکھوں کی سلطنت 1799ء میں اس وقت شروع ہوئی تھی جب سکھوں کے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کر لیا تھا اور لاہور کے گرد و نواح میں اپنی سلطنت قائم کر لی تھی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سلطنت راوی کے کنارے سے شروع ہوتی تھی اور آگے افغانستان کے کچھ علاقوں تک جاتی تھی۔ سکھ سلطنت مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مرنے کے مزید دس سال تک قائم رہی تھی اور 1849ء میں انگریزوں نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔ ہمارے ملک پاکستان کی سب سے بڑی بد نصیبی ہی

یہی ہے کہ ہم نے اپنی تاریخ اور ہیر و کو بھی مذہب کا لبادہ اوڑھا دیا ہے۔ ہم مسلمان بادشاہوں اور آزادی کے ہیر و کو تو یاد رکھتے ہیں لیکن پاکستانی سرزمین کے ان محسنوں کو فراموش کر دیتے ہیں جنہوں نے اس مٹی کی حفاظت کی ہے۔ ہمارے اپنی محسنوں میں سے ایک مہاراجہ رنجیت سنگھ اور ان کے کمانڈر ہری سنگھ نلوا ہیں۔ برصغیر کی پوری تاریخ ایرانی اور افغانی حملہ آوروں سے بھری پڑی ہے۔ پنجاب، کے پی کے اور فاٹا میں سکھ سلطنت کے قیام کے بعد یہ حملے ختم ہوئے تھے۔ سکھوں کی افغانیوں سے پہلی لڑائی 1751ء میں ہوئی تھی۔ جس میں سکھوں کے لیڈر اکالی بابا دیپ سنگھ نے پہلی بار افغانیوں کو شکست دے کر انہیں واپس افغانستان دھکیل دیا تھا۔

1799ء میں سکھ سلطنت کی باگ ڈور مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سنبھالی تو اس نے افغانیوں کو کابل تک محدود کر دیا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے چالیس سالہ دور اقتدار میں انگریز دریائے راوی کے کنارے تک محدود تھے جبکہ افغانی افغانستان میں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے انگریزوں کو راوی کر اس نہیں کرنے دیا تھا جبکہ افغانیوں کو بھی کابل سے باہر نہیں نکلنے دیا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے کمانڈر ہری سنگھ نلوا کی دہشت کابل کے گھروں میں مائیں اپنے بچوں کو بھی سناتی تھیں۔ آج فاٹا کی ایجنسیاں پاکستان میں شامل ہیں تو وہ اسی مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وجہ سے ہیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے چالیس سال تک ڈیورنڈ لائن کی حفاظت کی تھی۔ اس نے پاکستان کا ایک ٹکڑا بھی افغانستان کے ہاتھ میں نہیں جانے دیا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بعد انگریز آئے اور انگریزوں نے اسی سکھ سلطنت کے اوپر ہی ڈیورنڈ لائن کھینچ کر پاکستان اور افغانستان کا بارڈر بنادیا۔ آج کا موجود پاکستان مہاراجہ رنجیت سنگھ اور ان کے کمانڈر ہری سنگھ نلوا کی بہادری اور شجاعت کی وجہ سے ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی پاکستان کے محسنوں میں سے ایک ہیں۔ ہمیں ان کو بھی خراج تحسین پیش کرنا چاہیے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ صرف پاکستان کا ہی نہیں بلکہ پورے متحدہ ہندوستان کا محسن ہے۔ ہماری قوم کی بد نصیبی دیکھو کہ انڈیا نے ہندو لیڈروں کو ہیر و بنا لیا جبکہ پاکستان نے مسلمان ہیر و اپنا لیے۔۔۔ اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کہیں درمیان میں ہی گم ہو کر رہ گئے۔

میں اسی سال پیدا ہوا تھا جس سال برصغیر کے اس عظیم ترین لیڈر کی وفات ہوئی تھی۔ اس وقت میری عمر 121 سال ہو گئی تھی۔ ایوب خان کا دور تھا۔ ٹی وی، کمپیوٹر اور موبائل ابھی تک ہمارے علاقے میں نہیں تھا۔

ہمارے اس گاؤں میں 100 کے قریب گھر تھے اور سارے کے سارے کچے تھے۔ پاکستان میں سینما گھر موجود تھے جن میں انڈین اور پاکستانی دونوں فلمیں چلتی تھیں۔ سینما گھر ہمارے گاؤں سے دو سو کلومیٹر دور ملتان میں تھا۔ ہمیں تانگے پر پہلے 30 کلومیٹر دور پہلے یزمان جانا پڑتا تھا۔ اس کے بعد یزمان سے ایک بس آگے بہاولپور ملتان اور پاکستان کے دوسرے شہروں میں لے کر جاتی تھی۔ گاؤں کے صرف پانچ یا چھ لوگوں نے ہی آج تک ملتان شہر دیکھا تھا جبکہ فلم اور سینما کا تو نام بھی کسی کو معلوم نہیں تھا۔

یہاں کپاس اور گندم کی فصل ہوتی تھی۔ گھر کچے تھے لیکن دل بہت سچے تھے۔ گاؤں میں کوئی بھی رات کو بھوکا نہیں سوتا تھا۔ ہائی سکول گاؤں سے تین کلومیٹر دور تھا۔ لڑکے پانچویں یا چھٹی تک ہی پڑھ پاتے تھے اور اس کے بعد پڑھائی چھوڑ کر والد کے ساتھ کھیتی کے کام میں ہاتھ بٹانے لگتے تھے۔ ٹیل والا کے مرکزی ہائی سکول کو 35 کے قریب دیہات لگتے تھے جہاں سے لڑکے یہاں پڑھنے کے لئے آتے تھے۔ پینتیس دیہات کے سینکڑوں لڑکوں میں سے میٹرک کی کلاس میں صرف پندرہ سولہ لڑکے ہی پڑھتے والے ہوتے تھے اور ان میں سے بھی چار پانچ ہی پاس ہوتے تھے۔ کالج صرف شہروں میں رہنے والے لڑکوں کے لئے تھا۔ پانچویں تک لڑکوں اور لڑکیوں کا اکٹھا ہی پرائمری سکول تھا اس لئے لڑکیاں پرائمری تک تعلیم حاصل کر لیتی تھیں۔ اس سے آگے دور دراز کے ہائی سکولوں میں لڑکیوں کو نہیں بھیجا جاتا تھا۔ زیادہ تر لڑکیاں صرف دینی تعلیم (قرآن پاک) ہی پڑھ کر گھر بیٹھ جاتی تھیں۔ پندرہ سولہ سال کی عمر تک لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے ہی کھیلتے تھے۔ کسی کا بھی ذہن گندہ نہیں ہوتا تھا۔ پیار اور محبت جیسے جذبات کا کسی کو بھی علم نہیں تھا۔ گاؤں کی لڑکیوں کو لڑکے اپنی بہنیں سمجھتے تھے۔

عدنان پتہ نہیں کیسے باغی ہو گیا تھا، وہ پروین سے محبت کرنے لگا تھا۔ محبت پروین کو بھی عدنان سے تھی لیکن وہ لڑکی تھی اس لئے کبھی بھی اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ خاموشی سے جدھر ماں باپ کی مرضی ہوتی شادی کر لیتی۔ یہاں شادی شوہر، اس کے ماں باپ کی خدمت کرنا اور بچے پیدا کرنے کا نام تھا۔ مرد اور عورت کے اصل جذبات کو یہاں کوئی سمجھتا ہی نہیں تھا اور نہ ہی کوئی سمجھنا چاہتا تھا۔ عدنان ان سب سے مختلف تھا۔ وہ اس معاشرے سے بغاوت کر رہا تھا۔ وہ محبت کر رہا تھا اور اپنے دادا کے نقش قدم پر چلنے لگا تھا۔ اس چھوٹے سے بچے کو اتنا نہیں معلوم تھا کہ عشق کی راہیں بہت کٹھن ہوتی ہیں جو انسان کا چین سکون ہی چھین کر لے جاتی ہیں۔ پیچھے ایک کھوکھلا سا جسم رہ جاتا ہے جو عشق کی آگ میں جلتے جلتے آخر ایک دن فنا ہو

جاتا ہے۔

”ابا! میں نے اگر شادی کرنی ہے تو صرف پروین سے ورنہ ساری زندگی میں شادی ہی نہیں کروں گا۔“
عدنان نے اس بار دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

”اچھی بات ہے نا۔۔ ہمیں کسی اور فرد کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ فاطمہ ہماری بہت اچھی بہو ہے اور وحید اور عالیہ۔۔ ہمارا گھر تو مکمل ہے۔ یہ ٹھیک رہے گا۔ ہمیں دوسری بہو کی ضرورت ہی نہیں ہے۔“ عبداللہ نے ہلکی سے مسکراہٹ کے ساتھ اپنے بیٹے کی بات کا جواب دیا۔ اس کے چہرے پر شرارت چمک رہی تھی۔
عبداللہ ایسا ہی تھا۔ وہ بڑی سے بڑی بات بھی برداشت کر جاتا تھا۔ اس کے چہرے پر کبھی بھی غصہ نہیں آتا تھا۔ عدنان کا مسئلہ بہت سنگین تھا لیکن پھر بھی وہ پرسکون رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پورا گاؤں ہی عدنان کی وجہ سے ہمیں پیٹھ پیچھے گا لیاں دیتا تھا لیکن پھر بھی وہ احسن طریقے سے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا بیٹا اور بیٹی دونوں تین بار پروین کے گھر رشتہ لے کر گئے تھے لیکن وہ لوگ عدنان سے اپنی بیٹی کی شادی ہی نہیں کرنا چاہتے تھے۔

عدنان ہمارے گاؤں کا واحد لڑکا تھا جس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ تعلیم، شکل و صورت اور مالی حیثیت سے ٹھیک تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ امریکہ جانا چاہتا تھا۔ اسے امریکہ سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ اسے کہانیاں پڑھنے کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ اردو لٹریچر سے وہ انگلش لٹریچر تک آگیا۔ شروع شروع میں اس نے کچھ امریکی کہانیاں اردو میں ترجمہ شدہ پڑھیں اور پھر انگلش لٹریچر میں بھی پڑھنے لگا۔ پاکستان کی سب سے بڑی لائبریری اس وقت بہاولپور کی سینٹرل لائبریری تھی۔ یہاں لاکھوں کی تعداد میں اردو انگلش اور فارسی کتابیں موجود تھیں۔ عدنان مہینے میں ایک چکر بہاولپور کا لگاتا تھا اور وہاں سے نئی کتابیں لے آتا اور پرانی کتابیں واپس کر دیتا تھا۔ اس نے سینکڑوں انگلش کتابیں پڑھی تھیں اور انہی کتابوں کے سحر میں ڈوب کر وہ امریکہ کے سحر میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس نے دوبارہ امریکہ کے ویزے کے لئے درخواست دی تھی لیکن دونوں بار ہی ریجیکٹ ہو گیا۔

”دادو! ہمیں تو ایک پیاری سی چاچی چاہیے۔۔ اب امریکہ چاچا کی شادی کر دو اور ایک پیاری سی چاچی لا دو۔“ ننھی عالیہ نے اپنے دادا عبداللہ کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھولتے ہوئے کہا۔

گھر اور گھر سے باہر سبھی لوگ اسے ”امریکہ“ کے نام سے ہی بلاتے تھے۔ پنجابی معاشرے میں اصل

نام کی بجائے ہمیشہ الٹے نام سے ہی بلایا جاتا ہے۔ عدنان کا بھی اصل نام کسی کسی کو معلوم تھا۔ سب اسے امریکہ کے نام سے ہی جانتے تھے۔ صرف ہمارا گاؤں ہی نہیں بلکہ آس پاس کے دوسرے دیہات بھی اسے امریکہ کے نام سے ہی جانتے تھے۔ اس کی زندگی کے دو ہی مقصد تھے ایک پروین سے محبت کرنا اور دوسرا امریکہ جانے کا خواب۔۔۔ لیکن دونوں ہی خواب پورے ہوتے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ایک طرف پروین کے گھر والے مسلسل رشتے سے انکار کر رہے تھے جبکہ دوسری طرف امریکی سفارت خانے سے بھی دو بار اسے مسترد کیا جا چکا تھا۔ اب اس کے پاس آخری چانس تھا۔ اگر اس بار بھی اس کا ویزہ مسترد ہو جاتا تو پھر وہ کبھی بھی امریکہ نہیں جاسکتا تھا۔ عدنان کو آگے راستہ ہر طرف سے بند نظر آ رہا تھا۔

”ابا! آپ کچھ تو کرو۔“ عدنان نے تڑپ کر کہا۔

”بیٹا! میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں نے تین بار کوشش کی ہے لیکن اب مجھ سے مزید بے عزتی برداشت نہیں ہوتی۔“ عبد اللہ کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

”بیٹا! میں باقی لوگوں جیسا نہیں ہوں، میں نے کبھی تم لوگوں سے ایک باپ جیسا برتاؤ نہیں کیا بلکہ ہمیشہ دوستوں کی طرح رہا ہوں۔ میرے باپ نے زندگی میں کبھی مجھے گالی نہیں دی اور نہ ہی کبھی ہاتھ اٹھایا ہے۔ اس لئے آج تک میں نے بھی اپنی اولاد کو کبھی گالی نہیں دی۔ میں نے ہمیشہ تم لوگوں کو دوستوں کی طرح رکھا ہے۔ اولاد کو محبت اور پیار سے پالا جاتا ہے لیکن شاید تم اب مجھے غلط ثابت کر رہے ہو۔ تم میری محبت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو۔“ عبد اللہ کے لہجے میں بچھتاوے کی ہلکی سے جھلک نظر آنے لگی تھی۔

”ابا! میں نے بھی تو کبھی کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔۔۔ محبت کرنا اور امریکہ جانے کی کوشش کرنا کوئی غلط کام تو نہیں ہے؟ میں نے کچھ بھی غلط نہیں کیا ہے۔“ عدنان کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

”بیٹا! دونوں ہی غلط ہیں۔ اس دنیا میں نہ ہی محبت کے لئے جگہ ہے اور امریکہ تو ویسے ہی بہت دور ہے۔ امریکہ جانے کا خواب ہم دیکھ سکتے ہیں لیکن وہاں تک پہنچنا ہم غریبوں کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔“ عبد اللہ نے سرد لہجے میں کہا۔

60ء کی دہائی میں امریکہ جانا اتنا آسان نہیں تھا۔ امریکہ ویزا دیتے ہوئے بہت سختی کرتا تھا۔ اس زمانے میں یورپ اور ایشیاء سے لوگ امریکہ کا رخ کرتے تھے۔ دنیا میں اس وقت امریکہ اور روس صرف دو ہی بڑی طاقتیں تھیں۔ یورپ نے ابھی ترقی نہیں کی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کو ابھی صرف 15 سال ہی

گزرے تھے۔ پورا یورپ ہی کھنڈر بنا ہوا تھا۔ عرب ممالک کو بھی ابھی نیل کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔ پورا عرب خطہ ابھی ریگستان ہی تھا۔ چین کو بھی صرف پاکستان ہی جانتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور اس کے اثرات 15 سال گزرنے کے بعد بھی کم نہیں ہوئے تھے۔ لوگوں کو روزگار کے مواقع بہت کم میسر تھے۔ ایسے میں صرف امریکہ اور کینیڈا ہی دو واحد ملک تھے جو دوسری جنگ عظیم کے اثرات سے محفوظ رہے تھے۔ امریکہ نے اس جنگ میں حصہ ضرور لیا تھا، اس کے لڑاکا طیارے جرمنی اور جاپان کے خلاف لڑے بھی تھے لیکن وہ جنگ امریکہ تک نہیں پہنچی تھی کیونکہ امریکہ بہت دور تھا۔

امریکہ تک پہنچنے کے لئے ایک بڑے سمندر کو عبور کرنا پڑتا تھا۔ اسی سمندر نے امریکہ کو کئی صدیوں تک باقی دنیا سے چھپائے رکھا تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں بھی اسی سمندر نے امریکہ کو بچایا تھا۔ جرمن اور جاپانی لڑاکا طیارے اس سمندر کو پار ہی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے یہ جنگ صرف ایشیاء اور یورپ تک ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد لوگ جنگ سے محفوظ علاقوں کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ امریکہ مہاجرین کی سب سے بڑی منزل تھی۔ امریکی ایجنسی اسی وجہ سے سختی بھی بہت کرتی تھی۔ ایجنسی میں آنے والے دس فیصد ویزے ہی کامیاب ہوتے تھے جبکہ باقی مسترد ہو جاتے تھے۔ ویزے کے لئے بنیادی ضروری شرائط عدنان پوری ہی نہیں کر سکتا تھا۔ ویزے کے لئے ایک اچھی ملازمت ضروری تھی۔ زمین اور مکان بھی نام پر ہونا ضروری تھا۔ جبکہ بینک میں اکاؤنٹ اور اکاؤنٹ میں بھی کم از کم دس ہزار کے قریب رقم ہونی چاہیے تھی۔

60ء کی دہائی کے دس ہزار آج کے پچاس لاکھ کے برابر ہیں۔ ہم لوگ سارا سال فصل پر محنت کرتے تھے لیکن پھر بھی ہماری فصل کبھی دس ہزار کی نہیں ہوتی تھی۔ عدنان کے پاس نہ ہی کوئی نوکری تھی، نہ زمین اور نہ ہی بینک اکاؤنٹ۔ بینک ہمارے گاؤں سے 100 کلومیٹر دور بہاولپور شہر میں تھا۔ وہ ایجنسی کی مطلوبہ شرائط پر پورا نہیں اترتا تھا اس لئے مسترد ہو جاتا تھا۔ عدنان کا ویزہ دوبار مسترد ہو چکا تھا اور اب آخری باری تھی۔ اگر اس بار بھی وہ مسترد ہو جاتا تو پھر کبھی ویزہ اپلائی ہی نہیں کر سکتا تھا۔

”بیٹا! جہاں تین بار پہلے تم رشتہ لیکر گئے ہو وہاں ایک بار اور جا کر دیکھ لو! اس بار میں اور فاطمہ بھی تمہارے ساتھ چلتے ہیں، شاید وہ لوگ مان جائیں۔“ میں نے عبداللہ سے کہا۔

مجھے اپنے پوتے سے بہت محبت تھی۔ مجھ سے اس کا ٹوٹا ہوا دل دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ میرے ہی نقش

قدم پر چل رہا تھا۔ محبت کی کہانی ایک بار پھر دہرائی جانے لگی تھی۔ 1860ء سے شروع ہونے والی محبت ابھی تک ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک بار پھر شروع ہونے والی تھی۔

”ابا! آپ کہتے ہو تو ٹھیک ہے، ہم لوگ ایک بار پھر رشتہ لیکر چلے جاتے ہیں۔۔۔ لیکن مجھے پتہ ہے وہ کبھی بھی ہاں نہیں کریں گے۔“ عبداللہ نے مجھ سے کہا۔ اس کے لہجے میں کافی سنجیدگی تھی۔

”بیٹا! ہار جانے کے ڈر سے لڑنا تو نہیں چھوڑا جاسکتا؟ ہمیں کوشش تو ضرور کرنی چاہیے۔ باقی کامیابی اور ناکامی تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔“ میں تھوڑا فلسفی ہو گیا۔ اسی دن شام کو ہم سب لوگ پروین کا رشتہ لینے ان کے گھر پہنچ گئے۔

پروین کا دادا میرا بہت اچھا دوست تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے قریباً چالیس سال چھوٹا تھا۔ میری اس کے والد سے دوستی تھی جو آگے چل کر اس سے بھی ہو گئی۔ وہ میرے سامنے پیدا ہو کر بڑا ہوا تھا۔ اس کے والد کے گزرنے کے بعد یہی دوستی اس سے بھی ہو گئی جو آگے نصف صدی تک چلتی رہی۔ ہمارے ان لوگوں سے بالکل گھریلو تعلقات تھے۔ ہمارے بچے بھی ایک دوسرے کے گھروں میں آزادانہ آتے جاتے تھے۔ دونوں گھرانوں میں کوئی پردہ نہیں تھا۔ اسی آزادانہ ماحول میں پتہ ہی نہیں چلا کہ عدنان کی پروین سے دوستی ہوئی اور پھر یہ دوستی آگے محبت تک چلی گئی۔ ان دونوں کی بے وقوفی کی وجہ سے دونوں گھرانوں میں دوری ہو گئی تھی۔ جب سے عدنان اور پروین کی محبت منظر عام پر آئی تھی۔ دوستی اور رشتہ داری سب ختم ہو گئی تھی۔ دونوں گھروں کے افراد نے ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا بالکل ختم کر دیا تھا۔ عدنان اور پروین کی محبت نے دونوں گھروں کے درمیان بہت فاصلہ پیدا کر دیئے تھے۔ پرانی دوستی اور رشتہ داری کی وجہ سے کوئی جھگڑا یا لڑائی تو نہیں ہوئی تھی لیکن پھر بھی وہ لوگ اب ہم سے نفرت کرنے لگے تھے۔ عدنان نے اس گھر کی عزت خراب کر دی تھی۔

”نوید! کیسے ہو؟ طبیعت اب کیسی ہے؟“ میں نے پروین کے دادا نوید سے حال احوال پوچھا اور اس کی چار پائی کی پائنتی کی طرف ہی بیٹھ گیا۔ پروین کے دادا نوید کی عمر 80 سال کے قریب ہو گئی تھی۔ اسے اب گھٹنوں میں درد رہنے لگا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اب زیادہ تر چار پائی پر ہی پڑا رہتا تھا۔

”ٹھیک ہوں چاچا! کیسے آئے ہو؟“ وہ مجھے چاچا کہتا تھا۔

”دادا! پروین کے رشتے کی بات مت کرنا، اس کا رشتہ ہم نے کر دیا ہے۔ ساتھ والے گاؤں کے

نمبردار کا بیٹا ہے، دو مربع زمین ہے ان کی اور بہت کھاتا پیتا گھرانہ ہے۔ ہماری بیٹی ان کے گھر میں خوش رہے گی۔“ پروین کا ابا میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے رشتے کی بات کرنے سے ہی منع کر دیا۔

”رحمت ہم بڑی آس لے کر تمہارے گھر آئے تھے۔“

”بس دادا آگے کچھ بھی مت کہنا۔“

”لڑکی والے ہیں یہ ہماری عزت کا سوال ہے۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے مزید پوچھنے سے منع کر دیا۔

”مبارک ہو رحمت! خدا تمہاری بچی کے نصیب اچھے کرے۔“ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ باقی سارے لوگ کھڑے ہی تھے ہمیں کسی نے بھی بیٹھنے کے لئے نہیں بولا تھا۔

”بہت شکریہ دادا! شادی میں ضرور آنا۔“ اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”نمبرداروں کی بات کر رہے ہو۔۔۔ چار بیٹے ہیں ان کے اور ہر بیٹے کو آدھا آدھا مربع زمین آئے گی۔ میرے پوتے کے حصے میں بھی دس ایکڑ زمین آتی ہے، خدا نے شکل و صورت بھی اچھی دی ہے اور ہمارے گھر ان کو بھی تم اچھی طرح جانتے ہو۔ پروین میری بچی ہے اور یہ اپنے گھر سے رخصت ہو کر اپنے ہی گھر میں جاتی۔ رحمت! ہمارے رشتے میں کیا خرابی ہے۔؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”دادا! آپ کے رشتے میں کوئی خرابی نہیں ہے، بس میں اپنی بچی گاؤں میں بیاہنا ہی نہیں چاہتا۔“

رحمت نے جواب دیا۔

”میں عدنان کو دوسرے گاؤں میں گھر لیکر دے دیتا ہوں، وہ دوسرے گاؤں میں چلا جاتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”دادا! میں نے ان لوگوں کو زبان دے دی ہے اور میں اب اپنی زبان سے پھر نہیں سکتا۔“ اس نے تیز لہجے میں کہا۔

”رحمت بیٹا! زبان بیٹی کی زندگی سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتی۔ تمہاری بیٹی کوئی بھیڑ بکری نہیں ہے جسے تم اپنی زبان اور ان کی بھینٹ چڑھا رہے ہو۔ بیٹی ہے تمہاری۔۔۔ ایک جیتی جاگتی زندگی ہے۔ ایک بیٹی کی زندگی کے آگے زبان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔“ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”دادا! پروین میری بیٹی ہے اور میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں خوش رہے گی۔ آپ کی آمد کا بہت شکریہ!

اب آپ جاسکتے ہیں۔“ اس نے باہر دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”رحمت! بیٹیاں خدا کی رحمت ہوتی ہیں، تم لوگ ان کا ہاتھ پکڑ کر کسی بھی آدمی کے ہاتھ میں دے دیتے ہو۔ یہی بیٹیاں اپنے باپ اور بھائی کی عزت کی خاطر ساری زندگی اس شخص کی خدمت اور بچے پالنے میں لگا دیتی ہیں جس کے ہاتھ میں تم لوگ اس کا ہاتھ دیتے ہو۔ یہ بیٹیاں سسرال میں جتنی بھی دکھی ہوں کبھی اپنے ماں باپ کے سامنے حرف شکایت زباں پر نہیں لاتیں۔ کیوں؟ کیونکہ خدا نے انہیں تم لوگوں کے لئے رحمت بنایا ہے۔ لیکن کبھی سوچا ہے کہ بیٹیاں تو رحمت ہوتی ہیں لیکن کبھی کبھی باپ اور بھائی کیوں زحمت بن جاتے ہیں؟ ہر بار بیٹی ہی قربانی دیتی ہے، کبھی کبھی باپ کو بھی قربانی کے لئے آگے آ جانا چاہیے۔“ میں اس کے بعد وہاں رکا نہیں اور ہم لوگ واپس گھر آ گئے۔ عدنان ہمارا ہی گھر میں انتظار کر رہا تھا۔ ہمارے مایوس چہرے دیکھ کر اسے مزید کچھ پوچھنے کا حوصلہ ہی نہیں رہا۔ وہ ہمارے چہروں سے ہی سمجھ گیا کہ ہم لوگ ناکام واپس لوٹے ہیں۔ وہ خاموشی سے اندر کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔

”بیٹا! پریشان ہو؟“ میں اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلا گیا۔

”نہیں دادا! ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنے والے آنسو مجھے نظر آرہے تھے۔

”بیٹا! پریشان نہیں ہوتے، خدا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکال دے گا۔“ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔

”دادا! راستہ ہی تو نظر نہیں آرہا ہے۔۔۔ نہ امریکہ جانے کے لئے اور نہ ہی پروین کو پانے کے لئے۔ دادا! مجھے تو کچھ بھی نظر نہیں آرہا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو بڑھ گئے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔

”دادا! یہ جو محبت ہوتی ہے نایہ بہت درد دیتی ہے۔ بہت زیادہ درد ہوتا ہے، شاید آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہوگا۔ محبت کا درد صرف محبت کرنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔“ وہ میرے کاندھے پر سر رکھ کر رونے لگا گیا تھا۔ وہ مجھے محبت کی تشریح کر کے بتا رہا تھا۔ اسے لگتا تھا شاید اس دنیا میں وہی ایک محبت کرنے والا ہے۔

”دادا! اگر آپ نے محبت کی ہوتی تو آپ کو اس محبت کا صحیح احساس ہوتا، آپ کو میرے جذبات کا پتہ چلتا۔“ اس کے رونے میں اب کمی آ گئی تھی۔

”بیٹا! محبت تو اس دنیا میں سب ہی کرتے ہیں۔ محبت کا جذبہ اگر سچا ہو تو محبت مل بھی جاتی ہے اور جو نہیں ملتی وہ محبت نہیں ہوتی بلکہ صرف ایک خواہش ہوتی ہے۔ محبت اور عشق یہ دونوں کبھی بھی جسم کے محتاج نہیں ہوتے۔ محبت تو روح کو روح سے ہوتی ہے۔ پروین اگر تمہیں نہیں ملتی تو کیا محبت ختم ہو جائے گی؟“ میں نے اس سے سوال کیا۔

”دادا! میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے خدا سے کبھی کچھ نہیں مانگا، صرف ایک پروین ہی تو مانگی ہے۔ خدا وہ بھی نہیں دے رہا۔“ اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آنے لگے تھے۔

”دادا! کیا آپ نے بھی کبھی کسی سے محبت کی ہے؟“ اس نے مجھ سے سوال کیا۔

”بیٹا! کبھی تم نے ہم سب کے ناموں پر دھیان دیا ہے؟ ہم سب کے نام عین (ع) سے ہی کیوں شروع ہوتے ہیں؟ میرے بیٹے اور پوتوں کے نام عین سے شروع ہوتے تھے۔ صرف ایک وحید کا نام الگ تھا اور وہ بھی ہماری پھوپھو فاطمہ نے ضد کر کے رکھا تھا۔ میں اس کا نام بھی عارف رکھنا چاہتا تھا لیکن فاطمہ اور دوسرے گھر والوں کے سامنے میری نہ چل سکی اور اس کا نام وحید رکھ دیا گیا۔ جبکہ میں اسے عارف کے نام سے ہی بلاتا تھا۔“

”دادا محبت میں عین کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ آپ نے سب کے نام عین سے کیوں رکھے ہیں؟“ وہ میرے بات سمجھ نہیں سکا تھا۔

”بیٹا! میرے محبوب کا نام عین سے شروع ہوتا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”عین (ع) سے۔۔۔ لیکن دادا ہماری دادی کا نام تو نور ال بی بی تھا؟“ وہ ابھی تک الجھا ہوا تھا۔

”عدنان بیٹا! تمہاری دادی نور ال بی بی سے میں نے شادی کی تھی، محبت نہیں۔ محبت میں نے کسی اور سے کی تھی۔ وہ کوئی اور تھی جس کے نام کا پہلا حصہ تم سب کے ناموں کا حصہ ہے۔“ میں اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

”عالیہ کی یاد آتے ہی جسم میں ٹوٹ پھوٹ سی ہونے لگتی تھی۔“

”دادا! آپ کی شادی نہیں ہو سکی تھی؟ کیا آپ کو اپنی محبت نہیں ملی تھی؟“ اسے میری باتوں سے دلچسپی ہونے لگی تھی۔

”بیٹا! محبت صرف ملن کا نام ہی نہیں ہے۔ وصل یا تو صرف نصیب والوں کو ہی ملتا ہے۔ جبکہ محبت کی

معراج تو ان رانجھوں کو ملتی ہے جو محبوب کی راہوں میں زندگی گزار دیتے ہیں۔“ میں دور بہت دور خلاؤں میں گھور رہا تھا۔

”دادا! آپ نے کبھی اپنے ماضی کے بارے میں ہمیں کچھ نہیں بتایا۔۔۔ آپ کون ہو، کہاں سے آئے ہو؟ آپ کے ماں باپ بہن بھائی رشتہ دار۔۔۔ ہم نے کبھی کچھ نہیں سنا۔ صرف اتنا پتہ ہے کہ آپ انڈیا کے کسی دور دراز علاقے سے یہاں روہی میں آ کر بسے ہیں۔“ اس نے سوال کیا۔ میں نے اپنے بارے میں کبھی کسی کو نہیں بتایا تھا پورے گاؤں میں کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں سے آیا ہوں اور اس علاقے میں کیوں آیا ہوں۔

”دادا اپنے بارے میں کچھ تو بتاؤ۔“ عدنان دوبارہ مجھ سے پوچھنے لگا۔

”نہیں بیٹا! اس راز کو راز ہی رہنے دو، ماضی کو یاد کرنے سے درد ہوتا ہے۔۔۔ بہت درد۔ مجھ میں اب اس درد کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ میں صرف سمجھانے آیا ہوں۔“ میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

پروین کے گھر والوں نے عدنان کے رشتے سے انکار کرنے کے بعد دوسری جگہ رشتہ کرنے میں بڑی جلدی کی تھی۔ انہوں نے دو دن بعد ہی منگنی کر لی اور پندرہ دن بعد شادی کی تاریخ بھی رکھ لی۔ ان کے گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ایک ہفتے بعد عدنان امریکہ کے ویزے کے لئے کراچی گیا تو امریکی سفارت خانے نے تیسری بار بھی اس کا ویزہ مسترد کر دیا۔ اب وہ امریکہ کے لئے ویزہ ہی اپلائی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا امریکہ جانے کا خواب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔ اس دور میں پاکستان کا دار الخلافہ کراچی ہوا کرتا تھا۔ سبھی ملکوں کے سفارت خانے کراچی میں ہی تھے جبکہ اسلام آباد شہر تعمیر ہو رہا تھا۔ ابھی تک حکومت کراچی سے ہی کنٹرول ہو رہی تھی۔

یورپ کے ویزے آسان تھے کیونکہ دوسری جنگ عظیم میں یورپ کا بہت نقصان ہوا تھا۔ یورپ میں مردوں کا قتل عام ہوا تھا اس لئے یورپ میں مردوں کی تعداد کم ہو گئی تھی۔ یورپ نے کارخانے اور فیکٹریاں تو کھڑی کر لی تھیں لیکن ان کے پاس مزدور نہیں تھے۔ یورپ کو فیکٹریوں میں کام کرنے کے لئے نوجوانوں کی ضرورت تھی۔ یورپی ممالک ایشیائی اور افریقی ممالک سے نوجوان مردوں کو بلا کر اپنے ممالک میں بسا رہے تھے۔ میں نے عدنان کو فرانس چلے جانے کا مشورہ دیا لیکن وہ نہیں مانا۔ اس کی خواہش صرف امریکہ ہی تھی۔

وہ ٹوٹ گئی تو اس کے بعد اس کے لئے سب کچھ بے معنی ہو گیا۔ اس زمانے میں جرمنی اور فرانس کے لئے ویزے کی ضرورت تو پڑتی تھی لیکن ویزا ایک دن میں ہی مل جاتا تھا۔ لوگ پاسپورٹ لیکر صبح آٹھ بجے کراچی آ کر جرمنی یا فرانس کے کسی سفارت خانے میں جا کر پاسپورٹ دیتے تھے۔ دوپہر دو بجے سے پہلے پہلے سفارت خانے سے ویزا لگا دیا جاتا تھا اور لوگ شام کی فلائیٹ سے روانہ بھی ہو جاتے تھے۔ یورپ کو آدمیوں کی ضرورت تھی اس لئے وہ اتنی زیادہ انکوائری نہیں کرتے تھے۔

امریکہ کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ امریکہ اپنی دریافت کے پہلے پچاس سال ہی کچھ کمزور رہا تھا۔ اس کے بعد سے آج تک اس کی طاقت میں کبھی کمی نہیں آئی تھی۔ اس نے اٹھارویں صدی سے ہی دنیا کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی تھی جو آج بھی قائم ہے۔ شاید میرے کچھ دوست میری اس بات سے اختلاف کریں لیکن یہ حقیقت ہے۔ پوری دنیا میں بننے والی پالیسیوں پر امریکہ براہ راست اثر انداز ہوتا ہے۔ عدنان کا ویزا ریجیکٹ ہوا تو وہ بالکل ہی الجھ کر رہ گیا۔ اس کی کسی بھی چیز میں دلچسپی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ گاؤں والوں کو بھی پتہ چل گیا تھا کہ وہ اب کبھی بھی امریکہ نہیں جاسکے گا۔ گاؤں والے اب اس کا مذاق اڑانے لگے تھے۔ لوگ اب اسے امریکہ کے نام سے چڑانے لگے تھے۔ لوگوں کے طعنوں سے تنگ آ کر اس نے گھر سے باہر نکلتا ہی بند کر دیا تھا۔ پروین کی شادی کو دو دن رہ گئے تھے۔ عبداللہ اور عمران دونوں ڈیرے پر گئے ہوئے تھے۔ میں حسب معمول صحن میں نیم کے درخت کے نیچے چار پائی ڈالے لیٹا ہوا تھا۔ عدنان اندر کمرے میں ہی لیٹا ہوا تھا۔ جبکہ باقی بچے باہر صحن میں ہی کھیل رہے تھے۔ عدنان نے اب گھر سے باہر بلکہ کمرے سے باہر نکلتا ہی بند کر دیا تھا۔ وہ اب کسی سے بھی بات نہیں کرتا تھا۔ ماں روٹی دیتی تو خاموشی سے کھا لیتا، کپڑے دیتی تو پہن لیتا۔ اس نے خود سے خواہش کرنا ہی ختم کر دیا تھا۔ اسے اب کسی بھی چیز کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ وہ بالکل رانجھا ہی بن گیا تھا۔ امریکہ اور پروین دونوں کا دکھ ہی اسے لیکر بیٹھ گیا تھا۔ وہ امریکی رانجھا بن گیا تھا۔ اسے اب گاؤں والے امریکی رانجھے کے نام سے بلانے لگے تھے۔

”دادا! میں جینا نہیں چاہتا، مرجانا چاہتا ہوں۔“ عدنان میری چار پائی کے نزدیک آ کر کھڑا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کی ہوئی تھیں اس لئے مجھے اس کی آمد کا پتہ ہی نہیں چلا۔

”دادا! مجھے اس زندگی سے نفرت ہو گئی ہے۔ یہ دنیا میں پروین سے ملنے نہیں دے گی، اب اوپر آسمانوں میں ہی ہمارا ملن ہوگا۔“ اس کی آنکھیں مایوسی سے بھری ہوئی تھیں۔

”خودکشی حرام ہے بیٹا!“ میرے منہ سے صرف اتنا ہی نکل سکا تھا۔ میں چار پائی پراٹھ کر بیٹھ گیا۔
 ”دادا! مجھے معلوم ہے کہ خودکشی حرام ہے لیکن مجھ میں اب مزید جینے کا حوصلہ ہی نہیں ہے۔“ وہ مکمل طور پر مایوس ہو چکا تھا۔

”مایوسی گناہ ہے بیٹا!“ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”دادا! مجھے اب گناہ اور ثواب سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اب محبت میں اس قدر آگے آچکا ہوں کہ مجھے ثواب جنت اور دوزخ سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ پروین کے ساتھ میسر ہو تو دوزخ بھی قبول ہے۔ ورنہ پروین کے بغیر جنت کا کیا مزا؟ دادا! ہم دونوں نے اکٹھے مرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ پروین بھی کسی اور کی ڈولی میں بیٹھنے سے پہلے مرجانا زیادہ پسند کر لے گی۔ شادی کے دن اس گاؤں سے ڈولی نہیں میتیں اٹھیں گی۔“ وہ اٹھ کر جانے لگا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”عدنان! تمہیں پتہ ہے تم لوگ کیا کرنے جا رہے ہو؟ اس سے کتنی بدنامی ہوگی؟ دونوں گھرانے کسی کو بھی مند دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ بیٹا! یہ صحیح راستہ نہیں ہے۔“ میں نے اس کو روکتے ہوئے کہا۔
 ”دادا! مجھ میں اب جینے کا حوصلہ ہی نہیں ہے۔ آپ نے بھی محبت کی ہے، آپ کو اس کا زیادہ احساس ہوگا۔“ اس کی آنکھوں سے مایوسی نکل گئی تھی اور اب اس کی جگہ عزم نے لے لی تھی۔

”عدنان! محبت تو میں نے بھی کی ہے لیکن میں تو نہیں مرا؟ میں ابھی تک زندگی سے لڑ رہا ہوں اور پتہ نہیں اور کتنے مزید سال زندہ رہوں گا۔ محبوب نہ ملے تو عاشق مرنے کو نہیں جاتا؟ ایک سو بیس سال کا ہو گیا ہوں اور ابھی تک محبت کے بغیر مزید جینے کا حوصلہ بھی ہے۔“ میں اسے قائل کرنے لگا۔

”دادا! یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ اصل زندگی میں جب محبت ہوتی ہے تو یہ انسان کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اگر اپنی بات کرتے ہو تو ٹوٹ تو آپ بھی چلے ہو گے۔ ورنہ روہی کے ان صحراؤں میں کون آتا ہے؟ آپ بھی تو اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو چھوڑ کر اس ریگستان میں بھٹک رہے ہو؟ محبوب سے پیچھا چھڑا کر یہاں آئے ہونا؟ ورنہ ان صحراؤں میں کیا رکھا ہے جہاں خدا کی رحمت (بارش) بھی کبھی کبھی سالوں میں برستی ہے۔“ عدنان کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آرہے تھے۔

”دادا! آپ نے صرف علاقہ چھوڑا تھا لیکن ہم دونوں دنیا ہی چھوڑ رہے ہیں۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔“ اس نے مجھ سے اپنا ہاتھ چھڑوایا اور باہر جانے لگا۔

”عدنان! دونوں میں بہت فرق ہے۔ تم اس ریگستان کی بات کرتے ہو؟ یہ ریگستان ہی میرا گھر ہے۔ یہ گاؤں میرے محبوب کا گاؤں ہے۔ اسی گاؤں میں وہ پیدا ہوئی تھی اور یہیں اس کا بچپن گزرا ہے۔ مجھے آج بھی ریت کے ان ٹیلوں سے اس کی خوشبو آتی ہے۔ میں نے علاقہ چھوڑا نہیں بلکہ اپنے محبوب کے علاقے سے اپنے محبوب کے نام سے محبت کر کے اسے اپنا لیا ہے۔ میں آج بھی اسی شدت سے محبت کرتا ہوں لیکن اس محبت کے لئے خود کشی نہیں کر سکتا۔ اس دنیا میں ایک کامیاب امتحان دیکر جاؤں گا تو دوسری دنیا میں محبت مل سکے گی ورنہ دونوں جہانوں میں ہی خالی ہاتھ رہنا پڑے گا۔“ میری آنکھوں میں بھی اس بار پانی آچکا تھا۔

”بیٹا! پروین ان کی بیٹی ہے۔ وہ اگر پروین کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں نہیں دینا چاہتے تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ تم پروین کو بھول جاؤ بیٹا! ہم تمہارے لئے بہت اچھی لڑکی ڈھونڈیں گے۔ وہ پروین سے بہت زیادہ کو خوبصورت ہوگی۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”نہیں دادا! پروین نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ میں بہت چھوٹا ہوں اور مجھے آپ جیسی محبت نہیں کرنی آتی۔ میں آپ کی طرح رانجھا بن کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ اس لئے مرنے جا رہا ہوں۔ اس زندگی کا کیا فائدہ جو پروین کی محبت کے بغیر ہو۔“ وہ اٹھ کر باہر کی طرف جانے لگا لیکن میں نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا۔

”عدنان! مجھے ایک موقع اور دو۔۔۔ میں ایک بار پھر کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ شاید اس بار کام بن جائے۔ میں نے پچھلے سالوں سے اپنی محبت کو چھپا کر رکھا ہوا تھا لیکن اب اپنی اولاد کی خاطر اسے ظاہر کرنے جا رہا ہوں۔ عدنان! پروین تمہاری ہی دلہن بنے گی۔ یہ تجھ سے تیرے دادا کا وعدہ ہے۔“

”دادا! اب اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ پروین کے والد کبھی بھی اپنی بیٹی کا رشتہ میرے ساتھ نہیں کریں گے۔“ اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

”نہیں! اس بار انہیں میری بات ماننی ہی پڑے گی۔ میں نے اس محبت میں بڑے دھکے کھائے ہیں۔ میں اب کسی اور کو رانجھا نہیں بننے دوں گا۔ آؤ میرے ساتھ! یہ بات آج ہی کسی نتیجے پر پہنچے گی۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے لیکر پروین کے گھر چلا گیا۔ وہ سارے گھر میں ہی شادی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ گھر کے صحن میں سامنے ہی پروین کے والد رحمت بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے عدنان کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ میں سیدھا اس کے پاس چلا گیا۔

”رحمت! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ میں نے پروین کے والد رحمت سے کہا۔

”ہاں دادا بولو! کیا کہنا چاہتے ہو؟“ رحمت کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے سے نکل رہے تھے۔

”ادھر نہیں اندر کمرے میں۔۔۔ تمہارے والد اور تم سے اکٹھے میں بات کرنی ہے۔“ میں نے

کمرے کی طرف اشارہ کیا تو وہ آرام سے میرے ساتھ چلتا ہوا کمرے میں چلا گیا۔ پروین کا دادا بھی کمرے میں ہی لیٹا ہوا تھا۔

”نوید! کیسے ہو؟“ میں نے اس کی چار پائی پر جا کر بیٹھ گیا۔

”ٹھیک ہو چاچا! آپ سناؤ کیسے آئے ہو؟“ وہ بھی چار پائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”ابا! پھر پروین کا رشتہ ہی لینے آئے ہیں، ان کو اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ پورے گاؤں والے اب

باتیں کرنے لگے ہیں۔ میں تو پروین کی شادی کے بعد یہ گاؤں ہی چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ مجھ سے اب لوگوں

کے طعنے نہیں سنے جاتے۔“ رحمت نے درمیان میں بولتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر بے بسی سی چھائی ہوئی تھی۔

”چاچا! پروین تمہاری پوتیوں جیسی ہے۔ اس کی عزت آپ کی بھی عزت ہے، پھر کیوں بدنام کر رہے

ہو؟“ پروین کے دادا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”نوید! پروین میری پوتی نہیں بلکہ پڑپوتی بنتی ہے۔ آپ کے گھر سے میرا بہت پرانا رشتہ ہے۔ ایک

صدی سے بھی پرانا تعلق ہے آپ کے گھرانے سے۔“ وہ سب میرے طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”چاچا! کیا بات کر رہے ہو؟ جو بھی کہنا ہے کھل کر کہو، مجھے تمہاری بات سمجھ نہیں آئی ہے۔“ اس نے مجھ

سے پوچھا۔

”نوید! عالیہ کو جانتے ہو؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”عالیہ کون؟ تم کس عالیہ کی بات کر رہے ہو؟“ اس نے الجھتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کی پھوپھی عالیہ کی بات کر رہا ہوں۔ آپ کی والدہ کی بڑی بہن تھیں۔۔۔ آپ کو یاد ہیں وہ

؟“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”چاچا! آپ عالیہ کو کیسے جانتے ہیں؟ ابو نے آپ سے عالیہ کا ذکر کیا ہوگا؟“ اس نے مجھ سے پوچھا۔

وہ اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”نوید صاحب! آپ کی پھوپھی عالیہ کو یہاں سے ہمارے شہر میں بھیجا گیا تھا۔ وہ ہمارے شہر آئی تھی۔“ میں نے کمرے کی چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اسے تو انگلستان لے جایا گیا تھا۔ وہ ہندوستان کے کسی شہر نہیں بلکہ انگلستان گئی تھیں۔ تو کیا چاہا آپ انگریز ہو؟“ اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میرے سر کے بال آدھے سے زیادہ گر چکے تھے۔ آنکھوں کی روشنی بھی بہت کم ہو گئی تھی لیکن پھر بھی بالوں کا سنہری رنگ اور نیلی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ میرے چہرے کی سفید رنگت پر صحرا کی گرمی نے کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ آگے میری اولاد بھی مجھ پر ہی گئی تھی۔

”دادا! آپ انگریز ہو؟“ اس بار پروین کے والد رحمت نے مجھ سے سوال کیا۔

”نہیں رحمت! میں انگریز نہیں ہوں۔ تمہاری دادی انگلستان نہیں امریکہ گئی تھی۔ وہ متحدہ ہندوستان کی پہلی اور آخری غلام تھی جسے فرانسیسیوں نے امریکیوں کے ہاتھوں بیچا تھا۔ تمہارے والد کی پھوپھو عالیہ کو ایک امریکی کاشت کار نے خریدا تھا۔“ میں نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

”دادا! آپ امریکی ہو؟ آپ امریکہ سے ہجرت کر کے یہاں پاکستان آئے تھے؟“ عدنان نے اس بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں بیٹا! میں امریکہ میں ہی پیدا ہوا ہوں۔ عالیہ کو میرے ہی گاؤں کے ایک زمیندار نے خریدا تھا۔ وہ اس زمیندار کی غلام تھی اور اس کے کھیتوں میں کام کرتی تھی۔“ میں نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ میری آنکھوں میں پانی آچکا تھا۔

”نوید! تمہاری پھوپھی بہت بہادر اور اچھی خاتون تھیں۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں ان سے زیادہ ہمت والی عورت آج تک نہیں دیکھی۔ خدا نے اس بے چاری کی قسمت میں غلامی لکھ دی تھی لیکن پھر بھی اس نے کبھی گلہ نہیں کیا تھا۔ نوید! آج میں اس صحرا میں صرف تمہاری پھوپھی عالیہ کی وجہ سے ہوں۔“ میری آواز لڑکھڑائی۔ مجھے ماضی بڑی شدت سے یاد آنے لگا تھا۔

”چاہا! تم نے عالیہ پھوپھو کو دیکھا ہے؟ کیسی تھیں وہ اور ان کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ انہیں روہی کی یاد آتی تھی؟ انہیں اپنے بھائی کی یاد آتی تھی؟“ پروین کے دادا نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر دیئے۔ شدت

جذبات سے ان کا جسم کانپنے لگا تھا۔

”نوید! عالیہ کو یہ گاؤں بہت یاد آتا تھا۔ تمہارے والد اور پھوپھی صرف دو ہی بہن بھائی تھے۔ وہ اپنے ماں باپ اور بھائی کو بہت شدت سے یاد کرتی تھی۔ کپاس کے بڑے بڑے کھیتوں میں دوسروں سے چھپ چھپ کر آنسو بہاتی تھی۔ نوید! تمہاری پھوپھی عالیہ نے بہت دکھ دیکھے ہیں، بہت درد اور تکلیفیں سہی ہیں۔ میں نے وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔“ میری آنکھیں مسلسل چھت کو ہی تک رہی تھیں۔

”رحمت بیٹا! میں آج اگر اس گاؤں میں ہوں تو اسی عالیہ کی وجہ سے ہوں۔ میں اور میرا پوتا عدنان آپ کے ہی خاندان کا حصہ ہیں، ہم غیر نہیں ہیں۔“ میں نے پروین کے والد رحمت کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

”رحمت! تم مجھے اور میرے خاندان کو اچھی طرح جانتے ہو۔ اس پورے گاؤں میں صرف ایک میرا ہی گھر ہے جہاں عورت کو بھی وہی عزت اور مقام دیا جاتا ہے جو گھر کے مردوں کو حاصل ہے۔ تمہاری بیٹی میرے گھر میں ہمیشہ خوش رہے گی۔ وہ بہنیں بیٹی بن کر ہمارے گھر میں جائے گی۔“ میں نے ایک بار پھر پروین کے رشتے کی بات چھیڑتے ہوئے کہا۔

”نہیں دادا! اب بہت دیر ہو گئی ہے۔ پرسوں پروین کی شادی ہے اور میں اب اس رشتے سے انکار نہیں کر سکتا۔“ رحمت نے سنجیدگی سے کہا۔

”یار! دونوں بچوں کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ یہ دونوں کبھی بھی الگ الگ نہیں رہ سکیں گے، دونوں بچے مرجائیں گے۔ رحمت! پروین بیٹی ہے تمہاری، کوئی گائے بھینس نہیں ہے جسے تم اپنی مرضی سے کسی بھی کھونٹے پر باندھ دو گے۔“ میں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

”دادا! پروین اس شادی سے خوش ہے، اسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں باپ ہوں اس کا۔۔۔ کبھی اس کے لئے برا نہیں سوچوں گا۔“ اس نے واضح انکار کرتے ہوئے کہا۔

”رحمت! صرف اوپر اوپر سے ہی باپ بنے ہو کبھی بیٹی کے دل میں جھانک کر نہیں دیکھا ہے۔ عدنان! پروین باہر ہی کھڑی ہوگی اسے اندر بلاؤ۔“ میں نے عدنان سے کہا تو اس نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ پروین اور دوسرے گھر والے باہر کھڑے ہمارا ہی انتظار کر رہے تھے۔

”پروین! تمہارے ابا اندر بلا رہے ہیں۔“ اس نے یہیں سے ہی آواز لگائی تو پروین اندر آ گئی۔

عدنان نے میرے اشارے پر پھر دروازہ بند کر دیا۔

”پروین بیٹا! تم اس شادی سے خوش ہو؟“ وہ میرے پاس آ کر کھڑی ہوئی میں اسے پوچھنے لگا۔

”دادا! میں خوش ہوں۔۔۔ اب جہاں میری شادی کرنا چاہیں میں انکار نہیں کروں گی۔“ اس نے زمین

کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بس دادا! اب تسلی ہو گئی ہے؟ میری بیٹی کبھی بھی اپنے باپ کا سر نیچا نہیں ہونے دے گی۔“ رحمت

نے مجھ سے کہا۔

”پروین! اگر اس شادی سے خوش ہو تو پھر زمین کی طرف نہیں بلکہ میری آنکھوں میں دیکھ کر کہو۔ کیا تم

اس گھر میں جا کر خوش رہو گی؟“ میں نے اسے سامنے دیکھنے کے لئے کہا۔

”پروین بیٹا! تمہاری مرضی کیا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”دادا! لڑکیوں سے ان کی مرضی نہیں پوچھی جاتی۔ میں اپنے باپ اور بھائیوں کی خوشی میں خوش

ہوں۔“ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا! اگر اس شادی سے خوش ہو تو پھر زمین کی طرف نہیں بلکہ میری آنکھوں میں دیکھ کر کہو۔ کیا تم

میں دیکھ رہا تھا۔ مجھے عدنان نے زہر کے متعلق بنا دیا تھا۔ وہ دونوں شادی کے دن زہر کھا کر خودکشی کرنے

والے تھے۔ دونوں بچے محبت سے ناکام ہونے کے بعد انتہائی قدم اٹھانے پر تیار ہو گئے تھے۔ اس

کے لئے انھوں نے زہر بھی حاصل کر لیا تھا۔ شادی کے دن اسے پروین سے ملنے کا موقع نہ ملتا اس لئے اس

نے دو دن پہلے ہی زہر کی ایک چھوٹی پڑی پروین کے پاس پہنچا دی تھی۔

”کیا بات کر رہے ہو دادا! کس کے پاس زہر ہے؟“ پروین کے والد نے جلدی سے پوچھا۔

”تمہاری بیٹی کے پاس ہے رحمت! کبھی کبھی محبت کی زیادتی بھی جان لے لیتی ہے۔ یہ دونوں بچے

اپنی جان دینے والے ہیں۔“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

”پروین! یہ سچ کہہ رہے ہیں؟“ اس نے اس بار اپنی بیٹی سے سوال کیا۔

”نہیں ابا! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

”پروین! میری طرف دیکھ کر بات کرو! کیا تمہارے پاس زہر نہیں ہے؟“ میں نے تیز لہجے میں

کہا۔ اس کی نظریں بدستور زمین پر جھکی ہوئی تھیں۔

”زہر مجھے دیدو! تمہیں اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے ایک بار پھر مطالبہ کیا لیکن اس نے کوئی ردِ عمل نہ دکھایا۔

”عدنان! پروین سے کہو کہ وہ زہر لا کر مجھے دے دے۔“ میں نے اس بار عدنان سے کہا۔
 ”پروین۔۔۔“ عدنان نے ابھی اس سے صرف اتنا ہی کہا تھا۔

اس نے فوراً اپنا رخ کمرے کی دیوار کی طرف پھیرا اور اپنے کپڑوں سے سفید پاؤڈر کی ایک پڑیا نکال کر میرے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دی۔ اس زمانے میں زہر سفید پاؤڈر کی شکل میں ہی ملتا تھا۔ یہ عام کسی بھی پنساری کی دوکان سے آسانی سے مل جاتا تھا۔ گاؤں میں سارے ہی کچے مکانات تھے اور ان مکانوں میں چوہوں کی بھی بڑی تعداد موجود تھی۔ چوہے کچی دیواروں میں آسانی سے بل بنا لیتے تھے۔ تقریباً ہر گھر میں ہی چوہے موجود ہوتے تھے۔ پاؤڈر والے زہر کو پانی میں گھول کر اس سے آٹا گوندھا جاتا تھا اور پھر اس آٹے کی گولیاں بنا کر کمروں میں چوہوں کی بیلوں کے سوراخوں پر رکھا جاتا تھا۔ چوہے زہر ملی گولیاں یا دوسرا کھانا کھا کر مر جاتے تھے۔ یہ زہر بڑی آسانی سے سبھی پنسار کی دوکانوں پر مل جاتا تھا۔ عدنان وہی چوہوں کو مارنے والا زہر لے کر آیا تھا۔ پروین نے زہر کی پڑیا نکال کر میرے ہاتھ میں رکھ دی۔ اس کے ساتھ ہی عدنان نے بھی زہر کی ایک اور پڑیا اپنی جیب سے بھی نکال کر مجھے پکڑادی۔

”رحمت! بیٹیوں کو سمجھنے کے لئے دل بھی بیٹیوں جیسے ہی ہونے چاہیے۔ تم ایک بیٹی کے باپ تو ہو لیکن تم نے کبھی بیٹی کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے۔ یہ اپنے باپ یا بھائیوں کو کبھی بھی انکار نہیں کرتیں بس کبھی کبھی اگر محبت کی زیادتی ہو جائے تو نادانی میں غلط قدم اٹھا لیتی ہیں۔ تم اس کی شادی کر رہے تھے لیکن یہ مرنے جا رہی تھی۔“ میں نے دونوں زہر کی پڑیاں رحمت کے ہاتھ میں پکڑا دیں۔

”پروین! میں نے تمہیں ہمیشہ بیٹیوں سے بڑھ کر جانا تھا۔ ہمیشہ تمہیں خوش رکھنے کی کوشش کی ہے لیکن آج یہ کیا ہے؟ تم تو خود کشی کر کے اپنے باپ اور بھائیوں کی عزت خاک میں ملانے والی تھی۔“ وہ پروین سے شکوہ کرنے لگا۔

”رحمت! یہی تو خود کشی کی بڑی وجہ ہے۔ یہاں بھی تمہیں اپنی اور اپنے بیٹوں کی عزت کی فکر ہے جو اس کے مرنے پر خاک میں مل جانی تھی۔ عزت صرف تمہاری یا تمہارے بیٹوں کی ہی ہے۔۔۔ کیا بیٹی کی عزت نہیں ہوتی؟ ہمیشہ عورت ہی سب کی عزت ہوتی ہے۔ باپ کی، بھائی کی، شوہر کی، بیٹوں کی۔۔۔ لیکن کیا اس

کی عزت نہیں ہوتی؟ ہم اپنی عزت بچانے کے لئے ایک عورت کی عزت کا خیال کیوں نہیں کرتے؟ وہ کیا چاہتی ہے، کس کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔۔۔ اس کی مرضی پوچھنے سے کسی مرد کی عزت کم نہیں ہو جاتی، کبھی پوچھ کر تو دیکھو۔“ میں نے رحمت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے دادا! جو پروین چاہتی ہے میں کرنے کو تیار ہوں۔“

”پروین بیٹی! تمہاری کیا مرضی ہے؟“ اس نے مجھ سے اور پھر براہ راست بیٹی سے سوال کیا۔

”ابا! جو آپ چاہتے ہیں میں وہی چاہتی ہوں۔ جس کے ہاتھ میں مرا ہاتھ دو گے میں ساری زندگی اس کے ساتھ ہنسی خوشی گزار دوں گی۔“ پروین نے ٹھوس لہجے میں کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

”دادا! مجھے ایک دن سوچنے کا وقت دو۔۔۔ میں کل تک آپ کو جواب دے دوں گا۔“ رحمت نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے بیٹا! جیسے تمہاری مرضی۔ پروین بیٹی ہے تمہاری تم اس کے لئے اچھا ہی سوچو گے۔“ میں نے عدنان کا ہاتھ تھا ماورا سے لیکر واپس گھر آ گیا۔

”دادا! پروین کی دادی سے آپ کی شادی ہوئی تھی؟ اور آپ امریکہ سے ہو؟“ عدنان نے میرے پاس بیٹھے ہوئے کہا۔

”بیٹا! میں نے اس راز کو ایک صدی تک اپنے دل میں چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ آج صرف تمہاری وجہ سے مجھے یہ سب بتانا پڑا ہے۔“ میرے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

”دادا! آپ امریکہ کے بارے میں کچھ تو بتائیں۔ آپ امریکہ کی کس ریاست میں رہتے تھے؟“ عدنان میرے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

”نہیں عدنان! میں کچھ بھی نہیں بتاؤں گا۔ مجھے ماضی کو یاد کرنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ میری صحت اب اس تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لئے بیٹا تم مجھ سے مزید کوئی اور سوال مت کرو۔“ میں نے چارپائی پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

میں عدنان سے بات ہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنے ماضی میں کسی کو بھی حصہ دار نہیں بنانا چاہتا تھا۔ یہ ماضی صرف میرا تھا اور مجھے اس ماضی سے بہت محبت تھی۔ شام کو عارف اپنے والد اور پروین کو لیکر ہمارے گھر آ گئے۔ ہم لوگ کھانا کھا چکے تھے اور اب چائے کا انتظار کر رہے تھے۔ گاؤں میں بجلی نہیں تھی اس لئے

گاؤں والے کھانا سر شام سورج ڈوبنے سے پہلے ہی کھا لیتے تھے۔

”آؤ آؤ پاجی! بیٹھیں، کھانا تیار ہے۔ آپ کھانا تو کھاؤ گے نا؟“ عبد اللہ نے جلدی سے ان کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔ عدنان نے چو لھے کے پاس ہی ایک چارپائی لاکر ڈال دی تھی۔

”نہیں عبد اللہ! ہم کھانا نہیں کھائیں گے۔ ابھی ابھی گھر سے ہم کھانا کھا کر ہی آئے ہیں۔ اس لئے آپ زحمت مت کریں۔“ رحمت نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”چلو کوئی بات نہیں پاجی! چائے تو پیئیں گے ہی نا؟ کھانا ہم نے بھی کھا لیا ہے اور اب چائے کا ہی انتظار کر رہے ہیں۔“ عبد اللہ پر خیال نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے یار! آپ چائے بنا لو ہم بھی آپ کے ساتھ چائے پی لیں گے۔“ اس نے رضامندی دکھائی تو عبد اللہ نے عرفان کی بیوی فاطمہ کی طرف دیکھا۔

وہ جلدی سے چو لھے میں لکڑیاں ڈالنے لگی۔ چائے تقریباً تیار ہو چکی تھی۔ اس نے مزید دودھ اس میں ڈال دیا اور لکڑیاں جلانے لگی۔ کپاس کے پودے چار فٹ سے سات فٹ تک لمبے ہوتے ہیں اور ان کا تنا بھی تین انچ سے زیادہ موٹا ہوتا ہے۔ کپاس کی چنائی کے بعد ہم انھیں کاٹ کر سٹور کر لیتے ہیں اور پورا سال ہم اسی لکڑی کو جلا کر کھانا بناتے ہیں۔ جنوبی پنجاب اور سندھ میں یہی کپاس کی لکڑی ایندھن کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ چائے کی پتی پشاور اور افغانستان سے آتی تھی یہ کافی مہنگی تھی۔ لیکن دیہاتوں میں اس کی عادت ایک نشے کی طرح پھیل چکی تھی۔ پورے گاؤں میں سگریٹ صرف ایک یا دو لوگ ہی پیتے تھے لیکن چائے پورا گاؤں ہی پیتا تھا۔ حقہ بھی بہت استعمال ہوتا تھا۔ شراب پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ یزمان اور بہاولپور دونوں نزدیکی شہروں میں شراب کی دوکانیں تھیں جہاں سے شراب مل جاتی تھی لیکن گاؤں والے انتہائی مذہبی تھے۔ میں نے کسی کو بھی شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ چائے تیار ہو گئی تو عدنان نے اپنی بھابی کے ساتھ مل کر چائے کو پیالیوں میں ڈالا اور ایک ایک کر کے سبھی کو چائے پکڑا دی۔

”عبد اللہ! میں اپنی بیٹی پروین کا رشتہ عدنان سے کرنے کے لئے تیار ہوں، لیکن میری ایک شرط ہے۔۔۔“ رحمت نے چائے کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

”جی پاجی! ہم آپ کی ہر شرط پوری کرنے کے لئے تیار ہیں، آپ بتائیں ہمیں کیا کرنا ہوگا۔“ عبد اللہ ان کی بات سن کر خوش ہو گیا۔ عدنان کے چہرے پر بھی اچانک رونق آ گئی۔ پچھلے دو سال سے لگی ہوئی اس

کش کش کو آخر کنار امل رہا تھا۔ میں بھی چار پائی پراٹھ کر بیٹھ گیا۔

”عبداللہ! میری صرف ایک ہی شرط ہے، عدنان یہ شادی امریکہ جا کر کرے۔ یہ دونوں امریکہ جا کر شادی کر لیں اور وہیں امریکہ ہی میں رہیں۔ شادی کرنی ہے تو پروین کو اپنے ساتھ امریکہ لے جاؤ ورنہ اسے بھول جاؤ!“ عبداللہ نے ایک دھماکہ کر دیا۔ عدنان کا ویزہ مسترد ہو چکا تھا۔ وہ خود امریکہ نہیں جاسکتا تھا تو پروین کو کیسے لے کر جاتا۔

”چاچا! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ کو کبھی معلوم ہے کہ میرا ویزہ مسترد ہو چکا ہے، یہ ناممکن ہے۔“ عدنان نے درمیان میں بولتے ہوئے کہا۔ فکر مندی کی لکیں اس کے ماتھے پر پھیل چکی تھیں۔ پروین اس کے بالکل پاس آتے آتے اچانک پھر دور ہو گئی تھی۔

”پاجی! آپ ہمارے گھر میں آئے ہیں۔ مجھے آپ کے آنے کی خوشی ہے لیکن۔۔۔ پاجی! یہ تو ناممکن سی شرط ہے، وہ خود امریکہ نہیں جاسکتا تو پروین کو کیسے لیکر جائے؟“ عبداللہ ان کی شرط سن کر ہکا بکا رہ گیا۔

”یار! مجھے معلوم ہے یہ ناممکن سی شرط لگتی ہے لیکن بحر حال میں اس گاؤں کے اندر اپنی بیٹی کی شادی نہیں کر سکتا۔ عدنان اور پروین کی وجہ سے پہلے ہی گاؤں میں ہماری عزت خاک میں مل چکی ہے۔ گاؤں کے لوگ ہماری پیٹھ پیچھے ہزاروں باتیں کرتے ہیں۔ عبداللہ! میں اپنی بیٹی کا رشتہ عدنان کے ساتھ کر کے لوگوں کے طعنہ نہیں سن سکتا۔ گاؤں کے لوگ ہمیں طعنہ دے دے کر ہی مار دیں گے۔ میں یہ شادی کبھی بھی نہ ہونے دیتا لیکن اپنے اباجی کی وجہ سے مجبور ہو گیا ہوں۔ یہ پروین کی شادی عدنان سے کروانا چاہتے ہیں۔“ رحمت نے اپنے والد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! میں ایک بار اپنی پھوپھو کی قبر دیکھنا چاہتا ہوں۔“ میرے والد اور پھوپھو صرف دو ہی بہن بھائی تھے۔ وہ اپنی بہن سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کے بچھڑ جانے کے بعد وہ بہت روئے تھے۔

”بیٹا! میں نے ان کو چھپ چھپ کر اپنی بہن عالیہ کی یاد میں روتے ہوئے دیکھا ہے۔ میری دادی بھی اپنی بیٹی کے غم میں روتے روتے آنکھوں سے اندھی ہو گئی تھیں۔ میں نے اس غم کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں عالیہ کی قبر دیکھنا چاہتا ہوں اور اس کی کہانی سننا چاہتا ہوں۔ وہ بے چاری دیس سے پردیس ہوئی اور اسی دیس میں خاموشی سے مر گئی۔ میں صرف ایک بار اس کی قبر پر جا کر دعا مانگنا چاہتا ہوں۔ اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے باپ اور دادی کے لئے صرف ایک بار عالیہ کی قبر پر جا کر دعا کرنا چاہتا ہوں! شاید میرے دعا

کرنے سے ان سب کی روحوں کو سکون آ جائے۔“ پروین کے دادا کی آنکھوں میں پانی آچکا تھا۔ وہ رونا لگ گیا تھا۔

”معاف کرنا بیٹا! میں تم دونوں بچوں کو استعمال کر کے اپنا مقصد پورا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ اس نے باقاعدہ عدنان کے آگے ہاتھ باندھ دیئے۔

”نہیں دادا آپ یہ مت کرو، آپ مجھے گنہگار کر رہے ہو۔“ عدنان جلدی سے ان کے پیروں میں جا کر بیٹھ گیا۔

”بیٹا! اب سب کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اگر پروین اور ابا جان کو امریکہ لے جاسکتے ہو تو ٹھیک ہے میں کل ہی دوسرے گاؤں جا کر پروین کے رشتے سے انکار کر دیتا ہوں۔ اگر نہیں لے جاسکتے تو بیٹا تم بھی پروین کو بھول جاؤ اور ابا جان بھی اپنی پھوپھی عالیہ کو بھول جائیں گے۔“ اس بار رحمت نے کہا۔

”یہ عالیہ پھوپھی کا کیا معاملہ ہے۔“ عبداللہ سوالیہ نظروں سے ان سب کی طرف دیکھنے لگا۔ اس اس سارے معاملے کی کوئی خبر نہیں تھی۔ رحمت نے اسے مختصر کر کے سارا واقعہ سنایا۔

”ابا آپ عالیہ پھوپھی کو جانتے ہیں؟“ عبداللہ نے مجھ سے سوال کیا۔

”ہاں بیٹا میں عالیہ کو جانتا ہوں۔ اسے یہاں سے امریکہ بھیجا گیا تھا۔ میں عالیہ کی پوری داستان سے واقف ہوں۔ وہ بہت اچھی تھیں لیکن تمہاری پھوپھی نہیں تھیں۔“ میں نے آخری جملے پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”عالیہ میری محبوب تھی۔ وہ میری پہلی اور آخری محبت تھی۔“

”بیٹا کیا سوچا ہے۔ کیا دونوں کو امریکہ لے جاسکتے ہو؟“ عبداللہ نے اپنے سوال کی طرف آتے ہوئے کہا۔ اسے معلوم تھا کہ عدنان کبھی بھی دونوں کو امریکہ نہیں لے جاسکے گا۔ پروین کی شادی وہیں ہوگی جہاں اس نے پروین کا رشتہ طے کیا تھا۔

”چاچا آپ کو معلوم ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ امریکہ کوئی ساتھ والا گاؤں نہیں ہے جو میں آرام سے چلا جاؤں گا۔ سات سمندر پار ایک بڑا اور طاقت ور ملک ہے۔ میں کبھی بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکوں گا۔ آپ کو اگر اپنی عزت کا سوال ہے تو میں پروین کو لے کر یورپ کے کسی دوسرے ملک چلا جاتا ہوں؟“ عدنان کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ امریکہ نہیں جاسکے گا اس لئے

اس نے کوئی مہلت بھی نہیں مانگی تھی اور نہ ہی کوئی امید ظاہر کی تھی۔ وہ اپنے قول و فعل میں سچا تھا۔ اس لئے اس نے سیدھی بات کر دی۔

”نہیں میری صرف یہی شرط ہے اور میں اسی پر قائم رہوں گا۔ دونوں کو لے جاسکتے ہو تو ٹھیک ورنہ پرسوں پروین کی شادی اپنے مقررہ وقت پر ہی ساتھ والے گاؤں میں کر دی جائے گی۔“ رحمت نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

پورے گھر میں مکمل خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ سبھی کے چہرے عدنان کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ پروین بھی اپنی نظروں کو جھکائے عدنان کے جواب کی منتظر تھی۔ میرے کان بھی عدنان کا جواب سننے کے منتظر تھے۔

”معاف کر دینا پروین! میں وہ خواب نہیں دکھا سکتا جن کی تعبیر ممکن نہ ہو۔ میں نہ ہی خود امریکہ جاسکتا ہوں اور نہ ہی کسی اور کو لیکر جاسکتا ہوں۔ میرے باپ اور دادا نے میرے تربیت اچھی کی ہے، میں غلط لڑکا نہیں ہوں۔ اس لئے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کروں گا جسے میں کل پورا نہ کر سکوں۔ آپ پروین کی شادی ساتھ والے گاؤں میں کر دیں۔ ہماری محبت آپ کے گھر کی عزت سے زیادہ نہیں ہے۔“ عدنان نے اپنے دونوں ہاتھ معافی کے انداز میں باندھتے ہوئے کہا۔ وہ اٹھ کر رحمت کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔

”بیٹا! مجھے افسوس ہے میں محبت کے خلاف نہیں ہوں لیکن یہ دنیا بہت ظالم ہے۔ یہ انسان کو طعنے دے دے کر زندہ درگور کر دیتی ہے۔ شاید ابھی تمہیں اس چیز کی سمجھ نہ آئے لیکن کل کو جب تم کسی بیٹی کے باپ بنو گے تو پھر تمہیں خود بخود سمجھ آ جائے گی۔“ رحمت کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

”چلو پروین بیٹی! گھر چلتے ہیں۔۔۔ شادی کو صرف ایک دن رہ گیا ہے اور ہمیں بہت تیاری کرنی ہے۔“ اس نے پروین کا ہاتھ پکڑا اور وہ لوگ باہر کی طرف جانے لگے۔

”ایک منٹ رو کر رحمت! میں ان سب کو امریکہ لے جاسکتا ہوں۔“ میں نے پیچھے سے آواز دی۔

”دادا! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ تو بہت بوڑھے ہو گئے ہیں اور آپ کو تو امریکہ کا ویزا نہیں ملے گا۔“ عدنان نے میرے پاس آ کر کہا۔ پروین اور اس کے والد میری بات سن کر رک گئے تھے۔

”بچے! یہ سوچنا میرا کام ہے۔ اب صرف تیاری کرو، کافی پیسے لگیں گے۔۔۔ عبد اللہ! کتنے پیسے ہیں تمہارے پاس؟“ میں نے اپنے بیٹے عبد اللہ سے پوچھا۔ وہ بھی اب میرے قریب آ گیا تھا۔ بلکہ سارا گھر

ہی اس وقت میری طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ ایک سوئیس سال کا ایک بوڑھا بابا امریکہ جانے کی بات کر رہا تھا۔ حیرانگی کی بات یہ تھی کہ وہ اکیلا نہیں بلکہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لیکر جا رہا تھا۔

”ابا! فصل تو اس بار کافی اچھی ہوئی ہے اور میرے پاس کافی پیسے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ عدنان کی شادی کے لئے بھی پیسے اکٹھے کئے تھے، سونا بھی کافی موجود ہے جو عدنان کی بیوی کے لئے بنایا تھا۔ اگر وہ بھی بیچ دوں تو تقریباً 50 ہزار کے قریب قریب پیسے بن جائیں گے۔“ عبداللہ نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

60ء کی دہائی میں 50 ہزار آج کے پچاس لاکھ کے برابر ہوتے تھے۔ اس زمانے میں شادیوں پر بہت خرچ آتا تھا۔ دلہن کو سر سے لیکر پاؤں تک سونے کے زیورات دیئے جاتے تھے۔ مہمان دور دور سے آتے تھے اور مہینہ مہینہ رہ کر جاتے تھے۔ آج کی شادی تو بہت مختصر اور کم خرچ ہو گئی ہے۔ ورنہ ہمارے زمانے میں تو ایک بچے کی شادی کرنے کے بعد اگلے پانچ سات سال تک دوسرے بچے کی شادی کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔

”سونے کو رہنے دو، نقد رقم کتنی ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”ابا! دس ہزار کے قریب تو گھر میں ہی پڑے ہوئے ہیں اور پانچ ہزار میں نے نمبردار کے گھر میں رکھوائے ہوئے ہیں۔ ٹوٹل پندرہ ہزار ہے۔ باقی اگر مزید بھی چاہیے تو میں قرضہ بھی لے سکتا ہوں۔“ عبداللہ نے پوری تفصیل سے بتایا۔

اس سے بھی اپنے بیٹے عدنان کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ جب سے پروین کی شادی ہوئی تھی وہ بالکل بچھ کر رہ گیا تھا۔ عدنان ہمارے گھر میں سب سے زیادہ شرارتی اور تیز لڑکا تھا۔ اس کی شرارتوں اور مستیوں سے ہمارا گھر جنت بنا ہوا تھا۔ لیکن محبت کے چکروں میں پڑ کر وہ بالکل ہی مرجھا گیا تھا۔ اس نے ہنسنا بولنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہی گھر جو اس کے قہقہوں سے گونجتا تھا آج ویران ویران سا لگنے لگا تھا۔ عبداللہ اپنے بیٹے عدنان کی خوشیوں کے لئے اپنا سب کچھ ہی لٹانے پر تیار ہو گیا تھا۔ شاید باپ اسی کو ہی کہتے ہیں۔ ماں کی محبت تو سبھی کو نظر آ جاتی ہے لیکن محبت کرنے میں باپ بھی کسی سے کم نہیں ہوتا۔ چونکہ باپ گھر کا سربراہ ہوتا ہے۔ گھر کو چلانے کے لئے تھوڑی سختی ضرور کرنا پڑتی ہے۔ اس وجہ سے شاید باپ کی محبت اس سختی میں تھوڑی دب جاتی ہے لیکن محبت ضرور ہوتی ہے۔ باپ اپنے بیٹوں کے لئے سب کچھ کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ آج عبداللہ بھی اپنے بیٹے کے لئے سب کچھ کرنے پر تیار ہو گیا تھا۔

”ابا! آپ کو کتنے پیسے چاہئیں؟“ وہ مجھ سے پوچھنے لگا۔

”یار! میرے خیال میں پندرہ ہزار سے کام چل جائے گا۔ باقی تھوڑا سونا پروین بہن کر ہمارے ساتھ جائے گی، اگر ضرور پڑی تو ہم وہ سونا بیچ دیں گے۔ امریکہ کے لئے کمٹئیں اور پھر وہاں جا کر کرائے پر گھر بھی لینا پڑے گا۔ کھانا پینا بھی ہوگا لیکن پھر بھی پندرہ ہزار میں کام بن جائے گا۔ عدنان کو انگلش زبان بھی آتی ہے اور کافی سختی بچہ بھی ہے۔ وہاں آرام سے کام مل جائے گا۔“ میں نے عدنان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی دادا! میں امریکہ جاتے ہی کوئی اچھا سا کام تلاش کر لوں گا۔ آپ سب کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“ عدنان نے پر جوش انداز میں کہا۔ پروین کو پانے کی امید اسے ہو گئی تھی اس لئے اس کی روایتی شوخی بھی واپس آ گئی تھی۔

”پھر بھی ابا! پندرہ ہزار بہت کم ہیں۔۔۔ آپ چار لوگ ہوں گے اور کافی خرچہ آ جائے گا۔ میں پچیس ہزار تک کر لیتا ہوں۔ ہمارے پاس تین بھینسیں ہیں میں دو بیچ دیتا ہوں۔ گھر کی ضرورت کے لئے ایک بھینس ہی کافی ہے۔“ عبداللہ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

”نہیں بیٹا! ہمارا کام ہو جائے گا۔ ہمارے پاس تھوڑا سونا بھی ہوگا اور دو مہینے بعد کپاس کی فصل بھی تیار ہو جائے گی۔ وہاں کپاس کی چنائی کے لئے مزدوروں کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ پروین اور عدنان دونوں کو کپاس کے کھیتوں میں کام مل جائے گا۔“ میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”دادا! امریکہ میں بھی کپاس ہوتی ہے؟“ میرے بڑے پوتے عرفان نے سوال کیا۔

”بیٹا! کپاس ہوتی ہی امریکہ میں ہے۔ کپاس کو پوری دنیا میں متعارف تو ہم انڈینز نے کیا ہے۔ کپاس کی سب سے پہلی کاشت ہم نے ہی کی ہے اور یہاں سے ہی کپاس یورپ افریقہ اور امریکہ گئی ہے۔ لیکن آج پوری دنیا میں جتنی کپاس کی کاشت ہوتی ہے اس کا نصف امریکہ ہے۔ (اٹھارویں اور انیسویں صدی تک امریکہ ہی کپاس کا سب سے بڑا کاشت کار ملک تھا۔ امریکہ کو صنعتی اعتبار سے سپر پاور بنانے میں کپاس کا ہی مین کردار تھا۔ اس دور میں لاکھوں کی تعداد میں کپڑے کے کارخانے چل رہے تھے۔ صنعتی انقلاب کے دور میں امریکہ پورے یورپ کو کاٹن سپائی کرتا تھا)

”دادا! پھر تو امریکہ میں بہت مزا آئے گا۔۔۔ مجھے کپاس کی چنائی کرنے میں بہت مزا آتا ہے۔“

پروین نے بھی اس بار ہماری گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

”دادا! ایک بار سوچ لو! یہ ہماری عزت اور بے عزتی کا سوال ہے۔ اگر ان سب کو مریکہ لے جاسکتے ہو تو میں دوسرے گاؤں والوں کو انکار کر کے اپنی بیٹی کا ہاتھ آپ کے پوتے کے ہاتھ میں دے دیتا ہوں۔ ورنہ۔۔۔“ پروین کے والد نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”رحمت! میں یہ کر سکتا ہوں۔ ہم سب کل ہی یہاں سے کراچی جائیں گے۔ تم بے فکر ہو کر پروین کو ہمارے ساتھ بھیج دو۔ ان دونوں کا نکاح اب امریکہ میں ہی جا کر ہوگا، یہ میرا آپ سب سے وعدہ ہے۔ یہ عام حسین کا وعدہ ہے۔“ میں نے اونچی آواز میں کہا۔

”ٹھیک ہے دادا! میں آج ہی دوسرے گاؤں جا کر پروین کے رشتے سے انکار کر کے آتا ہوں۔ آپ اس گاؤں کے سب سے نیک اور شریف ترین انسان ہیں۔ مجھے آپ پر پورا اعتماد ہے۔ آج سے پروین آپ کی پوتی ہے۔“ اس نے کافی دیر سوچنے کے بعد آخر فیصلہ سنایا دیا۔

”ابا! میں ابھی پروین کے رشتے سے جواب دینے جا رہا ہوں۔ آپ اسے لے کر گھر چلے جانا۔“ اس نے اپنے باپ سے پروین کو گھر لے جانے کا کہا اور خود باہر چلا گیا۔ وہ دوسرے گاؤں جا رہا تھا۔

دوسرے دن دس بجے کے قریب میں نے عدنان، پروین اور پروین کے دادا نوید کو ساتھ لیا اور گھر اور گاؤں والوں کو خیر باد کہہ دیا۔ ہم سب ایک تانگے میں بیٹھے اور ہیڈ راجاں کی طرف روانہ ہو گئے۔ پچھلے 100 سال سے میں عالیہ کے ریگستانی گاؤں کا اسیر بن کر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے 100 سال سے ایک بار بھی اس گاؤں کو نہیں چھوڑا تھا۔ یہ میرے محبوب عالیہ کا گاؤں تھا اور میں اسی گاؤں میں رہنا چاہتا تھا۔ میں اسی گاؤں میں مرنا چاہتا تھا۔ میں اس گاؤں کو چھوڑ کر کہیں اور مرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اوپر ساتویں آسمان پر بیٹھے ہوئے خدا نے میری موت محبوب کے گاؤں میں لکھی ہی نہیں تھی۔ میری تقدیر جیت گئی تھی۔ وہ مجھے گاؤں سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ آج ایک سو بیس سال کے بعد اولاد کی محبت ایک محبوب کی محبت کے آڑے آ گئی تھی۔ آج اولاد جیت گئی اور محبوب ہار گیا تھا۔ تانگے کی کھٹ کھٹ سے میرا دماغ پھٹ رہا تھا۔ بڑھا پاپنا اثر دکھانے لگ گیا تھا۔ میں نے حسرت سے اپنے گاؤں کے درو دیوار کی طرف دیکھا جو آہستہ آہستہ مجھ سے دور ہو رہے تھے۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکلنے لگے۔ 100 سال پہلے محبوب بھی نہیں ملا تھا اور آج محبوب کا گاؤں بھی دور ہو رہا تھا۔ دو گز زمین کی خواہش تھی اور آج وہ بھی چکنا چور ہو گئی تھی۔

”دادا! آپ ٹھیک ہو؟“ عدنان نے میری آنکھوں سے نکلنے والے آنسو دیکھ لئے تھے۔

”ہاں بیٹا! میں ٹھیک ہوں، مجھے تو محبت نہیں ملی تھی لیکن آج میرے پوتے کو تو محبت مل رہی ہے نا؟ بس میرے لئے یہی کافی ہے۔“ میں نے عدنان کو گلے سے لگایا اور رونے لگ گیا۔

ہیڈ راجکاں ہمارے گاؤں سے کافی دور تھا۔ تانگے کو وہاں پہنچنے میں دو گھنٹے لگ گئے۔ بارہ بجے کے قریب ہم ہیڈ راجکاں پہنچ گئے۔ یہاں سے بسیں سمہ سٹہ جاتی ہیں۔ سمہ سٹہ بہاولپور کے مرکزی شہر سے کچھ دور ایک جنکشن ہے۔ یہ پاکستان کے چند بڑے اور مین جنکشنوں میں سے ایک ہے۔ سمہ سٹہ سے پورے پاکستان کو ریلوے ٹرین جاتی تھی۔ بہاولپور پاکستان کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ یہاں سے پاکستان کے سبھی شہروں کو بسیں اور ٹرینیں جاتی تھیں۔ ہم ہیڈ راجکاں سے ایک بس میں بیٹھے اور سمہ سٹہ آ گئے۔ یہاں سے ہر چار گھنٹے کے بعد ایک ٹرین کراچی جاتی تھی۔ یہ اوپر پشاور اور لاہور سے ٹرین چلتی تھی جو آگے کراچی یا کوئٹہ تک جاتی تھیں۔ ہماری مطلوبہ ٹرین رات آٹھ بجے آئی تھیں۔ میں اور پروین کا دادا نوید دونوں بوڑھے تھے۔ ہم زیادہ دیر تک سیٹ پر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ہم نے ٹرین کی چار ٹکٹیں لیں تو ہمیں چار بیٹوں کے ساتھ ایک برتھ بھی مل گئی۔ برتھ کی وجہ سے ہمارا سفر آسانی سے کٹ جاتا۔ پوری رات سفر کرتے ہوئے ہم دوسرے دن کراچی پہنچ گئے۔

امریکن ایمپیس اسٹیشن کے قریب ہی تھی۔ ہم پیدل ہی ایمپیس چلے گئے۔ امریکن ایمپیس ایک دو منزلہ عمارت تھی جس کا کافی بڑا احاطہ بھی تھا۔ مرکزی گیٹ پر ایک سیکورٹی گارڈ موجود تھا۔ ہم نے اسے سلام کیا اور اندر احاطے میں چلے گئے۔ یہاں پہلے سے ہی کوئی پچاس کے قریب لوگ احاطے کے اندر بنی ہوئی بینچوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس دور میں دہشت گردی کے نام سے بھی کوئی واقف نہیں تھا۔ مرکزی گیٹ پر موجود گارڈ صرف واجبی سی ڈیوٹی دے رہا تھا جبکہ اندر بھی تین گارڈ تھے۔ وہ بھی بلا تکلف کھڑے تھے۔ ان کے پاس پرانے زمانے کی رائفلیں تھیں۔ جو صرف ڈرانے کے لئے تھیں اور ان میں گولیاں نہیں تھیں۔ پولیس کے گارڈ صرف کسی ممکنہ ہنگامے کو روکنے کے لئے کھڑے تھے۔ بعض اوقات کبھی کسی آدمی کا ویزہ مسترد ہوتا تھا تو وہ باہر نکل کر شور کرتا تھا۔ پولیس والے انہی لوگوں کو کنٹرول کرنے کے لئے تھے۔

ہم نے ایک گارڈ سے جا کر ٹوکن لیا اور بچوں پر بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔ ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد ہماری باری آئی تو میں سب کو لے کر اندر دفتر چلا گیا۔ امریکی سفارت کار پچاس سے پچپن

سال کی عمر کے درمیان سفید فام آدمی تھا۔ جو ایک بڑی سی آفس ٹیبل کے پیچھے گھومنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ آفس ٹیبل کے سامنے چار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ہم سب جا کر ان کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے ایک طائرانہ نظر کمرے پر ڈالی۔ آفس کافی بڑے کمرے پر مشتمل تھا۔ سامنے آفس ٹیبل کی طرف سفارت کار اور دوسری طرف آنے والے ضرورت مندوں کے لئے کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ کمرے کے دونوں اطراف میں صوفے رکھے ہوئے تھے۔ یہ زیادہ تعداد میں آنے والے لوگوں یا مہمانوں کے لئے تھے۔ دونوں اطراف کے صوفوں کے آگے بھی چھوٹی چھوٹی چیزیں موجود تھیں۔ ایک صوفے پر اس وقت تین اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرے کے ایک کونے میں میز پر ٹائپ رائٹر رکھا ہوا تھا۔ جس کے سامنے ایک امریکی کلرک بیٹھا کچھ ٹائپ کرنے میں مصروف تھا۔

”جی سر! ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟“ ہمارے بیٹھنے کے بعد سامنے بیٹھے ہوئے سفیر نے ہم

سے پوچھا۔

”میرا پاسپورٹ گم ہو گیا ہے۔ میں اپنا اور اپنے بچوں کا پاسپورٹ بنوانے کے لئے آیا ہوں۔“ میں

نے انگریزی میں کہا۔

مجھے انگلش میں بات کرتے ہوئے سامنے والا تو حیران ہوا لیکن ان سے زیادہ حیران میرے ساتھ آنے والے عدنان، پروین اور اس کا دادا تھے۔ میں نے پچھلے سو سال سے ایک بھی لفظ انگریزی کا نہیں بولا تھا۔ ہمارے گاؤں میں عدنان کے علاوہ کسی کو بھی انگریزی نہیں آتی تھی۔ میں نے کبھی اس زبان میں بات ہی نہیں کی تھی۔ عدنان نے بھی انگلش یزمان شہر میں جا کر سیکھی تھی۔ اسے امریکہ جانا تھا اس لئے اس نے شہر میں جا کر زبان سیکھی تھی۔ میں نے کبھی کسی کو بتایا ہی نہیں تھا کہ میں انگلش میں بھی بات کر سکتا ہوں۔

”دادا! آپ کو انگلش آتی ہے؟“ عدنان نے جلدی سے سوال کیا۔ وہ سب حیرانگی سے میری طرف

دیکھ رہے تھے۔

”ہاں بچے! انگلش میری مادری زبان ہے، میں امریکی ہوں۔“ میں نے اسے انگلش میں جواب دیا

اور واپس امریکی سفیر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”سر! میں نے اپنے اور اپنی فیملی کے لئے پاسپورٹ بنوانے ہیں، مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ میں نے اس

بار سفیر سے پوچھا۔

”آپ امریکی ہو؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ پاکستان کب آئے؟“ سفیر کو سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا سوال کرے۔

”سر! میں اصلاً اور نسلاً امریکی ہوں۔ میری دادی امریکی ریڈ انڈین جبکہ میرے دادا فرانسیسی تھے۔ جو اٹھارویں صدی میں امریکہ آکر آباد ہو گئے تھے۔ میرے والد اور میری پیدائش امریکہ میں ہی ہوئی ہے۔ میں امریکی شہری ہوں اور یہ میرے بچے بھی امریکہ کے شہری ہیں۔ میں اپنا پاسپورٹ بنوانے آیا ہوں۔“ میں نے اس بات تفصیل سے انہیں بتاتے ہوئے کہا۔

”آپ امریکہ کی کس ریاست میں رہتے ہیں؟“ اس نے سوال کیا۔

”میں ٹیکساس کا رہنے والا ہوں۔ آسٹن شہر کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ جو دریائے کولوراڈو کے کنارے پر واقع ہے۔ میں اسی گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ گاؤں کا نام برنٹ ہے۔“ میں نے اسے اپنے گاؤں کا نام اور پتہ بتا دیا۔

”آپ کب پاکستان آئے تھے؟“ اس نے پھر سوال کیا۔

آج کے جدید کمپیوٹرائزڈ دور میں تو ایئر پورٹ پر مکمل ان آؤٹ کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ اس زمانے میں یہ سب کچھ نہیں ہوتا تھا۔ پاسپورٹ کے اوپر ویزے کی مہر ہی سب کچھ ہوتی تھی۔ ایک بار پاسپورٹ پر مہر لگ گئی تو پھر آپ پاکستان میں رہ رہے ہوں یا پاکستان سے باہر کسی کو بھی پتہ نہیں ہوتا۔

”میں 102 سال پہلے 1860ء میں پاکستان آیا تھا اور پچھلے سو سال سے یہیں ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا؟ آپ سو سال سے پاکستان میں رہ رہے ہو؟ آپ نے ایک بار بھی امریکی سفارت خانے میں رابطہ نہیں کیا؟ آپ نے کبھی بھی واپسی کا نہیں سوچا؟ تو پھر آج کیوں آئے ہو؟“ وہ بدستور کشمکش کا شکار نظر آ رہا تھا۔

”کیوں؟ میرا رابطہ کرنا ضروری تھا؟ میں اگر ساری زندگی بھی پاکستان میں گزار دیتا ہوں تو کیا میری امریکی شہریت ختم ہو جائے گی؟ میں واپس اپنے گھر امریکہ جانا چاہتا ہوں۔ دنیا کا کوئی سفارت خانہ یا قانون مجھے میرے گھر جانے سے تو نہیں روک سکتا۔“ میں نے اس بات پر تیز لہجے میں کہا۔

”نہیں! امریکہ کا کوئی قانون آپ کو روک نہیں سکتا لیکن آپ کو اپنی امریکی شہریت تو ثابت کرنی ہو

گی۔۔ ہم کیسے مان جائیں کہ آپ جھوٹ نہیں بول رہے ہو، آپ واقعی امریکی شہری ہو؟“ اس نے بھی تیز لہجے میں جواباً کہا۔

”ٹھیک ہے سر! یہ انکوائری کرنا آپ کا کام ہے۔ مجھے صرف واپس اپنے گھر جانا ہے۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”مجھے کتنے دن تک انتظار کرنا پڑے گا؟“ میرے لہجے میں اس بار کافی سنجیدگی تھی۔

”آپ اپنا نام و پتہ اس کاغذ پر لکھ کر دے دیں، میں ابھی امریکہ میں تارکھجج دیتا ہوں۔ دو تین دن تک ان کا واپسی جواب آجائے گا تو میں آپ کو بتا دوں گا۔“ اس نے ایک کاغذ میری طرف بڑھایا تو میں نے اس سے کاغذ لیا اور اس پر اپنا نام و پتہ لکھ کر اسے واپس کر دیا۔

”اگر آپ کے باپ دادا فرانسیسی تھے تو آپ فرانس کی شہریت کے لئے بھی درخواست دے سکتے ہیں۔ امریکہ کی نسبت فرانسیسی شہریت آپ کو آسانی سے مل جائے گی۔ اگر آپ ہمارے ساتھ فرانسیسی سفارت خانے چلیں تو میں آپ کی شہریت کلیم کر سکتا ہوں۔“ صوفی پر بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے ایک آدمی نے کہا۔ اس نے تھری بیس سوٹ پہنا ہوا تھا اور پچاس سے اوپر عمر تھی۔ سنہری بال اور نیلی آنکھیں وہ فرانسیسی سفیر تھا جو یہاں امریکی سفیر سے ملنے آیا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ کی آبادی خطرناک حد تک کم ہو گئی تھی۔ یورپ کے آدھے سے زیادہ نوجوان مرد جنگ میں مارے جا چکے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے ابھی صرف سولہ سال ہی ہوئے تھے ختم ہوئے۔۔ اتنے قلیل ترین عرصے میں ہی یورپ دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو چکا تھا۔ یورپ کے تباہ حال شہر دوبارہ بسائے جا چکے تھے اور فیکٹریاں اور کارخانے بھی کام کرنے لگ گئے تھے۔ یورپ کو کام کے لئے مزدوروں کی اشد ضرورت تھی۔ افریقی ممالک کو وہ پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ افریقی کام کی بجائے مجرمانہ سرگرمیوں میں زیادہ ملوث ہوتے تھے۔ افریقہ میں انسانی جان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ عرب ممالک میں تیل دریافت ہو چکا تھا۔ چائے اور سوویت یونین دونوں امیر ممالک تھے۔ وہ لوگ ملک سے باہر نہیں جاتے تھے۔

یورپ کے لئے سب سے بہترین اور آئیڈیل پاکستان اور انڈیا کے پنجابی تھے۔ پنجابی قوم مخفی بھی تھی اور دوسری قوموں کی نسبت مہذب بھی تھی۔ دونوں ملکوں میں یورپی سفارت خانے پنجابی نوجوانوں کو پر

کشت ملازمتوں کا لالچ دیکر اپنے ملکوں کو بھیجنے کی کوشش کرتے تھے۔ جرمنی نے اسی زمانے میں پاکستانی حکومت سے سرکاری سطح پر لیبر مانگی تھی لیکن پاکستان کی فوجی حکومت نے انکار کر دیا تھا۔ پاکستان کی بجائے ترکی نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور آج جرمنی میں آپ کو ہر جگہ ترکی معاشرے کی جھلک نظر آئے گی۔ جرمنی کے ہر بڑے گاؤں میں مسجد موجود ہے اور ترکش رنگ آپ کو جرمنی کی ایک ایک گلی میں نظر آئے گا۔ 50ء سے 70ء کی دہائی تک یورپ کو مزدوروں کی ضرورت تھی۔ پاکستان اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتا تھا لیکن ہمارے حکمران ہی نااہل تھے۔

70ء کی دہائی میں ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستانی نوجوانوں کو عرب ممالک کی راہ دکھائی۔ بھٹو کے دور حکومت میں عرب ممالک پاکستان کے علاوہ اور کسی ملک کے مزدوروں کے ویزہ ہی نہیں دیتے تھے۔ آج عرب ممالک میں پاکستانی مزدوروں کی تعداد ایک کروڑ تک جا پہنچی ہے۔ ہر ماہ اربوں روپیہ پاکستان آتا ہے تو یہ بھٹو کی مہربانی ہے۔ میں فوج کے خلاف نہیں ہوں لیکن فوجی حکومت کے سخت خلاف ہوں۔ فرد واحد کی حکومت کبھی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ ملک کو جتنا نقصان ان فوجی حکومتوں نے پہنچایا ہے وہ کسی نے نہیں پہنچایا۔ ایوب خان کے پاس موقع تھا لیکن اس نے ملک کو 65ء اور اس کے جانشین یحییٰ خان نے 71ء کی جنگ میں ملک کے دو ٹکڑے کر دئیے۔

جو لوگ بھٹو کو اس سانحے کا ذمہ دار سمجھتے ہیں میرا ان سے صرف ایک ہی سوال ہے۔ 50ء سے لیکر 71ء تک ملک میں ڈائریکٹ اور ان ڈائریکٹ فوج حکومت کر رہی تھی۔ بھٹو کے پاس کونسا عہدہ تھا؟ مجیب الرحمن کو جیل میں ڈالنے والی فوجی حکومت تھی۔ اسے الیکشن لڑوانے والی فوجی حکومت تھی۔ اسے جیل سے آزاد کرنے والی فوجی حکومت تھی۔ مشرقی پاکستان میں لڑنے والی فوجی حکومت تھی۔ بھٹو کو دیوار کے ساتھ لگایا ہوا تھا۔ جب سب کچھ تباہ ہو گیا تو اس کے بعد بھٹو کو آگے کیا گیا۔ 16 دسمبر کو فوج نے ہتھیار ڈالے اور 20 دسمبر کو بھٹو کو صدر بنایا گیا تھا تا کہ وہ بکھرے ہوئے پاکستان کو سنبھال سکے۔

میں فوج کے خلاف نہیں ہوں بلکہ ان فوجی حکمرانوں کے خلاف ہوں جنہوں نے ملک کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ پرویز مشرف نے کارگل پر چڑھائی کی تھی۔ کارگل انڈیا کے ہاتھ سے نکل گیا تھا لیکن اسی انڈیا نے کراچی سے لیکر کشمیر تک پورے مغربی بارڈر پر فوج لگا دی تھی۔ ایک کارگل شہر کو بچانے کے لئے وہ سارے پاکستان پر حملہ کرنے والے تھے۔ مشرف کو غلطی کا احساس ہوا تو فوراً صلح کے لئے نواز شریف کو آگے کر دیا۔

لوگ آج نواز شریف کو ذمہ دار سمجھتے ہیں حالانکہ انھوں نے وہی کیا جو فوج چاہتی تھی۔ مشرف کو لگا جنگ صرف کارگل تک محدود رہے گی۔ یہ لوگ ایک سڑک پر قبضہ کریں گے، دو مہینے اسے ہلاک کر کے رکھیں گے اور سردیوں میں اوپر خالی ہوئی انڈین چیک پوسٹوں کو پاکستان میں شامل کر لیں گے۔ اسے لگا انڈین گدھے ہیں۔ انڈیا نے کراچی سے کشمیر تک پورے مغربی بارڈر کو انگیج کر کے رکھ دیا تھا۔

میرا صرف ایک ہی معصومانہ سوال ہے کہ جب انڈیا نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا تھا تو بیجی خان نے کشمیر اور پنجاب کو کیوں نہیں چھیڑا؟ جنرل ضیاء آیا تو پاکستان کو روس افغان وار میں جھونک دیا گیا۔ ملک میں جان بوجھ کر فرقہ واریت کو ہوا دی گئی۔ پاکستان آج بھی جنرل ضیاء کی پالیسیوں کی سزا بھگت رہا ہے۔ مشرف آیا تو امریکہ کو راستہ دیا گیا۔ آج پاکستان اور افغانستان ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ افغانی عوام پاکستان کی دشمن بنی ہوئی ہے۔ مسلمان مسلمان کے خون کا پیاسہ ہو رہا ہے تو اس میں قصور صرف اور صرف مشرف کا ہے۔ ہماری فوج کا شمار دنیا کی چند بہادر ترین افواج میں ہوتا ہے۔ لیکن فوجی حکومت کبھی بھی ملک کے مفاد میں نہیں ہوتی۔ سڑک یا پلوں کے ٹھیکوں میں کرپشن کر کے چار روپے کی کمیشن کھا لینے سے ملک کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ملکوں کو نقصان بین الاقوامی سطح پر غلط فیصلوں سے ہوتا ہے۔

سعودی عرب نے یمن (Yemen) میں لڑائی کے لئے پاکستان سے فوج مانگی لیکن ان لیگ کی حکومت نے اپنے ہمسائے ایران کی وجہ سے انکار کر دیا۔ سول حکومت ہمیشہ سب کو ساتھ لیکر فیصلہ کرتی ہے۔ سوچو! اگر مشرف امریکہ کی بجائے اپنے افغانی بھائیوں کے ساتھ کھڑا ہوتا۔ سوچو! اگر مشرف امریکہ کو انکار کر دیتا تو کیا آج ایسے ہی حالات ہوتے؟ فوج ہمارے ملک کا حصہ ہے۔ آج ہم اپنے گھروں میں آرام سے سوتے ہیں تو یہ اسی فوج کی قربانیوں کی وجہ سے ہے۔ میں فوج پر نہیں فوج کے محکمے سے باہر نکل کر حکومت میں آنے والے حکمرانوں پر تنقید کر رہا ہوں۔ میرے خیال میں مجھے اب واپس کہانی کی طرف آ جانا چاہیے۔ پاکستانی ہوں اس لئے پاکستان کا درد بھی دل میں محسوس ہوتا ہے۔ جو بھی لکھتا ہوں پاکستان کی محبت میں ڈوب کر لکھتا ہوں، اگر کہیں غلطی ہو جائے تو معاف کر دیں۔

”سرفرانس اچھا ملک ہے، وہاں کام بھی آسانی سے مل جاتا ہے۔ آپ کے پوتا پوتی کو وہاں کارخانے میں کام مل جائے گا۔ تنخواہ بھی پاکستان کے مقابلے میں تین گنا ہوگی۔“ فرانسسیسی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

”نہیں سر! آپ کا شکریہ! میں کام کے لئے نہیں بلکہ اپنے گھر کے لئے جا رہا ہوں۔ مجھے اپنے گھر جانا ہے“ میں نے اس بار فرانسیسی زبان میں اسے جواب دیا۔

”ارے! آپ تو فرانسیسی زبان بھی بولتے ہیں۔“

”میں فرانسیسی سفارت کار ہوں، وہ میری بات سن کر کھڑا ہو گیا۔“ مجھے فرانسیسی زبان میں بات کرتے ہوئے دیکھ کر وہ حیران ہو گیا تھا۔

”سر! میں نے بولا تو ہے آپ کو کہ میرے باپ دادا فرانسیسی تھے۔ گاؤں میں ہم فرانسیسیوں کے تین گھر تھے۔ 10 کے قریب سپینش تھے۔ میں انگلش اور فرانسیسی بہترین بول لیتا ہوں جبکہ ہسپانوی زبان بھی تھوڑی بہت سمجھ آ جاتی ہے۔“ میں نے تفصیل سے انھیں بتایا۔

امریکہ کی ٹیکساس ریاست کچھ عرصے تک سپین کے زیر قبضہ رہی ہے۔ ٹیکساس میں ہسپانوی زبان کافی بولی جاتی ہے۔ شمالی اور جنوبی امریکہ کو سب سے پہلے سپین کے جہاز رانوں نے ہی دریافت کیا تھا۔ کرسٹوفر کولمبس اٹالین تھا لیکن وہ ہسپانوی حکومت کے بادشاہ فرڈی نیبڈ اور ملکہ ازابیلا کے دربار میں ہوتا تھا۔ وہ سپین کے جہازوں کو لیکرانڈیا کو تلاش کرنے کے لئے نکلا لیکن امریکہ دریافت کر لیا تھا۔ امریکہ میں سب سے پہلے سپین نے ہی قدم رکھا تھا۔ اس کے بعد انگریز، فرانسیسی اور ڈچ آگئے تھے۔ آج شمالی امریکہ براعظم میں انگلش بولی جاتی ہے جبکہ جنوبی امریکہ میں ہسپانوی زبان بولی جاتی ہے۔

”اوہ یہ تو بہت اچھا ہے، کیا آپ کا بیٹا بھی فرینچ زبان بولتا ہے؟“ فرانسیسی سفیر نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”نہیں سر! میرا پوتا صرف انگلش اور اردو ہی بول سکتا ہے، ہم کو فرانس نہیں جانا ہے۔ مجھے واپس اپنے گھر جانا ہے۔ میں اب بہت بوڑھا ہو گیا ہوں اس لئے اب باقی زندگی اپنے آبائی گاؤں میں ہی گزارنا چاہتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

میرا امریکہ میں رہنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ میں عدنان اور پروین کو امریکہ لے جانا چاہتا تھا۔ وہ وہاں سیٹل ہو جاتے تو واپس بہاولپور آ جاتا۔ میں نے وہاں مستقل نہیں رہنا تھا۔ مجھے اپنے آبائی گاؤں کی بجائے اپنے محبوب عالیہ کے آبائی گاؤں میں اپنی باقی ماندہ زندگی گزارنی تھی۔

”آپ امریکہ چھوڑ کر پاکستان کس لئے آئے تھے؟“ امریکی سفیر میری طرف سوالیہ نظروں سے

دیکھنے لگے۔

”سر! آج امریکہ سپر پاور ملک ہے۔ ٹھیک اسی طرح سو سال پہلے متحدہ ہندوستان سپر پاور تھا۔ ہندوستان کے نوابوں کے پاس بہت دولت تھی۔ یہ ملک سونے سے بھرا ہوا تھا۔ میرے پاس امریکہ میں کام نہیں تھا۔ وہاں سول وار چل رہی تھی اس لئے وہاں سے بھاگ کر یہاں آ گیا۔ میں نے یہاں شادی کی، زمین خریدی اور پھر مستقل یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اب واپس جانا چاہتا ہوں۔ آپ مہربانی کریں اور مجھے پاسپورٹ بنا کر دے دیں۔“ میری آواز میں ہلکی سے نرمی آ گئی تھی۔

”ایلن براؤن! کیا میں آپ کو ایلن کہہ کر بلا سکتا ہوں؟“ اس نے سوال کیا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میرا پورا نام ایلن براؤن تھا جبکہ میرے والد کا نام براؤن تھا۔ مغربی ممالک میں باپ کا نام بیٹے کے نام کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ یہ رواج پاکستان میں بھی اب عام ہو گیا ہے۔ ہمارے زمانے میں لڑکے کے مرکزی نام کے ساتھ اسلامی نام محمد، علی، حسن، حسین یا احمد لگایا جاتا تھا جواب کم ہو گیا ہے۔ مغربی معاشرت ہمارے ناموں تک میں سرانیت کر چکی ہے۔ ہم اپنے بیٹے کے نام کے ساتھ اپنا نام یا اپنی ذات برادری کا نام تو ضرور لگاتے ہیں لیکن محمد اور احمد جیسے خوبصورت ناموں کو چھوڑ دیتے ہیں۔

”کیا آپ عیسائی ہو؟“ اس نے میرے نام کی مناسبت سے کہا۔

”نہیں سر! میں مسلمان ہو چکا ہوں۔ میں عیسائی تھا لیکن میں عیسائیت چھوڑ کر اسلام قبول کر چکا ہوں۔ میرا اسلامی نام عامر حسین ہے۔“

”کیا آپ سب امریکہ میں مستقل قیام کا ارادہ رکھتے ہیں؟“ اس نے اگلا سوال کر دیا۔

”سر! یہ فیصلہ تو وہاں جا کر ہی کریں گے، اگر میرے بچوں کو امریکہ پسند آ گیا تو ٹھیک ہے ورنہ واپس آ جائیں گے۔“ میں نے مختصراً جواب دیا۔

”آپ اپنے بچوں کی تعداد، نام، عمریں اور باقی پوری تفصیل مجھے لکھ کر دے دیں۔ مجھے یہ بھی آگے بھیجنی پڑے گی۔“ اس بار اس کی آواز میں بے نیازی تھی۔

”میں نے کاغذ لیا اور جلدی جلدی اس پر اپنے بچوں کی تفصیلات لکھنے لگا۔“ پانچ منٹ کے مختصر سے وقت میں میں نے پوری تفصیل لکھی اور کاغذ اس کے حوالے کر دیا۔

”ٹھیک ہے ایلن صاحب! آپ تین دن بعد رابطہ کر کے پوچھ لیں۔“ اس نے میری لکھی ہوئی تفصیلات کو کلرک کے حوالے کیا اور کلرک ان تفصیلات کو ٹائپ کرنے لگا۔ جبکہ ہم سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

”ایلن صاحب! میرا مشورہ ہے کہ آپ فرانسیسی سفارت خانے میں بھی درخواست دے دیں۔“ 1860ء میں متحدہ ہندوستان تاج برطانیہ کے زیر نگین تھا۔ یہاں کے مقامی لوگ گوروں سے نفرت کرتے تھے۔ جبکہ امریکہ 1860ء میں بھی ایک طاقت ور ملک تھا۔

”آپ کی کہانی میں کوئی سچائی نہیں لگتی، آپ ممکنہ طور پر جھوٹ بول رہے ہو اور آپ کی عمر بھی بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ آپ کی درخواست مسترد ہو جائے گی۔ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ آپ فرانسیسی شہریت کے لئے اپلائی کریں وہ آسان ہے۔ آپ کی باتوں پر مجھے یقین نہیں آیا تو پھر واشنگٹن والوں کو بھی نہیں آئے گا۔“ امریکی سفیر نے ہمدردی دکھائی۔ مجھے اس کے لہجے سے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ تین دن بعد ہمیں انکار کر دے گا۔

”ایلن صاحب! میں امریکی سفیر ہوں اور ہر روز درجنوں ایسی کہانیاں سنتا ہوں۔ مجھے سچ اور جھوٹ کی پہچان ہے۔“ سفیر نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”سر! واقعی کہانی جھوٹی ہے۔“ میں نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔

”سر! صرف کہانی جھوٹی ہے، میں جھوٹا نہیں ہوں۔ میں اصل کہانی سنانا ہی نہیں چاہتا ہوں۔ میں تو امریکہ بھی نہیں جانا چاہتا لیکن اولاد کے سامنے بے بس ہو گیا ہوں۔ سر! ماضی کی یادیں بہت درد دیتی ہیں۔ میں وہ بد قسمت رانجھا ہوں جسے ہیر بھی نہ ملی اور نہ ہی چناب کا کنارہ۔ رانجھا تو قسمت والا تھا جسے ہیر کے ساتھ ہی موت بھی نصیب ہو گئی۔ سر! میرا ماضی بہت دردناک ہے۔ میں بہت بوڑھا بہت کمزور ہو گیا ہوں۔ ماضی کو کنگھالنے جاؤں گا تو واپس نہیں آسکوں گا۔“ میں نے بے چارگی سے ان کی طرف دیکھا۔

”ایلن صاحب! کبھی کبھی دکھ اور درد کو دوسروں سے شیر کرنے سے وہ کم ہو جاتا ہے۔ یہ آپ کی ہندوستانی کہاوٹ ہی ہے۔ اپنے ماضی سے دوسروں کو بھی آگاہ کرو تا کہ ہم اور ہماری آنے والی نسلیں زندگی کی بے رحم چوٹوں سے محفوظ رہ سکیں۔“ امریکی سفیر نے فلسفی کی طرح کہا۔

”ٹھیک ہے سر! آج اپنے بچوں کے اچھے مستقبل کے لئے یہ بھی کر لیتا ہوں۔“ میرے لہجے میں

امید جھلک رہی تھی۔

”سر! کہانی لمبی ہے، سنانے میں بہت وقت لگے گا۔“ میں ان کی طرف دیکھنے لگا۔

”ٹھیک ہے آپ ایک گھنٹہ انتظار کر لیں۔ میں ایک گھنٹے میں باقی کیس دیکھ لیتا ہوں۔ تب تک چھٹی کا ٹائم بھی ہو جائے گا۔ پھر اکٹھے ہی گھر جا کر آرام سے آپ کی کہانی سنتے ہیں۔“ سفیر نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔

وہ میری کہانی سننے کے لئے کافی بے تاب تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اب فرانسیسی بھی کہانی سننا چاہتا تھا۔ سفیر نے ہمیں باہر احاطے میں انتظار کرنے کا کہا تو ہم سب باہر آ گئے، جبکہ سفیر دوسرے لوگوں کے کیس دیکھنے لگا۔ ایک گھنٹے بعد چھٹی ہوئی تو وہ ہم سب کو لیکر اپنے گھر آ گیا۔ امریکی سفیر کا گھر سفارت خانے کے ساتھ ہی واقع تھا۔ سفیر کا دو منزلہ گھر کافی شاندار تھا۔ یہ پاکستانی حکومت کی طرف سے اسے دیا گیا تھا۔ گھر میں کام کرنے کے لئے دو ملازم بھی تھے۔ یہ بھی وفاقی حکومت کی طرف سے تھے۔ ہم گھر کے بڑے سے ڈرائنگ روم (مہمان خانہ) میں بیٹھے تو ایک ملازم چائے لیکر آ گیا۔ چائے پیالیوں کی بجائے گلاسوں میں ڈال کر دی گئی تھی۔ مغربی ممالک کے لوگ پیالی میں چائے پسند نہیں کرتے تھے۔ میں نے ملازم کے ہاتھ سے چائے کا گلاس پکڑا اور پینے لگا، چائے ابھی گرم تھی۔ میں نے اسے میز پر رکھ دیا۔

”سر! اس کا نام عالیہ تھا، اٹھارہ سال کی خوبصورت سی لڑکی تھی۔“ اس زمانے میں لڑکیوں کی شادیاں سولہ سترہ سال کی عمر میں کر دی جاتی تھیں لیکن اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ باپ ایک غریب کسان تھا جو نواب کے کھیتوں میں کام کرتا تھا۔ بہاولپور شہر میں دریا ستلج کے ساتھ بہتا تھا۔ بہاولپور کی ریاست متحدہ ہندوستان کی امیر ترین اور خوشحال ترین ریاستوں میں سے ایک تھی۔ بہاولپور ریاست کے ایک طرف لہلہاتے ہوئے سرسبز کھیت تھے تو دوسری طرف لعل و دق صحرا کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ عالیہ اسی ریگستان کی تھی۔ انیسویں صدی تک بہاولپور کے صحراؤں میں کالے ہرن سے لیکر چیتے تک سارے جانور ہی موجود تھے۔ صرف انسان ناپید تھے۔ انگریز آئے تو انھوں نے دریائے ستلج سے ایک بہت بڑی نہر نکالی اور اسے روہی تک پہنچا دیا۔

روہی کی زمین زرخیز تھی، صرف پانی کی کمی کی وجہ سے ریگستان بن گئی تھی۔ انگریز نے نہر بنا کر پانی دیا تو زمینیں آباد ہونے لگیں اور لوگ آنے لگے۔ عالیہ کے آباؤ اجداد بھی روہی میں آ کر آباد ہو گئے۔ زمین

نواب کی تھی۔ گاؤں والے فضیلتیں اگاتے اور انھیں فصل میں سے چوتھا حصہ ملتا تھا جبکہ تین حصے نواب لے جاتا تھا۔ گاؤں والے چوتھے حصے میں بھی خوش تھے۔ بیلوں کے ساتھ کھیتی باڑی بہت مشکل تھی لیکن پھر بھی سخت محنت کے بعد انھیں دو وقت کی روٹی مل جاتی تھی۔ گاؤں والے اسی میں خوش تھے۔ انگریزوں نے پورے ہندوستان پر قبضہ کر لیا تھا لیکن کچھ ریاستیں بچ بھی گئیں تھیں۔ انگریزوں نے ریاستوں کو ختم کرنے کی بجائے انھیں **راج** گزار بنالیا تھا۔ ہندوستان میں 100 سے اوپر نیم خود مختار ریاستیں تھیں جو انگریزی حکومت کو سالانہ **خراج** دیتی تھیں۔ بہاولپور بھی انہی **راج** گزار ریاستوں میں سے ایک ریاست تھی۔ یہاں کا حکمران تو نواب تھا لیکن وزیراعظم انگلینڈ کی مرضی کا ہوتا تھا۔

”سر! میری عالیہ اسی نیم خود مختار ریاست بہاولپور کے ریگستان میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کا بچپن اور جوانی بہاولپور میں ہی گزری ہے۔ عالیہ اور اس کا بھائی حیات محمد دو بہن بھائی تھے۔ ان کا والد شجاعت محمد تھا۔ یہ چار لوگوں کی چھوٹی سے فیملی تھی۔ اس زمانے میں گاؤں کے اندر صرف 15 گھر تھے۔ بالکل چھوٹا سا گاؤں تھا۔ مرکزی نہر سے ایک چھوٹا نالہ نکلتا تھا جس سے گاؤں کی ساری زمین کو پانی سے سیراب کیا جاتا تھا۔ عالیہ گاؤں کی سب سے شوخ اور چنچل لڑکی تھی۔ وہ سارے گاؤں میں گھومتی پھرتی تھی۔ وہ کسی بھی ایک جگہ پر ٹپک کر نہیں بیٹھتی تھی۔ بالکل کسی ہرنی کی طرح چوکرٹیاں بھرتی رہتی تھی۔“

”اماں! جلدی سے روٹی دے دے! میں نے آج رضیہ کے ساتھ رو ہی جانا ہے۔ میں آج بہت سارے بیر اکٹھے کر کے لاؤں گی۔“ عالیہ خلاف معمول آج صبح اٹھ گئی تھی۔ اس کی امی چولہے میں لکڑیاں جلا کر روٹی بنا رہی تھی جبکہ بابا اور بھائی بھی وہیں چولہے کے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔

گاؤں میں کوئی بھی سکول نہیں تھا۔ سکول صرف بہاولپور شہر میں تھا اور وہ بھی گاؤں سے بہت زیادہ دور تھا۔ گاڑیاں ابھی تک ہمارے گاؤں میں نہیں تھیں۔ لوگ گھوڑوں، خچروں اور بیلوں پر سفر کرتے تھے۔ سائیکل ایجاد ہو چکی تھی لیکن وہ صرف یورپ تک ہی محدود تھی۔ ہندوستان میں ابھی تک اس کا تذکرہ بھی نہیں پہنچا تھا۔ سائیکل بھی بالکل اپنے ابتدا کی دور میں چل رہی تھی۔ اس کا ایک پہیا چھوٹا تھا اور دوسرا پہیا اتنا ہی بڑا تھا۔ یہ جرمنی کی ایجاد تھی جو آگے انیسویں صدی کے آخر تک پہنچے پہنچتے آج کی موجودہ شکل میں آگئی تھی۔ گاؤں کا کوئی بھی فرد پڑھا لکھا نہیں تھا۔ بچے گاؤں کی گلیوں میں ہی کھیلتے کودتے جوان ہوتے تھے اور پھر والد کے ساتھ کھیتوں میں کام کرنے لگتے تھے۔

ہندوستان پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا تھا لیکن پورے گاؤں میں کسی کو بھی اس کا پتہ نہیں تھا۔ لوگ نواب کو ہی بادشاہ سمجھتے تھے۔ نہر کی کھدائی کے وقت انگریز انجینئرز آیا تھا۔ گاؤں والوں نے صرف اسی انگریز کو ہی دیکھا تھا۔ سنہری بال اور دودھ کی طرح سفید رنگ۔۔۔ گاؤں والوں کو وہ انگریز کسی اور ہی سیارے کی مخلوق لگتا تھا۔ یہاں گاؤں کے سبھی لوگوں کے رنگ کا لے تھے۔ صحرا کی گرم ریت نے ان کے چہروں کو سیاہ کر دیا تھا۔ پورا گاؤں بلکہ اس زمانے میں پورا بہاولپور ہی سانولہ تھا۔ ایسے میں گورا چٹا انگریز واقعی لوگوں کو طلسم ہوشربا کا کوئی شہزادہ لگتا تھا۔ گاؤں میں اس کے بارے میں عجیب و غریب کہانیاں بھی مشہور ہو گئی تھیں۔ انگریز چونکہ یہاں کے حکمران تھے اس لئے ان کا رعب اور بدبہ بھی بہت تھا۔

ہندوستان میں رہنے والے معمولی سے معمولی انگریز بھی راجے مہاراجوں سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ انجینئر یہاں ایک ہفتہ تک رکا رہا تھا۔ اس دوران اس کے لئے ایک سپیشل گھردیا گیا تھا۔ گاؤں والوں میں سے کسی کو بھی اس کے قریب جانے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف کچھ مخصوص لوگ ہی اس کے پاس جاتے تھے۔ جن کو انگریز کی خدمت کے لئے رکھا گیا تھا۔ وہی لوگ بعد میں عجیب و غریب کہانیاں مشہور کرتے تھے۔

”امی جلدی جلدی کھانا دونا!“ وہ اٹھ کرا می کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

”عالیہ بیٹی! اب تو بڑی ہو گئی ہے اس لئے اب گاؤں سے باہر مت جایا کرو۔ گھر میں بیٹھو اور میرے ساتھ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاؤ! تمہاری اب شادی کی عمر ہو گئی ہے۔“ عالیہ کی امی نے پیار سے اس کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ابا!“ عالیہ نے رونی سی صورت بنائی اور ابا کی طرف دیکھنے لگی۔

”رشیداں! تمہیں کہا ہے ناکہ میری بیٹی کو کچھ بھی مت کہا کرو! یہ ابھی بچی ہے، ابھی اس کے کھیلنے کو دن کے دن ہیں۔ جب شادی کر کے یہ اپنے سسرال چلی جائے گی تو پھر کہاں اس کو کھیلنے کو دن کا وقت ملے گا؟ پھر ساری زندگی اس نے سسرال کی خدمت ہی کرنی ہے۔ ابھی تو اس کو کھیلنے دیا کرو، مت روکا کرو!“ شجاعت محمد نے اپنی بیٹی کی سائیڈ لیتے ہوئے کہا۔

”جی ابا! میرے ابو دنیا کے سب سے اچھے ابو ہیں۔“ عالیہ اٹھ کر اپنے ابا کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ اس

نے باپ کا بازو اٹھایا اور اپنے گلے میں حائل کر لیا۔

”عالیہ کے ابا! یہ اب چھوٹی نہیں رہی ہے۔ مجھ سے بھی ایک انگلی اوپر اس کا قد ہو گیا ہے۔ حالات خراب ہیں، لڑکی جوان ہے اس لئے اسے باہر جانے سے روکتی ہوں۔ شادی کر کے اپنے گھر چلی جائے گی تو پھر بے شک باہر گھومے پھرے لوگ باتیں نہیں بنائیں گے۔“ رشیداں بی بی ابھی تک بیٹی کی طرف سے متفکر تھی۔ اس نے آٹا گوندھ لیا تھا اور اب روٹی بنا رہی تھی۔

”رشیداں! گاؤں میں صرف 15 ہی تو گھر ہیں اور وہ سارے ہی ہمارے دیکھے بھالے ہیں۔ گاؤں کی لڑکیاں بہنیں ہوتی ہیں۔ کوئی بھی لڑکا کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ ہماری عالیہ کو تم مت روکا کرو۔ سارے گاؤں کی لڑکیاں ہی باہر گھومتی پھرتی ہیں اور سب لوگ ایک دوسرے کے گھروں میں آتے جاتے ہیں۔ تم پتہ نہیں کیوں ڈرتی رہتی ہو۔“ شجاعت محمد نے اس بار اپنی بیوی کو اچھا خاصہ لیکچر دے دیا۔

”عالیہ کے ابا! تم بس اب کوئی اچھا سا لڑکا دیکھ کر اس کی شادی کر دو۔ نجائے کیوں مجھے اب ڈر سا لگا رہتا ہے۔ کوئی انجانا سا خوف مجھے اندر ہی اندر خوفزدہ کرتا رہتا ہے۔ تم بس اب زیادہ دیر مت کرو اور کوئی اچھا سا رشتہ دیکھو!“ رشیداں نے تو لے سے روٹی اتار دی اور اسے چھاپے (کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی ٹوکری اس میں روٹیاں رکھی جاتی ہیں۔ پنجابی میں اسے چھابا کہا جاتا ہے) میں رکھ کر دونوں کے آگے کر دیا۔ اس نے ایک کٹوری میں رات کا بچا ہوا سالن بھی ڈال کر دے دیا۔ جسے دونوں باپ بیٹی کھانے لگے۔

عالیہ کا بھائی حیات محمد اپنی روٹی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ عالیہ سے چھوٹا تھا اور ابھی صرف 14 سال کا تھا۔ اسے اپنی بڑی بہن سے بہت محبت تھی۔ دونوں بہن بھائیوں میں پیار بھی بہت تھا اور پیار بھری چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھی بہت ہوتی تھیں۔ بہن بھائی کا رشتہ شاید ایسا ہی ہوتا ہے۔ جتنی بھی لڑائی ہو جتنا بھی غصہ ہو کبھی محبت کم نہیں ہوتی۔ یہ ہر بار ہر روز بڑھتی ہی رہتی ہے جو قبر تک ساتھ جاتی ہے۔ بیوی اور بچوں کے آجانے سے محبت تھوڑی کم لاتی ضرور ہے۔ انسان بیوی اور بچوں کے خرچے میں پھنس تو جاتا ہے اس معاشی چکر میں محبت تھوڑی کم لاتی ضرور ہے لیکن زندہ رہتی ہے۔ حیات محمد کو بھی اپنی بہن سے بہت محبت تھی۔

”باجی! میں آپ کے ساتھ ہی جاؤں گا۔“ اسے رات کو ہی عالیہ اور رضیہ کے پروگرام کا پتہ چل گیا تھا۔ اس لئے وہ بھی صبح اٹھ گیا تھا۔ ماں نے روٹی بنا کر اسے بھی دے دی تھی اور وہ آرام سے کھا رہا تھا۔

”ٹھیک ہے بھیا! لیکن آپ کو میرا تھیلہ بھی اٹھانا پڑے گا؟“ عالیہ نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے

روہی کا علاقہ گاؤں سے کافی دور تھا۔ پیدل ایک گھنٹہ لگ جاتا تھا۔ یہ سارا ریگستانی علاقہ تھا جس سے آگے ریاست بیکانیر (BIKANER) تھی اور وہاں مہاراجہ سورت سنگھ کی حکومت تھی۔ جسے بعد میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنا **راج** گزار بنالیا تھا۔ یہ بہت بڑا ریگستان تھا۔ دہلی سے لیکر حیدرآباد تک ہزاروں کلومیٹر پر پھیلا ہوا ریگستان تھا۔ جس میں قریباً بیس سے اوپر چھوٹی چھوٹی نیم خود مختار ریاستیں تھیں۔ انگریزوں نے ان کی آزاد حیثیت ختم کرنے کی بجائے انھیں **راج** گزار بنالیا تھا۔ یہ حکومت کرنے کا سب سے بہترین طریقہ تھا۔ اس پورے ریگستان میں عملاً انگریز ہی کی حکمرانی تھی۔ جنھیں وہ راجوں مہاراجوں کی مدد سے قائم رکھے ہوئے تھے۔

راجے اپنا اقتدار بچانے کی خاطر انگریز کو سالانہ **خراج** بھی دیتے تھے اور ان کے ہر جائز و ناجائز حکم کو بھی مانتے تھے۔ ریاست کی آمدنی انگریز لے جاتے تھے جبکہ راجوں مہاراجوں کو اپنی عیاشیوں کے لئے رعایا سے دو گنا تین گنا لگان وصول کرنا پڑتا تھا۔ یہ راجے انگریز کے آنے سے پہلے بھی خوش تھے، انگریزوں کے آنے پر بھی اور آج انڈیا اور پاکستان بن جانے کے بعد بھی ان کی نسلیں ہم پر حکومت کر رہی ہیں۔ انگریزوں نے انہی راجوں مہاراجوں کی مدد سے ہندوستان پر حکومت کی تھی۔ جنھوں نے مزاحمت کی اور ہندوستان کی آزادی کے لئے اپنا خون دیا، آج ان کی نسلیں تک ختم ہو چکی ہیں۔ اس کے برعکس جنھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا ان کی نسلیں آج بھی اپنے اپنے علاقوں میں نواب بنے ہوئے ہیں۔ انڈیا اور پاکستان کی حکومت ان غداروں کو آج بھی مکمل پروٹوکول دیتی ہے۔ یہ آج بھی نواب ہی کہلاتے ہیں۔ جبکہ ٹیپو سلطان اور مہاراجہ رنجیت سنگھ جیسے حکمران اب کتابوں میں ہی نظر آتے ہیں۔

”کیوں بھی حیات! میرا تھیلا اٹھانا منظور ہے تو ٹھیک ہے چلو میرے ساتھ؟“ عالیہ نے اپنے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”باجی! میرے پاس میرا تھیلا بھی ہو گا نا!“ حیات نے بے چارگی سے کہا۔

”تو پھر کیا ہوا؟ تم لڑکے ہو، تم تو آرام سے دو تھیلے بھی اٹھا سکتے ہو۔“ عالیہ نے شرارتی انداز میں کہا۔

”باجی۔۔۔۔“ حیات نے اس کی طرف دیکھا۔

”آدھا آدھا راستہ؟“ وہ اب اپنی بہن سے مذاکرات کر رہا تھا۔

”حیات! عالیہ تمہاری بہن ہے۔ تم اپنی بہن کا تھیلہ نہیں اٹھا سکتے؟“ ابو نے مصنوعی غصے سے اس کی

طرف دیکھا تو وہ مان گیا۔

روہی کا علاقہ کافی فاصلے پر تھا۔ بیری کے درخت روہی میں بہت زیادہ تھے۔ بیروں کا موسم تھا اس لئے چھوٹے چھوٹے لال سرخ بیروں سے روہی کے درخت بھرے ہوئے تھے۔ وہ لوگ روہی جاتے تو کم از کم بیس بیس کلو کے تھیلے بھر کر لاتے تھے۔ چالیس پچاس کلو کا وزن آج کے زمانے میں اٹھانا مشکل ہے لیکن اس زمانے میں یہ نارمل بات تھی۔ چونکہ غذائیں خالص تھیں، دودھ اور گھی کی گھر میں بہتات تھی۔ گولی اور دو تو دور کی بات ہے لوگوں نے ان کے نام لینا گوارا نہیں کرتے تھے۔ کھیتی باڑی بیلوں کی مدد سے ہوتی تھی۔ انسان کو سارا کام اپنے ہاتھ سے ہی کرنا پڑتا تھا۔

بیروں کا موسم آتے ہی لوگ ان کو دھوپ میں ڈال کر خشک کر لیتے تھے اور پھر خشک بیروں کو مٹی کی بڑی بڑی چائیاں (برتنوں) میں محفوظ کر لیتے تھے۔ پورے سال تک بچے یہی بیر کھاتے رہتے تھے۔ یہ اس زمانے میں روہی کی چاکلیٹ تھی جس پر بچے مرتے تھے۔ عالیہ اور حیات بھی اس موسم میں بیر اکٹھے کر کے رکھ لیتے تھے اور پھر سارا سال کھاتے رہتے تھے۔ وہ دونوں اپنے بیر الگ الگ رکھتے تھے۔ عالیہ اپنے حصے کے بیر بھی کھا جاتی تھی اور پھر بھائی کے حصے سے بھی لینا شروع کر دیتی تھی۔ حیات محمد چھوٹا ہونے کی وجہ سے اور بھائی ہونے کی وجہ سے ہر سال مار کھا جاتا تھا۔ بہن جب پیار سے کوئی چیز مانگتی تھی تو اس سے انکار ہی نہیں ہوتا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں گھر سے نکل پڑے۔ عالیہ نے رضیہ کو بھی ساتھ لیا اور گاؤں کی دو اور لڑکیاں بھی ساتھ ہو گئیں۔ وہ سب بڑے بڑے تھیلے ہاتھوں میں لئے روہی کی طرف چل پڑے۔ ایک گھنٹے تک وہ روہی پہنچ گئے اور بیر اکٹھے کرنے لگے۔ یہاں بیری کے درختوں کی تو بہتات تھی لیکن بچے بیٹھے اور لال بیروں کی طرف بھاگتے تھے۔ تین گھنٹے تک انھوں نے اپنے تھیلے بھرے اور گاؤں کی طرف واپس چل پڑے۔ عالیہ نے اپنا تھیلہ خود اٹھایا ہوا تھا۔ وہ آدھے راستے تک خود ہی تھیلہ اٹھاتی اور پھر بھائی کو دے دیتی۔

”بھائی! یہ گھڑسوار کون ہیں جو ہماری طرف آرہے ہیں؟“ عالیہ نے اپنے بھائی سے پوچھا۔ اسے کچھ فاصلہ پر ایک ٹیلے سے کچھ گھڑسوار نیچے اترتے نظر آرہے تھے۔ وہ تعداد میں کوئی دو درجن کے قریب تھے اور ان سب کا رخ انہی کی طرف تھا۔ یہ بہا پور کے نواب احمد خان تھے۔ وہ پچھلے تین دن

سے روہی میں شکار کے لئے نکلے ہوئے تھے۔ روہی میں انتہائی خوبصورت کالے ہرنوں کی بہتات تھی۔ یہ پوری دنیا میں سب سے زیادہ لذیز ہوتے ہیں۔ تھر (THAR) کا ریگستان جس میں راجھستان، روہی اور سندھ کا علاقہ شامل ہے۔ یہ دنیا کا واحد سرسبز ریگستان ہے۔ ریگستان سرسبز جھاڑیوں، بیری، بیکر اور دوسرے پودوں سے بھرا ہوا ہے۔

یہ واحد ریگستان ہے جس میں ہرن جیسے بڑے جانور بھی ملتے ہیں۔ ریت کے اونچے نیچے ٹیلے اور دریا سے پانی کی عدم دستیابی کی وجہ سے یہ خطہ کھیتی باڑی کے قابل نہیں تھا اس لئے انسانی آبادی بھی بہت کم تھی۔ لیکن سرسبز جھاڑیوں کی وجہ سے یہ بہت بڑی چراہ گاہ بن گئی تھی۔ ہرن اور دوسرے چھوٹے جانور انہی جھاڑیوں کو کھاتے تھے اور ان کی بہتات بھی بہت زیادہ تھی۔ راجے مہاراجوں کو شکار کا بہت شوق ہوتا ہے۔ ٹیلے سے نیچے آنے والے گھڑسوار بھی شکار کی غرض سے اس علاقے میں آئے ہوئے تھے۔ وہ سارے گھڑسوار ان کے قریب آ کر رک گئے۔

”بچو! کہاں سے آرہے ہو؟“ نواب احمد خان نے ان سے پوچھا۔ وہ ساٹھ سال سے اوپر کا ہو گیا تھا لیکن ابھی بھی بالکل تندرست تھا۔ نواب احمد خان کی بیس سے اوپر بیویاں تھیں۔ یہ سب کچھ اچھی خوراک اور حکیموں کے دیئے گئے کشتوں کی بدولت تھا۔ وہ ابھی بھی عالیہ کی طرف انتہائی غور سے دیکھ رہا تھا۔ عالیہ ان سب سے بڑی اور قدرے دلکش نقوش رکھتی تھی۔ اس کا رنگ بہا پور کی سبھی عورتوں کی طرح سانولہ تھا۔ وہ کالی تھی لیکن اس کی آنکھیں بہت بڑی بڑی اور روشن تھیں۔ جوانی کی ایک اپنی بھی دلکشی ہوتی ہے۔ عالیہ میں وہ سب کچھ موجود تھا۔ نواب احمد کی تیز نظریں اس کے سراپا کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔

”چاچا! گھر جا رہے ہیں۔ روہی سے بیرا اکٹھے کرنے گئے تھے اب واپس گھر جا رہے ہیں۔“ حیات نے جلدی سے جواب دیا۔ ساری لڑکیوں میں وہ واحد لڑکا تھا۔

”اوئے! تم نواب صاحب کی شان میں گستاخی کر رہے ہو۔۔۔ یہ ریاست بہا پور کے نواب احمد خان ہیں۔“ ایک گھڑسوار نے حیات کو زور سے تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔ وہ گھوڑے سے نیچا اتر گیا تھا۔

”تم نواب صاحب کو چاچا کہہ رہے ہو؟“ اس نے ایک اور تھپڑ حیات کو جڑ دیا۔ وہ پہلے تھپڑ سے ہی گر گیا تھا۔ حیات کے اوپر اٹھتے ہی اس آدمی نے دوسرا تھپڑ مار دیا تھا۔ حیات کا تھیلہ زمین پر گر گیا تھا اور اس میں سے سارے بیر بھی باہر نکل کر ریت پر پھیل چکے تھے۔

”چلو معافی مانگو نواب صاحب سے! ورنہ اس گستاخی کی سزا موت ہے۔“ ایک اور گھڑسوار نے نیچے اتر کر حیات کا بازو پکڑا اور اسے نواب احمد خان کے گھوڑے کے سامنے لے گیا۔

”معاف کر دو نواب صاحب! غلطی ہو گئی، مجھ پر رحم کرو۔“ حیات نے نواب احمد کے پاؤں پکڑتے ہوئے کہا۔ وہ گھوڑے پر ہی اکڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ حیات نے جیسے ہی اس کے پیروں کو ہاتھ لگایا اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے کندھے پر ہلکی سی تھپکی دی۔

”بچے ہم نے تمہیں معاف کیا، جاؤ تمہاری جان بخش دی جاتی ہے۔“ انہوں نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔

”منشی جی! پانچ گھڑسوار اپنے ساتھ لے جاؤ اور اس لڑکی کے گھر چلے جاؤ۔ ہمیں یہ لڑکی پسند آ گئی ہے اور ہم اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ لڑکی کے گھر والوں سے بات کرو اور واپس پڑاؤ (کیپ) میں آ جانا۔“

”جی نواب صاحب! ہم ان لڑکیوں کے ساتھ ہی گاؤں چلے جاتے ہیں۔“ منشی نے جلدی سے جواب دیا اور وہ اپنے ساتھ لے جانے کے لئے گھڑسوار الگ کرنے لگا۔

”منشی! ہم کل ہی بارات لیکر ان کے گاؤں جائیں گے۔“ نواب احمد نے منشی کو اگلا حکم دیا اور گھوڑے کو ایڑی لگا کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے باقی بھی چل پڑے۔ جبکہ منشی اور پانچ دوسرے گھڑسوار لڑکیوں کے ساتھ گاؤں چلے گئے۔

”منشی جی! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ نواب صاحب ساٹھ سال سے اوپر کے ہیں جبکہ عالیہ تو ابھی بالکل ہی بچی ہے۔ میری بچی تو مر جائے گی۔“ شجاعت محمد اس وقت منشی حبیب اللہ کے سامنے زمین پر دونوں ہاتھ جوڑے بیٹھا ہوا تھا۔

”دیکھو شجاعت محمد! تم تو بڑی قسمت والے ہو جو نواب صاحب تمہارے گھر کے داماد بننے والے ہیں۔ یہ تو تمہاری بچی کی خوش قسمتی ہے۔ اسے ہمارے نواب صاحب سے اچھا کوئی اور رشتہ مل ہی نہیں سکتا تھا۔“ منشی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

اس کی اتنی حیثیت ہی نہیں تھی کہ وہ نواب احمد خان کے رشتے سے انکار کر سکے۔ یہ آج سے 100 سال پہلے کی بات ہے۔ اس زمانے میں نواب اور راجہ مہاراجے ہی سب کچھ تھے۔ ریاست کے اندر

صرف نواب کا ہی قانون چلتا تھا اور اس کا حکم ہی قانون کا درجہ رکھتا تھا۔ اس نے جو بول دیا وہی سب کچھ تھا۔ پوری ریاست میں کسی کو بھی نواب کے حکم سے بغاوت کی جرات نہیں تھی۔ وہ تو بغیر نکاح کے ویسے بھی عالیہ کو لے جاسکتا تھا لیکن اس میں بھی نواب کی حکمت عملی تھی۔ وہ عام رعایا کے دل میں نفرت پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نواب مسلمان بھی ہوتے تھے اس لئے کچھ خدا کا خوف بھی ہوتا تھا۔ کچھ رعایا کا خوف بھی ہوتا تھا کیونکہ بادشاہ اگر ظالم اور جابر ہو تو رعایا بیرونی حملہ آوروں کے خلاف مزاحمت نہیں کرتی۔ فوج کے اندر بھی بغاوت کا اندیشہ ہوتا تھا۔

رعایا کی مثال ان بیلوں جیسی ہوتی تھی جنہیں مالک لیکر جاتے یا چور ان کو کوئی پروا نہیں ہوتی۔ ان کا کام صرف ہل چلانا اور چارہ کھانا ہوتا ہے۔ بادشاہ اپنی حکومت بچانے کے لئے فوج کے ساتھ ساتھ مولویوں کی بھی خدمات حاصل کرتا ہے۔ جو رعایا کو بادشاہ سے وفادار رہنے اور بیرونی حملہ آوروں کے خلاف جہاد کی تربیب اور تعلیم دیتے ہیں۔ حالانکہ اسلام واضح طور پر بادشاہت اور باپ کے بعد بیٹے کی حکومت کے خلاف ہے۔ ہمارے نبی ﷺ کے نواسے امام حسین رضی اللہ عنہ نے اسی نظریے کی حفاظت کے لئے اپنی جان قربان کر دی تھی۔ بحر حال مولویوں کے خلاف لکھنا اور بولنا بھی جرم بن جاتا ہے۔ یہ کسی کے خلاف بھی فتویٰ دے سکتے ہیں۔ یہی مولوی بادشاہ کو بھی یہ یقین دلاتے ہیں کہ وہ عام رعایا سے اوپر ہیں اس لئے ان پر چار شادیوں کا قانون لاگو نہیں ہوتا۔ بادشاہ چار سے زیادہ شادیاں کر سکتا ہے۔ نواب احمد خان کے پہلے ہی ان گنت بیویاں تھیں اور اس کا ابھی بھی دل نہیں بھرا تھا۔ عالیہ کا معصوم حسن اس کے دل پر وار کر چکا تھا اور اس نے عالیہ کو اپنی بیوی بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”شجاعت محمد! میں تم سے پوچھ نہیں رہا ہوں بلکہ تمہیں بتا رہا ہوں۔ ہمارے نواب صاحب کو تمہاری بیٹی پسند آگئی ہے اور وہ باقاعدہ شادی کر رہے ہیں۔“ منشی نے قدرے ترش لہجے میں کہا۔

”منشی جی! نواب صاحب کی تو پہلے سے ہی دو درجن سے اوپر بیویاں ہیں اور وہ ساٹھ سال سے اوپر کے ہو گئے ہیں۔ جبکہ عالیہ تو ابھی اٹھارہ سال کی بھی نہیں ہوئی ہے۔“ وہ اب بھی اعتراض کر رہے تھے۔ انکار کی جرات نہیں تھی لیکن جان بوجھ کر بیٹی کو جہنم میں بھی دھکیل سکتے تھے۔

”شجاعت! تم نواب صاحب کی شان میں گستاخی کر رہے ہو۔ تمہاری اس گستاخی کی سزا موت بھی ہو سکتی ہے۔“ منشی نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا۔

”منشی جی! میں تو بہت غریب سا کاشت کار ہوں۔ میری اتنی اوقات کہاں ہے کہ میں نواب صاحب کی شان میں گستاخی کر سکوں؟“ شجاعت نے اس کے آگے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

”منشی جی! عالیہ کی شادی کرنے کی بجائے میں اس کا گلہ ہی دبا دوں گا۔ خدا نے آپ کو بھی بیٹی دی ہو گی، آپ کو بھی معلوم ہو گا کہ موت زیادہ آسان ہے۔“ شجاعت نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ وہ عالیہ کی شادی نواب سے کرنے کی بجائے اس کا گلہ دبا کر مار دینا زیادہ آسان سمجھتا تھا۔

”دیکھو شجاعت! گلہ دباننا بہت آسان ہے لیکن بیٹی سے پہلے اپنے خاندان کا بھی گلہ دبا دینا۔۔۔ بلکہ سارے گاؤں والوں کا بھی گلہ دبا دینا۔ نواب صاحب کل بارات لیکر آئیں گے اور اگر انھیں عالیہ مری ہوئی ملی تو وہ اس پورے گاؤں کو زندہ جلا کر رکھ دیں گے۔ تم میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہیں بچے گا۔ بھاگنے کی بھی کوشش مت کرنا! بہالپور کی ریاست بہت بڑی ہے اور تم لوگ اس ریاست سے باہر نہیں نکل سکتے۔ نواب کی فوج اس پورے ریگستان میں پھیلی ہوئی ہے۔“ منشی نے اسے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔ شجاعت اس کی بات سن کر اندر تک ہل گیا تھا۔

”منشی جی! عالیہ ابھی بہت چھوٹی ہے، میری بچی مرجائے گی۔۔۔ یہ ظلم مت کرو۔“ اس نے منشی کے پیر پکڑ لئے۔

”دیکھو شجاعت محمد! میں بھی ایک بیٹی کا باپ ہوں، تمہارے اس درد کو سمجھتا ہوں۔ لیکن نواب احمد خان یہاں کا بادشاہ ہے اور ہم اس کی رعایا۔۔۔ یہاں صرف بادشاہ کا ہی حکم چلتا ہے۔ میں اور تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ ہم نواب اور اس کی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بیٹی دے کر اگر گھر اور خاندان بچتا ہے تو فیصلہ ہمیشہ گھر کے حق میں کرنا چاہیے۔ بیٹیاں تو ازل سے قربانیاں دیتی آئی ہیں اور اب تک دیتی چلی جائیں گی۔“ منشی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے منشی جی! میں عالیہ کی شادی کے لئے تیار ہوں، آپ نواب صاحب کو اطلاع کر دیں۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”بہت اچھا کیا شجاعت! میں ابھی ایک گھڑ سوار نواب صاحب کی طرف اطلاع دے کر بھجوا دیتا ہوں۔ وہ کل دن کو بارات لے کر آجائیں گے۔ میں اور میرے ساتھ آئے باقی گھڑ سوار آج رات آپ کے ہی گھر میں رہیں گے۔ آپ ہمارے سونے اور کھانے پینے کا بندوبست کر دیں۔“ منشی گھر سے باہر نکلا اور اس نے

باہر کھڑے گھڑسواروں میں سے ایک گھڑسوار کو نواب صاحب کے لئے پیغام دے کر بھجوا دیا اور خود واپس گھر میں آ گیا۔

شجاعت بھی منشی کے باہر نکلتے ہی اندر کمرے میں چلا گیا تھا اور اس نے عالیہ کی شادی کی بات اندرجا کر سب کو بتادی تھی۔ منشی کو اندر کمرے سے رونے کی آوازیں آرہی تھیں اور سب اندر رو رہے تھے۔ منشی حبیب اللہ کو ان کی بے بسی کا اندازہ ضرور تھا لیکن وہ ان کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ انگریزوں سے پہلے پورے ہندوستان کی یہی حالت تھی۔ یہاں نواب اور راجے مہاراجے ہی قانون تھے۔ ہم نے 1947ء میں انگریزوں سے آزادی حاصل کی تھی لیکن شاید انگریزوں نے 1857ء میں ہمیں ان نوابوں سے آزادی دلوائی تھی۔ ہم ہندوستانی رعایا تو بنیل تھے جن کا مالک تبدیل ہو گیا تھا۔ نیا مالک (انگریز) پرانے مالکوں سے اچھا تھا۔ آزادی کا صحیح مطلب تو انگریز ہی ہمیں سکھا کر گیا تھا۔ اگر انگریز اس خطہ میں نہ آتا تو یہاں انڈیا اور پاکستان دو ملک نہیں بلکہ 100 سے اوپر چھوٹے چھوٹے ملک ہوتے۔ مثل تو صرف دہلی تک ہی محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ پنجاب کی سکھ سلطنت، حیدرآباد دکن، میسور مراٹھے اپنا اپنا الگ ملک بنا کر بیٹھے ہوتے۔ یہ انگریز ہی تھے جنہوں نے ساری خود مختار ریاستوں کو ہندوستانی حکومت کے زیر نگیں کیا اور پھر انڈیا اور پاکستان میں تقسیم کر کے چلے گئے۔“ میری آواز تھوڑی بھاری ہو گئی۔

”ایلن! تم خود بھی غیر ملکی ہو، تمہاری رگوں میں یورپین خون ہے اس لئے تم انگریزوں کی حمایت کر رہے ہو۔“ ایمپیڈر نے مجھے درمیان سے ٹوکتے ہوئے کہا۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ میں نے اس میں سے صرف دو ہی گھونٹ لیے تھے اور میں کہانی میں گم ہو چکا تھا۔ یہ ساری کہانی مجھے عالیہ نے ہی سنائی تھی۔

”ایلن! یہ تمہارا اپنا نظریہ ہے کہ انگریزوں نے اس ملک پر احسان کیا ہے۔ ورنہ یہ لوگ تو انگریزوں کو غاصب ہی سمجھتے ہیں۔ میں بھی سفارت خانے سے باہر نکلتا ہوں تو اپنے ساتھ پولیس کے دو ملازم لے کر جاتا ہوں۔ کراچی والے مجھے بھی انگریز ہی سمجھتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں۔“ ایمپیڈر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”سر! ابھی نئی آزادی ملی ہے، لوگ اتنے تعلیم یافتہ نہیں ہیں۔ تھوڑے مہذب ہوں گے تو سب سمجھ جائیں گے۔ تاریخ ان لوگوں کو خود ہی بتا دے گی کہ متحدہ ہندوستان کو متحد رکھنے میں مغل بادشاہ، سکھ مہاراجہ رنجیت سنگھ اور انگریزوں کا ہاتھ ہے۔ انہی کی وجہ سے ہی آج ہم دو ملک ہیں۔ سر! لوگوں کو نفرت کرنے دو، شعور آئے گا تو خود بخود سمجھ جائیں گے۔“ میں نے چائے کا کپ پکڑا اور ٹھنڈی چائے کے ہی گھونٹ بھرنے

لگا۔

”آپ کی چائے تو ٹھنڈی ہو گئی ہے۔۔۔ میں ملازم کو کہہ کر نئی چائے بنوا دیتا ہوں۔“ انھوں نے ملازم کو آواز دی اور اسے چائے بنانے کا حکم دے دیا۔ ملازم کمرے سے باہر گیا تو میں دوبارہ کہانی کی طرف آ گیا۔

عالیہ کے گھر میں اس وقت کہرام مچا ہوا تھا، سارا گھر ہی رو رہا تھا۔ منشی حبیب اللہ صحن میں پڑی ہوئی چار پائی پر ہی بیٹھ گیا۔ اس نے گھر والوں کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کی۔ کافی دیر تک رونے کے بعد شجاعت کمرے سے باہر آ گیا۔ اس کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سرخ ہو گئیں تھیں۔ مرد بڑا مضبوط ہوتا ہے، یہ بڑے سے بڑے غم کو بھی برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن جب معاملہ بیٹی کا ہو تو وہی مرد دنیا کی کمزور ترین چیز بن جاتا ہے۔ بیٹی کا دکھ مرد کو اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے۔ شجاعت محمد بھی بہت مضبوط تھا لیکن صرف ایک جھٹکے نے ہی اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

”منشی جی! بارات کل کس وقت آئے گی؟“ مجھے بارات کے کھانے کے لئے کچھ بندوبست کرنا ہوگا۔ اس نے باہر نکل کر منشی سے کہا۔

”چوہدری! تمہیں کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے، سارا انتظام ہم خود کریں گے۔ تمہاری بیٹی کی شادی میں سارے گاؤں والوں کو دعوت دی جائے گی اور انہیں ہرن کا گوشت کھلایا جائے گا۔“ منشی نے اس کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

”منشی جی! غریب اور بے بس آدمی ہوں۔۔۔ نواب صاحب کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتا لیکن جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ضرور ہوتا ہے۔ اس غریب بوڑھے باپ کی آہ ضرور نواب کو لگے گی۔ خدا ہماری ریاست کو سلامت رکھے لیکن اس بے بس باپ کی بددعا ہے کہ بہاولپور پر سے نوابوں کی حکومت ضرور ختم ہو گی۔ خدا ہی میری بچی کا حساب لے گا۔“ وہ غم سے نڈھال ہو گیا تھا۔

دوسرے دن نواب احمد خان بارات لیکر آیا اور عالیہ سے نکاح کر کے اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ نواب نے سہاگ رات روہی کے ریگستان میں ہی منائی۔ وہ رات عالیہ کے لئے قیامت کی رات تھی لیکن گزر گئی۔ قیامت کی ایک رات نے ہی عالیہ کا بچپن چھینا اور اسے لڑکی سے ایک عورت بنا دیا۔ ایک مظلوم عورت جس کی آنکھیں سوال کرتی تھیں کہ اس کا کیا قصور تھا، اسے کس جرم کی سزا دی گئی؟ اسلام تو شادی کے وقت

عورت کی اجازت لینے کا بھی کہتا ہے لیکن یہاں تو پوچھنے والا مہاراجہ تھا۔ عالیہ اور اس کا پورا خاندان خاموشی سے قربان ہو گیا۔

نواب نے عالیہ کے بدلے میں اس کے باپ کو ایک مربع زمین دی۔ عالیہ کا باپ زمین نہیں لینا چاہتا تھا لیکن یہاں بھی بے بسی تھی۔ اگر نواب کو انکار کرتا تو بے موت مارا جاتا۔ اس لئے اس نے انگوٹھا لگایا اور خاموشی سے ایک مربع زمین کے کاغذات گھر لے کر آ گیا۔ پہلے وہ نواب کی زمین پر کاشت کاری کرتے تھے لیکن اب زمین ان کی ہو گئی تھی۔ نواب نے ان کا سارا لگان بھی معاف کر دیا تھا۔ اب پوری فصل ان کی اپنی ہوتی تھی۔ عالیہ تو قربان ہو گئی تھی لیکن اس کی قیمت بہت لگی تھی۔ ایک مربع زمین اور لگان سے آزادی بہت بڑی قیمت تھی۔ خریدار جب بڑا ہوتا ہے تو قیمت بھی بڑی لگتی ہے۔ ایک ہفتے تک نواب روہی میں ہی اس کے ساتھ رکا رہا۔ وہ دن کو ہرن کا شکار کرتا اور رات کو عالیہ کا شکار کرتا۔ ایک ہفتے تک مسلسل چلنے والے اس شکار کا اختتام ہوا اور وہ سب بہا پور شہر آ گئے۔

صادق آباد میں بھی نواب کے قلعے موجود تھے لیکن ریاست کا قدر و مقام بہا پور تھا۔ نواب کی رہائش گاہ بہا پور میں تھی اور وہ عالیہ کو بھی لیکر اپنے محل میں آ گیا۔ عالیہ نواب احمد خان کے حرم میں داخل ہو گئی تھی۔ یہاں حرم میں اس سے پہلے بھی درجن کے قریب بیویاں تھیں۔ نواب کے حرم میں اس وقت کوئی 20 سے اوپر عورتیں تھیں۔ ان میں سے کچھ نواب کی بیٹیاں کچھ مائیں اور دیگر رشتہ دار خواتین تھیں۔ نواب کا حرم ایک قید خانہ تھا جہاں عورتوں کے ارمان قید تھے۔ جو عورت ایک بار نواب کے حرم میں داخل ہو جاتی اس کے بعد موت ہی اسے حرم سے باہر نکال سکتی تھی۔ عالیہ نواب کی ساری بیویوں میں سے سب سے کم سن تھی۔ وہ سب سے چھیتی بیوی تھی لیکن صرف نواب کے بستر کی حد تک۔

حرم میں سارا انتظام نواب کی سب سے بڑی بیوی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ راجھستان کے ایک نواب کی بیٹی تھی اس لئے محل کے اندر اسی کا حکم چلتا تھا۔ جبکہ محل سے باہر نواب کی حکومت تھی۔ انگریز پورے ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے۔ بہا پور کی ریاست بھی انگریزوں کی باج گزار تھی۔ نواب احمد خان انگریزوں کو سالانہ خراج دیتا تھا جس کے بدلے میں انگریز اس کی حکمرانی کو تسلیم کرتے تھے۔ یہ سالانہ خراج اربوں روپیہ بنتا تھا۔ نواب عام رعایا سے لگان وصول کرتا تھا اور اسی لگان سے فوج کی تنخواہیں اور محل کے اخراجات نکلتے تھے۔ اور اسی سے انگریزوں کو خراج بھی دیا جاتا تھا۔

اگلے چھ مہینے تک عالیہ نواب کی منظور نظر رہی پھر دل سے اتر گئی۔ اس کی جگہ ایک اور لڑکی محل میں آ گئی تھی۔ نواب شادی کر کے ایک اور خوبصورت سی لڑکی حرم میں لے کر آ گیا تھا۔ عالیہ کی اہمیت ختم ہوئی اور وہ خود بخود ہی ایک کونے میں جا لگی۔ نواب نے اس کے ساتھ اپنا ہر قسم کا تعلق ختم کر لیا تھا لیکن پھر بھی اسے واپس گاؤں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ عالیہ کے والد اور بھائی اس سے ملنے بہاولپور آئے تھے لیکن انہیں محل کے اندر جانے کی اجازت ہی نہیں ملی تھی۔ انھیں دربانوں نے باہر سے ہی واپس کر دیا تھا اور وہ ناکام واپس لوٹ گئے تھے۔ عالیہ کی زندگی بالکل ٹھہری گئی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ شاید اس کی باقی قسمت محل کے حرم سرا میں ہی لکھی ہوئی ہوگی اور وہ یہیں باقی زندگی بھگتی رہے گی، لیکن وہ غلط تھی۔ خدا نے اس کی قسمت میں بہت لمبا سفر لکھا تھا۔ اسے ابھی مزید دھکے کھانے تھے۔

اسے حرم سے باہر نکالنے کے لئے ایک عورت آ گئی تھی جو کہ ایک انگریز گورنر کی بیوی تھی۔ انگریز گورنر کا نام ایڈی تھا اور وہ پنجاب کا گورنر تھا۔ بنگال سے نئی نئی اس کی پنجاب میں پوسٹنگ ہوئی تھی۔ بہاولپور ریاست پنجاب کی سرحد کے ساتھ لگتی تھی۔ وہ کچھ مہینے لاہور رہا اور پھر ہمسایہ ریاستوں کے دوروں پر نکل آیا۔ وہ عملی طور پر تو پنجاب کا گورنر تھا لیکن دیگر نیم خود مختار ریاستوں کا بھی نگران تھا۔ ساری ریاستیں اس گورنر کے احکامات ماننے کی پابند تھیں۔ ریاست میں حکمران تو راجے ہوتے تھے لیکن ان کے لئے پیچھے ریاست کے وزیر اعظم انگریز گورنر ہی کی منظوری سے تقرر ہوتے تھے۔ ریاست کی فوج کے چیف بھی انگریز ہی اپنی مرضی سے تعینات کرتا تھا۔

یہاں کا پہلا وزیر اعظم مر گیا تھا اور اس کی جگہ نیا وزیر اعظم بنانا تھا، اس لئے گورنر سیدھا پہلے بہاولپور ہی آیا تھا۔ وہ اور اس کی بیوی محل میں ہی ٹھہرے ہوئے تھے۔ انگریز گورنر کی بیوی ایلیسا (ALISA) چالیس سال کی ایک بھرپور عورت تھی۔ عالیہ کو انگریز گورنر کی بیوی ایلیسا کی خدمت کے لئے لگا دیا گیا تھا۔ وہ ایک ہفتہ یہاں رکے تھے۔ اس ایک ہفتے میں ایلیسا کو عالیہ پسند آ گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی زبان تو نہیں جانتے تھے لیکن پھر بھی عالیہ کی خاموشی کو ایلیسا سمجھنے لگی تھی۔ ایلیسا کو عالیہ کی معصومیت بھاگتی تھی۔ اس نے عالیہ کے بارے میں معلومات اکٹھی کیں تو اسے سارے معاملات کا علم ہو گیا۔ اس کو عالیہ کی معصومیت پر ترس آ گیا تھا۔ وہ اسے آزاد کروانا چاہتی تھی۔

”ایلیسا! ہم اس لڑکی کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔“ ایڈی نے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ایلیسا

پچھلے دودن سے مسلسل ایڈی سے عالیہ کو واپس اس کے گھر بھجوانے پر زور دے رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ نواب عالیہ کو طلاق دیکر واپس اس کے گاؤں بھیج دے۔ ویسے بھی نواب احمد خان نے ایک اور شادی کر لی تھی۔ نواب اب عالیہ کی بجائے اور لڑکی کے پاس جاتا تھا۔ عالیہ کی حیثیت اب محل میں ایک کنیز کی سی ہو گئی تھی۔ ایلیسا چاہتی تھی کہ نواب اسے واپس اس کے گھر بھیج دے۔

”ایڈی! یہ کونسی مشکل بات ہے؟ اس لڑکی پر ظلم ہو رہا ہے۔ جب نواب احمد نے اس کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں رکھنا تو پھر اسے اس حرم میں کیوں غلاموں کی طرح رکھا ہوا ہے؟ غضب خدا کا دیکھو، ستر سال کا بوڑھا ہے اور اٹھائیس شادیاں کی ہوئی ہیں۔ نواب کی بیٹیوں کی عمر بھی چالیس سال سے اوپر ہے اور یہ سولہ سولہ سال کی معصوم بچیوں سے شادی کر رہا ہے۔“ ایلیسا کو غصہ آ گیا۔

”دیکھو ڈارلنگ! مجھے معلوم ہے کہ عالیہ پر ظلم ہو رہا ہے لیکن بحر حال یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ ہم ان کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی نہیں کر سکتے۔“ ایڈی اپنی بیوی کو مسلسل سمجھا رہا تھا۔

”آپ کیوں نہیں کر سکتے؟ آپ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ریاست کے سارے معاملات آپ کی اجازت سے ہوتے ہیں تو پھر یہ تو ایک چھوٹی سی پرابلم ہے۔“ ایلیسا نے زور دیتے ہوئے کہا۔ وہ آج ہر حالت میں ایڈی کی ہاں سننا چاہتی تھی۔

”یار! بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔۔۔ ریاست کے سارے معاملات انگریز حکومت ہی دیکھتی ہے۔ میں پنجاب کا گورنر ہوں اور میرے دائرہ اختیار میں ریاست بہادر پور بھی آتی ہے۔ لیکن بحر حال میری بھی ایک حد ہے۔ میں ریاست کے معاملات میں دخل اندازی کر سکتا ہوں لیکن نواب کے ذاتی معاملات میں نہیں۔ یہ لوگ ہمارے غلام ہیں لیکن یہ کبھی بھی غیرت پر سودا نہیں کرتے۔ یہ عالیہ کو ہمارے کہنے پر واپس اس کے گاؤں بھیج دیں گے لیکن ہمارے جاتے ہی عالیہ واپس آ جائے گی یا ماردی جائے گی۔ یہ کبھی بھی عالیہ کو واپس اس کے گاؤں میں نہیں رہنے دیں گے۔ یہ نواب احمد خان کی عزت کا سوال ہے۔“ ایڈی نے تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اسے ہندوستانیوں کی نفسیات کا علم تھا۔

”ایڈی! آخر کوئی تو حل ہو گا نا؟ آپ کے وفادار جاسوس یہاں محل میں موجود ہوں گے۔ کیا ان کے ہوتے ہوئے بھی نواب ایسا قدم اٹھائے گا؟“ ایلیسا اب بھی مان نہیں رہی تھی۔

”بلاشبہ میرے یہاں کئی جاسوس موجود ہیں لیکن اس معاملے میں وہ نواب کے وفادار ہوں گے۔“

ایڈی نے جواب دیا۔

”کیا ہم عالیہ کو اپنے ساتھ لاہور نہیں لے جاسکتے؟ وہ کم از کم نواب کے ظلم سے تونچ جائے گی؟“ ایلیسا نے ایک نیا مشورہ دیا۔

”ارے! تم واقعی پاگل ہو، کچھ بھی کہہ دیتی ہو۔“ وہ ایلیسا کی بات سن کر ہنس پڑا۔

”ایڈی! یہ کچھ غلط بھی نہیں ہے۔۔۔ ہم عالیہ کو اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔“ ایلیسا نے اپنی بات دوبارہ دہرائی۔

”نہیں ایلیسا! یہ تو بالکل ہی ناممکن ہے۔ ہمیں ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے واضح احکامات ہیں کہ ہم ہندوستان کے ذاتی اور مذہبی معاملات میں دخل اندازی نہیں کر سکتے۔ نواب ایک شادی کرتا ہے یا بچاس شادیاں کرتا ہے، یہ لوگ خدا کو مانتے ہیں یا بتوں کو پوجتے ہیں، ہم ان کو نہیں روک سکتے۔ یہ تاج برطانیہ کے واضح احکامات ہیں۔ میرے اوپر بھی لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور میں نے وائسرائے کو رپورٹ دینی ہوتی ہے۔ ہندوستان ہمارا مقبوضہ ملک ہے لیکن ہمیں ہر چیز کی آزادی نہیں ہے اور ہم یہاں کے بادشاہ نہیں ہیں۔“ ایڈی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے ایڈی! مجھے سمجھ آ گئی ہے لیکن پھر بھی وعدہ کرو کہ تم ایک بار لڑائی ضرور کرو گے؟ یقین کرو ایڈی! میں نے عالیہ جیسی معصوم لڑکی اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھی۔ اس معصوم پر بہت ظلم ہو رہا ہے۔ ہم اگر اس کے لئے کچھ کر سکتے ہیں تو ہمیں ضرور کرنا چاہیے۔ خدا ہمیں اس کا صلہ ضرور دے گا۔“ ایلیسا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے ایلیسا! میں کوشش ضرور کروں گا، باقی جو خدا کو منظور ہوگا۔“ ایڈی نے کمرے کی چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کمرے کی چھت کافی اونچی تھی اور وہاں ایک بہت بڑا فانوس بھی لگا ہوا تھا۔ جس میں موم بتیاں لگا کر روشنی کی گئی تھی۔ بجلی ابھی تک پورے ہندوستان میں نہیں آئی تھی۔ کمرے میں روشنی لالٹینوں اور موم بتیوں سے ہی کی جاتی تھی۔ ایڈی نے دوسرے دن ہی عالیہ کی بات نواب سے کر دی۔ اسے معلوم تھا کہ نواب کبھی بھی اسے گاؤں میں نہیں رہنے دے گا۔ وہ وقتی طور پر تو عالیہ کو گاؤں بھجوا دے گا لیکن پھر خفیہ طور پر اسے قتل کروا دے گا۔ گاؤں میں صرف اکیلی عالیہ ہی قتل نہ ہوتی بلکہ وہ پورے گاؤں کو ہی ڈاکوؤں کی مدد سے قتل

کروادیتا۔ الزام الٹا ڈاکوؤں پر آتا اور نواب صاف ہی مکر جاتا۔ وہ گورنر ہو کر بھی ان نوابوں کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ہندوستان پر حکومت تو انگریزوں کی ہی تھی لیکن انگریز ایک حد سے زیادہ آگے نہیں بڑھتے تھے۔ انھیں ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے ان نوابوں کی ضرورت تھی۔

”سر! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ عالیہ میری بیوی ہے اور میں اسے آپ کے ساتھ لاہور کیسے بھیج سکتا ہوں؟“ نواب احمد خان اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

”نواب صاحب! عالیہ میری بیوی ایللیسا کو بہت پسند آئی ہے۔ وہ ایللیسا کی خدمت بھی کرتی ہے۔ آپ کی پچیس تیس بیویاں ہیں، ایک عالیہ کے چلے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ انگریز گورنر نے مضبوط لہجے میں کہا۔ وہ نواب کے سامنے ڈھیلا نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

”سر! میری ایک بیوی ہو یا ایک سوا ایک یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ کو لڑکی چاہیے تو میں بہادرپور سے جتنی لڑکیاں آپ کہو گے بھجوا دیتا ہوں لیکن اپنے حرم کی عورت کبھی نہیں دے سکتا۔“ نواب نے واضح انکار کرتے ہوئے کہا۔

”نواب صاحب! باقی لڑکیاں بھی تو کسی کی بہن بیٹیاں ہوں گی نا؟“ گورنر نے طنز کیا۔

”سر! جو بھی ہو میں عالیہ کو کبھی بھی آپ کے ساتھ لاہور نہیں بھیجوں گا کیونکہ وہ میری بیوی ہے۔ آپ کو لڑکیاں چاہئیں تو بولیں میں لڑکیوں کی لائن لگا دوں گا۔ آپ کی بیوی اپنی مرضی سے جتنی بھی لڑکیاں لے جانا چاہیں لے جاسکتی ہیں۔ بس میں اپنے گھر کی عورت نہیں دے سکتا۔“ نواب احمد خان ابھی تک اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے نواب صاحب! پھر تیاری کر لو، بہادرپور کی ریاست ختم ہونے لگی ہے۔ یہاں اب انگریز حکومت ہوگی۔“ گورنر ایڈمی نے اس بار باقاعدہ دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

وہ براہ راست کسی بھی ریاست پر حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے وائسرائے کی اجازت لینا پڑتی تھی۔ وائسرائے ہند بھی ملکہ وکٹوریہ اور وزیراعظم ہنری جان ٹمپل سے اجازت لینے کے بعد ہی کسی ریاست پر حملہ کر سکتا تھا۔ انگریز گورنر کو بہادرپور کی ریاست پر حملہ کرنے کے لئے باقاعدہ وائسرائے ہند کو درخواست دینی پڑنی اور وضاحت بھی کرنی پڑتی تھی کہ کس وجہ سے ریاست کا کنٹرول حاصل کرنا ناگزیر ہے۔ یہ اتنا آسان کام نہیں تھا۔ گورنر کے پاس کوئی معقول بہانہ نہیں تھا اور اس کی اپنی نوکری بھی جاسکتی تھی۔

”سر! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ریاست بہاولپور انگریزوں کی وفادار ہے۔ ہمارا ملکہ وکٹوریہ سے معاہدہ ہوا ہے اور ہم سالانہ خراج دیتے ہیں۔“ نواب احمد خان نے جلدی جلدی بولتے ہوئے کہا۔ وہ انگریز گورنر کی دھمکی سے ڈر گیا تھا۔ گورنر نے تو صرف اوپر اوپر سے ہی دھمکی دی تھی۔ اس کا کوئی بھی ارادہ ریاست پر حملے کا نہیں تھا۔ وہ صرف نواب کو ڈرا رہا تھا۔ اگر نواب مضبوط رہتا تو وہ اپنی بات سے پیچھے ہٹ جاتا۔ لیکن نواب کے ڈرنے اسے راستہ دکھا دیا۔ اس نے اسے مزید ڈرانے کا فیصلہ کر لیا۔

”نواب صاحب! آپ وفاداری کا ڈھونگ رچا رہے ہو، ہم لوگ اگر سالانہ خراج لیتے ہیں تو بدلے میں آپ کی ریاست کی حفاظت بھی کرتے ہیں۔ آپ کی نوابی بھی اسی وجہ سے قائم ہے کہ آپ ملکہ وکٹوریہ کے وفادار ہو لیکن بحر حال میں عالیہ کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“ گورنر نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔

”سر! وہ میری بیوی ہے۔ آپ میری وائسرائے سے بات کروادیں، میں دلی چلا جاتا ہوں۔“ نواب احمد خان کی آواز کمزور ہو گئی تھی لیکن وہ اب بھی مزاحمت کر رہا تھا۔

”نہیں نواب صاحب! ایک ہی فیصلہ ہے۔ ریاست چاہیے یا عالیہ؟ دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرو۔۔۔ ہم ہندوستان کی سب سے طاقتور ترین سکھ سلطنت کا خاتمہ کر سکتے ہیں جو راوی سے لیکر کابل تک پھیلی ہوئی تھی تو پھر بہاولپور تو ہمارے ایک دن کی مار ہے۔ تمہاری فوج تو انگریز سرکار کے سامنے ایک دن بھی نہیں نکالے گی۔ بہاولپور اب براہ راست تاج برطانیہ کے مقبوضات میں شامل ہوگا۔“ گورنر اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”نواب صاحب! تیاری کر لو۔۔۔ ملتان میں ہماری ایک کمپنی موجود ہے۔ اسے صرف ایک دن لگے گا تلج دریا تک پہنچنے میں، اپنی فوجوں کو سرحد پر لے آؤ اور اب فیصلہ جنگ سے ہوگا۔ ہم بہاولپور ریاست بھی لے جائیں گے اور عالیہ کو بھی۔ تمہاری جگہ اب رنگون ہی ہوگی۔“ گورنر نے ٹھوس لہجے میں کہا اور باہر کی طرف بڑھ گیا۔

”میں عالیہ کو آپ کے ساتھ لاہور بھیجنے کے لئے تیار ہوں۔“ نواب نے اسے پیچھے سے آواز دی۔ وہ عالیہ سے دستبردار ہونے پر تیار ہو گیا تھا۔ گورنر کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ ابھری، وہ رکا اور واپس پلٹ کر آ گیا۔

”نواب صاحب! یہ آپ نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ آپ واقعی تاج برطانیہ کے وفادار ہیں۔“ گورنر

نے اسکے کندھے پر تھپکی دی۔

”سر! ہماری ریاست ہمیشہ آپ کی وفادار رہے گی۔“ نواب احمد خان نے گورنر کے سامنے اپنی گردن جھکا لی۔

گورنر کا ابھی دودن مزید بہاولپور میں رکنے کا پروگرام تھا لیکن اس نے مزید رکننا مناسب نہ سمجھا۔ نواب نے ہاں تو کر دی تھی لیکن اس کا دماغ کبھی بھی الٹ سکتا تھا۔ اس کے اندر کا بادشاہ کبھی بھی جاگ سکتا تھا۔ اس لئے اس نے جلدی جلدی سارے معاملات نمٹائے اور شام کو ہی وہاں سے نکل گیا۔ عالیہ کو نواب احمد خان نے طلاق دے دی تھی اور وہ اب ان کے ساتھ تھی۔ گورنر بہاولپور سے نکلا اور ریاست بیکانیر پہنچ گیا۔ یہاں ایک ہندو مہاراجہ کی حکومت تھی۔ وہ ایک ہفتے تک اسی ہندو مہاراجہ کے مہمان رہے اور پھر واپس تخت لاہور آ گئے۔ عالیہ کو نواب احمد خان سے نجات مل چکی تھی لیکن اس کی قسمت میں ابھی بہت سے دکھ لکھے تھے۔ یہاں اسے صرف تین مہینے ہی سکون کے ملے اور ایک بار پھر آزمائش شروع ہو گئی۔ گورنر کو اچانک ملکہ کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ برطانیہ سے اس کی جگہ پر ایک نیا گورنر آ گیا اور اسے برطانوی پارلیمنٹ میں ترقی دے کر وزیر بنادیا گیا۔ برطانوی پارلیمنٹ دنیا کی سب سے پرانی پارلیمنٹ ہے۔ دنیا میں جمہوریت تو اسلام نے متعارف کروائی تھی۔ جب حضرت ابو بکر صدیق نبی پاک ﷺ کے وصال کے بعد خلیفہ بنے تھے۔ اسلام نے پہلی دفعہ بادشاہت ختم کر کے خلافت کا آغاز کیا تھا۔ جس میں مجلس شوریٰ رائے شماری سے خلیفہ منتخب کرتی تھی۔ دنیا کا پہلا سیاسی نظام بھی اسلام ہی لیکر آیا تھا لیکن بد قسمتی سے وہ زیادہ دیر تک چل نہ سکا۔ مسلم دنیا میں صرف پہلے 5 ہی حکمران خلیفہ تھے، اس کے بعد بادشاہت پھر واپس آ گئی۔ بنو امیہ، عثمانی خلافت یا موجودہ سعودی نظام حکومت نام تو خلافت کا ہی استعمال کرتی ہے لیکن حقیقت میں یہ سب بادشاہت ہے۔ خلافت یا جمہوریت وہی ہوتی ہے جس میں باپ کے بعد اس کا بیٹا بادشاہ نہ بنے۔ ریاست کے فیصلے فرد واحد کی بجائے ملکی پارلیمنٹ کرے تو وہی جمہوریت ہے، ورنہ بادشاہت ہے۔ آج کی جدید جمہوریت برطانیہ کی ہی بنی ہوئی ہے۔ برطانیہ میں آج بھی بادشاہت ہے لیکن وہ صرف نام کی ہے۔ اصل طاقت پارلیمنٹ کے پاس ہی ہے جو ملک کے عوام ووٹ دے کر منتخب کرتے ہیں۔ گورنر ایڈمی کو لاہور کی گورنری سے ہٹا دیا گیا تھا اور انہیں لندن میں برطانوی پارلیمنٹ میں وزیر بنادیا گیا۔

”ایلیسا! اب عالیہ کا کیا کرنا ہے؟“ وہ اپنی بیوی کے سامنے بیٹھا اس سے پوچھ رہا تھا۔

”ایڈی! اب تو اس کو طلاق ہو چکی ہے۔ ہم اسے واپس بہاولپور بھیج سکتے ہیں یا پھر یہیں کسی سے شادی کر دیتے ہیں۔“ اس نے مشورہ دیا۔

”نہیں یار! نواب ابھی تک بھولا نہیں ہے، اسے ابھی بھی سب یاد ہے۔ وہ ہمارے جاتے ہی عالیہ کو واپس لے جائے گا۔ صرف لے ہی نہیں جائے گا بلکہ مار بھی دے گا۔“ اس نے فکر مندی سے کہا۔

”ارے! ایسے کیسے مار دے گا، اس کا کیا قصور ہے؟“ ایلیسا نے تیز لہجے میں کہا۔

”یار ان نوابوں کو مارنے کے لئے بہانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ راجے مہاراجے صرف ناک اونچی رکھنے اور اپنی انا کی تسکین کے لئے کسی کی بھی جان لے سکتے ہیں۔ یہ زمین پر پھرنے والے وہ بادشاہ ہیں جو خدا بن بیٹھے ہیں۔ دس دس ہزار مربع میل کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے خدا جو اپنی رعایا کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں اور کوئی ان کا ہاتھ روکنے والا نہیں ہے۔ یقین کرو ایلیسا! نواب احمد خان عالیہ اور اس کے گھر والوں کو بہاولپور کے قلعے کے سامنے جلا کر رکھ کر دے گا تاکہ ان کی دہشت باقی رہے اور حرم کی کسی اور عورت کو باہر جانے کی ہمت نہ ہو۔“ ایڈی کے چہرے پر انتہائی سنجیدگی تھی۔

”ایڈی! ہم عالیہ کی ذمہ داری نئے گورنر کو بھی تو دے کر جاسکتے ہیں؟ وہ اسے اپنے پاس رکھ لیں گے۔ عالیہ بہت اچھی ہے اور وہ نئے گورنر اور اس کی فیملی کی خدمت کرتی رہے گی۔“ ایلیسا نے ایک نیا مشورہ دیا۔

”نہیں یار! نواب بہت کمینہ ہے اور وہ آسانی سے عالیہ کو لے جائے گا۔ عالیہ کے لئے جو جذبات ہم لوگ رکھتے ہیں وہ نیا گورنر نہیں رکھے گا۔ اسے عالیہ کی نہیں نواب آف بہاولپور کی ضرورت ہوگی۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”یار! ہر کوئی دل سے نہیں سوچتا، یہ سیاست بھی بڑی چیز ہوتی ہے۔ نیا گورنر ایک عالیہ کو دے کر ریاست بہاولپور سے ہزاروں کام نکلوا سکتا ہے۔ سندھ اور راجھستان میں درجنوں نیم خود مختار ریاستیں ہیں۔ نیا گورنر عالیہ کو اس کے حوالے کرے گا تو بد لے میں انگریز فوج کو بہاولپور میں جگہ مل جائے گی۔ جس کا کھانا پینا اور تنخواہیں سب نواب کے پلے سے ہوں گی۔ انگلش فوج جب بہاولپور میں ہوگی تو سندھ اور راجھستان کی کسی بھی ریاست کو سر اٹھانے کی جرات نہیں ہوگی۔ تمہاری عالیہ سیاست کی نظر ہو جائے گی۔“ اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔

”ایڈی تم ایسے ہی فکر مند ہو رہے ہو، ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔“ وہ اب بھی پُر امید تھی۔

”نہیں یار! یہی ہوگا۔ ہم انگریزان ہندوستانیوں کی نفسیات جانتے ہیں اسی لئے تو پورے ہندوستان پر حکومت کر رہے ہیں۔ ایک کو دوسرے سے لڑاؤ اور خود حکومت کرو۔ نواب نے خود مجھے آفر کی تھی کہ میں عالیہ کو نہ لیکر جاؤں اور اس کے بدلے میں اپنی فوج کا ایک پورا بریگیڈ ادھر لے آؤں۔ نواب پورے بریگیڈ کی تنخواہیں دینے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ میری جگہ کوئی بھی اور گورنر ہوتا تو وہ نواب کی آفر قبول کر لیتا۔ میں نے بھی صرف تمہاری وجہ سے انکار کیا تھا ورنہ نواب نے جتنی بڑی آفر کی تھی میں عالیہ جیسی دس لڑکیاں بھی نواب کو دے دیتا۔ چونکہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اور اسی محبت نے مجھے انکار کا حوصلہ دیا۔ آنے والا گورنر خود عالیہ کو بہاؤ پور چھوڑ کر آئے گا۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کی لکیریں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ پورے غلوں کے ساتھ عالیہ کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن بے بس ہو رہا تھا۔ اسے کوئی بھی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

”ایڈی! ہم عالیہ کو اپنے ساتھ برطانیہ لیکر نہیں جاسکتے۔“ ایلیسا نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”نہیں یار! یہ بہت مشکل کام ہے۔ انگلینڈ بہت دور ہے اور وہ دوبارہ کبھی بھی واپس نہیں آسکے گی۔“ ایڈی نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”ارے اس میں مشکل کنسی ہے، اس کی جان کو ادھر خطرہ ہی رہے گا۔ اس نے واپس آ کر بھی کیا کرنا ہے؟ وہ انگلینڈ میں ہمارے ساتھ ہی رہے گی۔“ ایلیسا نے ایڈی کے اعتراضات کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔

”یار! تم بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہی ہو۔۔۔ ہمارا بھی نیا نیا ہندوستان پر قبضہ ہوا ہے۔ ہمیں ان نوابوں اور راجوں کی ضرورت ہے لیکن آہستہ آہستہ جیسے جیسے ہمارا اقتدار مضبوط ہوتا جائے گا یہ راجے مہاراجے بھی ختم ہو جائیں گے۔ ہم ایک ریاست کو دوسری سے لڑائیں گے۔ ایک کو ساتھ ملا کر دوسری پر قبضہ کریں اور ایسے ہی کمزور کر کے ساری ریاستوں پر قبضہ کر لیں گے۔ اگلے بیس پچیس سال تک ہندوستان میں کوئی بھی راجہ نہیں رہے گا۔ نواب احمد خان ویسے بھی پانچ چھ سال تک مر جائے گا۔ ہم نے سارے ہی راجوں کو آہستہ آہستہ زہر دے کر مارنے کا پروگرام بنایا ہوا ہے۔ یہ میری گے تو آگے ان کی اولادیں کمزور حکمران ہوں گی جن پر ہم آسانی سے قابو پالیں گے۔ ایلیسا! یہ بہت بڑی گیم ہے جو پورے ہندوستان میں چل رہی ہے۔ برطانیہ اسی لئے عظیم ہے۔ ہم آنے والے سو سال کا سوچتے ہیں جبکہ ان راجوں کو کل کا بھی پتہ

نہیں ہوتا۔ ان کو شراب عورت اور شکار سے فرصت ہی نہیں ہوتی۔ عالیہ کو پہلے پانچ چھ سال ہی پر اہلم ہوگی اس کے بعد یہ آزاد ہو جائے گی۔ مجھے صرف ان پانچ چھ سالوں کے لئے پریشانی ہے۔ اتنے عرصے تک میں اسے کہاں رکھوں؟“ ایڈی نے اس بار پوری تفصیل سے ایلیسا کو سمجھایا جسے سن کر اس کی بیوی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اسے اتنے بڑے منصوبے کا علم نہیں تھا۔

”دیکھو ڈارلنگ! یہ سارا خفیہ پلان ہے جو صرف ہم گورنروں کو ہی پتہ ہے۔ یہ اتنا خفیہ ہے کہ یہاں کے وائسرائے کو بھی اس کا علم نہیں ہے۔ اس لئے میں امید کروں گا کہ تم بھی آگے اسے خفیہ ہی رکھو گی۔ ورنہ ہم دونوں کی جان کو خطرہ ہوگا۔“ ایڈی نے فکر مندی سے کہا۔

”یار! اس کی تم فکر مت کرو۔ میں نے کس کو بتانا ہے؟ مجھے تو صرف عالیہ کی فکر ہے۔ مجھے اس معصوم بچی سے محبت ہو گئی ہے۔ خدا نے مجھے اولاد نہیں دی لیکن یقین کرو کہ عالیہ میں مجھے اپنی بچی نظر آتی ہے۔ کیا ہم اسے اپنی بیٹی بنا کر نہیں رکھ سکتے؟“ ایلیسا نے پر امید نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا۔

”دیکھ لو ایلیسا! مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم اگر عالیہ کو اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتی ہو تو ٹھیک ہے۔ بس ایک بار عالیہ سے بھی پوچھ لینا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ جانے انجانے میں کہیں ہم اس بچی کی زندگی ہی خراب نہ کر دیں۔ اس کا رنگ بہت سانولا ہے اور وہ ہمارے گورے معاشرے میں ایڈ جسٹ نہیں ہو سکے گی۔“ ایڈی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”آپ فکر مت کریں، میں عالیہ سے پوچھ بھی لوں گی اور اسے کسی احساس کمتری کا شکار بھی نہیں ہونے دوں گی۔ چارڈن انگلینڈ کے ٹھنڈے موسم میں گزار لے گی تو خود بخود ہی گوری ہو جائے گی۔“ ایلیسا بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”صحیح کہا یار! واقعی تم بہت بھولی ہو۔ یہاں کئی کئی صدیاں اور نسلیں لگ جاتی ہیں رنگ تبدیل ہونے میں اور تم چارڈن کی بات کر رہی ہو۔ عالیہ 1000 ہزار سال بھی برطانیہ میں رہے گی ناتب بھی گوری نہیں ہو گی۔ اس کی اولاد آگے شاید گوری ہو۔ ہمارے نواسہ نواسی ضرور گورے ہوں گے۔“ ایڈی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ بھی عالیہ کو دل سے بیٹی جان چکا تھا۔

عالیہ نے ان دونوں میاں بیوی کی خدمت ہی اتنی کی تھی کہ دونوں میاں بیوی انگریز ہونے کے باوجود اسے بیٹی بنانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ انھیں بھی وہ سانولی سی لڑکی بہت اچھی لگتی تھی۔ خدا نے عالیہ کو صرف

رنگ ہی بہا پور کے حساب سے کالا دیا تھا باقی ہر لحاظ سے اس میں قدرت کی خوبصورتی کی جھلک نظر آتی تھی۔ جوانی کا حسن اس کے انگ انگ میں نظر آتا تھا۔ وہ قدرت کا ایک شاہکار تھی جو روہی کی ریت میں ریت ہو رہی تھی۔ روہی کے اس حسن کو نواب احمد خان نے دریافت کیا تھا اور اسے بہا پور سے لے کر آیا تھا۔

بہا پور سے وہ لاہور آگئی اور اب برطانیہ جا رہی تھی۔ بہا پور اور لاہور لانے والے دونوں مرد تھے لیکن دونوں میں بہت فرق تھا۔ ایک اسے اپنی جنسی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے لایا تھا جبکہ دوسرا اپنی روحانی خواہشات کے لئے۔ ایک نے بیوی کے روپ میں رکھیل بنایا تھا جبکہ دوسرا بیٹی بنا رہا تھا۔ عام عوام انگریزوں کے آنے سے پہلے بھی غلام تھے اور انگریزوں کے بھی غلام بن گئے تھے۔ انھیں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ البتہ راجوں مہاراجوں اور بڑے بڑے نوابوں کو ضرور فرق پڑا تھا جو انگریزوں کی غلامی میں چلے گئے تھے۔

ایلیسا نے عالیہ سے بات کی اور اسے اپنے ساتھ برطانیہ جانے پر راضی کر لیا۔ نیا گورنر آگیا تو ایڈی اسے چارج دینے لگا۔ ایک مہینے تک نیا گورنر ان کے ساتھ ہی رہا۔ ایڈی نے اسے تمام معاملات سے آگاہ کیا۔ اور مطمئن ہونے کے بعد لاہور چھوڑ دیا۔ اس زمانے میں ابھی تک ہوائی جہاز ایجا نہیں ہوئے تھے۔ ریلوے لائن بھی ہندوستان میں نہیں آئی تھی۔ گاڑیاں بھی ابھی تک ہندوستان نہیں پہنچی تھیں۔ سارا سفر گھوڑوں یا بیلوں پر کیا جاتا تھا۔ جبکہ سمندر میں بحری جہاز استعمال ہوتے تھے۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے کراچی بہت چھوٹا سا شہر تھا۔ انگریزوں نے ہی اس شہر کو وسعت دی تھی۔ یہاں ہندوستان کی پہلے ٹرین سروس شروع ہوئی۔ ریلوے لائن بھی بچھائی گئی جو پشاور تک لے جائی گئی۔

کراچی کی اہمیت کو انگریزوں نے محسوس کیا اور انھوں نے اس شہر کو پورے ہندوستان میں سب سے زیادہ اہمیت دی۔ یہ ساری اہمیت دریائے سندھ کی وجہ سے تھی۔ دریائے سندھ پشاور کے قریب سے گزرتا تھا۔ دریائے کابل اور دریائے سوات کے علاوہ پنجاب کے پانچوں دریا بھی دریائے سندھ میں جا کر گرتے تھے جو آگے سمندر میں جا گرتا تھا۔ افغانستان اور پاکستان کا پورا علاقہ دریائے سندھ سے براہ راست لگتا تھا۔ انگریزوں نے چھوٹے بحری جہاز بنائے اور انھیں دریائے سندھ میں اتار دیا۔ کابل پشاور اور پنجاب کا سامان تجارت انہی بحری جہازوں کے ذریعے کراچی جانے لگا۔ جہاں سے انھیں بڑے بحری جہازوں میں منتقل کیا جاتا اور آگے پورے یورپ کی طرف روانہ ہو جاتا۔

ہندوستان کی پوری تجارت گھوڑوں اور بیلوں کی وجہ سے ایک شہر سے دوسرے شہر تک ہی محدود رہتی تھی۔ جو دو تین سو کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ انگریزوں نے اس تجارت کو ہزاروں کلومیٹر تک پھیلا دیا۔ کلکتہ، ممبئی، مدراس اور کراچی میں بڑی بڑی بندرگاہیں اسی مقصد کے لئے بنائی گئی تھیں۔ انگریزوں نے تھوڑی ترقی کی تو ریلوے لائن بھی بچھا دی گئی۔ انیسویں صدی کے آخر میں ڈیزل انجن ایجاد ہوا تو ڈیزل گاڑیاں بھی بننے لگیں۔ انیسویں صدی تک ہندوستان میں گاڑیاں آچکی تھیں اور تجارت مال گاڑیوں اور ڈیزل گاڑیوں سے ہونے لگی۔ دریا اداس ہو گئے۔ انگریز ہندوستان سے بہت سامان و دولت لوٹ کر لے گئے تھے۔ لیکن انہی انگریزوں نے ہندوستان کو دیا بھی بہت کچھ تھا۔

گورنرایڈی اپنی بیوی ایلیسا اور عالیہ کو لیکر بمبئی چلا گیا۔ اس وقت کراچی میں بندرگاہ نہیں بنی تھی۔ بمبئی کلکتہ اور مدراس میں ہی بندرگاہیں تھیں اور ادھر ہی انگریزوں کے بحری جہاز آکر رکتے تھے۔ وہ لوگ بمبئی آئے اور دودن بمبئی میں ہی رکے رہے اور تیسرے دن ایک بحری جہاز میں سوار ہو گئے۔ یہ مال بردار بحری جہاز تھا جو مسافروں کو بھی لیکر جاتا تھا۔ عالیہ نے ہندوستان کو چھوڑ دیا تھا۔

”ماں! آپ دنیا کے آخری کنارے پر رہتے ہو؟ برطانیہ دنیا کا آخری ملک ہے نا؟“ عالیہ نے دور تاحد نگاہ پھیلے ہوئے سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے زندگی میں پہلی بار سمندر دیکھا تھا بلکہ اس نے تو دریا بھی بہا و پورا کر دیکھا تھا۔ اس کے گاؤں کے کسی بھی فرد نے کبھی دریا بھی نہیں دیکھا تھا۔ سمندر اور دریاؤں کی کہانیاں البتہ اپنے بڑے بوڑھوں سے ضرور سن رکھی تھیں۔ عالیہ نے بھی ایسی ہی ایک کہانی سن رکھی تھی۔ اس نے سمندر کی کہانیاں سن رکھی تھیں جن کا کوئی کنارہ ہی نہیں ہوتا ہے۔ جو بھی سمندر کا دوسرا کنارہ تلاش کرنے جاتا تھا وہ پھر زندہ واپس ہی نہیں آتا تھا۔ عالیہ کو یہی بتایا گیا تھا۔ گورے دنیا کے آخری کنارے پر رہتے ہیں۔ وہ وہاں سے آئے تھے اور ہندوستان پر قابض ہو گئے تھے۔ اس کے گاؤں والے گوروں سے نفرت کرتے تھے لیکن پتہ نہیں کیوں اسے ان لوگوں سے نفرت نہیں تھی۔ اسے ایلیسا اور ایڈی دونوں ماں باپ جیسے ہی لگتے تھے اور وہ انہیں اما با ہی کہتی تھی۔ اب بھی وہ ایلیسا کو ماں ہی کہہ رہی تھی۔

”اماں! آپ دنیا کے بالکل آخری کنارے پر رہتے ہونا؟“ عالیہ نے اپنے الفاظ کو دوبارہ دہراتے ہوئے پوچھا۔ اس کی نظریں ابھی تک سمندر کی لامحدود وسعتوں میں گھوم رہی تھیں۔

چونکہ وہ پنجاب کے سابقہ گورنر کی بیوی اور بیٹی تھے اس لئے انھیں وی آئی پی پروٹوکول دیا جا رہا تھا۔ وہ لوگ جہاز کے عرشے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جہاز نے ممبئی کا ساحل چھوڑ دیا تھا اور اب آہستہ آہستہ براعظم افریقہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بحیرہ احمر میں ابھی تک نہر سویز نہیں بنی تھی اس لئے بحری جہاز مصر کی طرف جانے کی بجائے افریقہ کی طرف جاتے تھے۔ جہاز پورے افریقہ کے گرد چکر لگا کر برطانیہ جاتے تھے۔ بعد میں مصر کی حکومت نے سویز کے مقام سے ایک بہت بڑی نہر کھودی اور بحیرہ احمر کو بحرا قیانوس سے ملا دیا۔

نہر سویز اور نہر پانامہ انسانی ہاتھوں سے نکالی گئیں تھیں۔ وہ تاریخی نہریں ہیں جنہوں نے ہزاروں کلومیٹر کا فاصلہ کم کر کے دو سمندروں کو آپس میں ملایا تھا۔ نہر سویز مصر کی ایک سمندری گزرگاہ ہے جو بحیرہ روم کو بحیرہ قلمز سے ملاتی ہے۔ 163 کلومیٹر طویل اس نہر کو بھی انگریزوں نے ہی تعمیر کیا تھا اور اس کی تعمیر کا مقصد بھی ہندوستان سے یورپ کا فاصلہ کم کرنا تھا۔ 1869ء میں تعمیر ہونے والی اس نہر سے ہندوستان کا فاصلہ چھ ہزار کلومیٹر کم ہو گیا تھا۔

سترہویں اور انیسویں صدی میں ہندوستان کو سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا۔ ہندوستان کو خدا نے زرخیز زمین، سدابہار دریا اور بہترین موسم دیا تھا۔ یہاں زمینیں سونا اگتی تھیں۔ پوری دنیا سے لوگ ہندوستان آنے کے لئے ترستے تھے۔ اس خطے کی آبادی بھی اسی وجہ سے زیادہ ہے۔ امریکہ بھی ہمیں تلاش کرنے کے چکر میں دریافت ہوا تھا اور نہر سویز بھی ہندوستان کا سمندری فاصلہ کم کرنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ سکندر اعظم سے لیکر انگریزوں تک سبھی کو ہندوستان کی معاشی خوشحالی کھینچ کر لاتی تھی۔ جبکہ آج کا ہندوستان (پاکستان، انڈیا، بنگلہ دیش) تیسری دنیا کا غریب ترین ملک بن چکا ہے۔ آج ہم ایک دوسرے کا گریبان پکڑے کھڑے ہیں۔ ہمارے زمینیں آج بھی سونا اگتی ہیں لیکن بھائی چارہ ختم ہو جائے تو سونا بھی غربت ختم نہیں کر سکتا۔

”آپ نے سمندر کا کنارہ دیکھا ہے یا کسی نے بھی اسے نہیں دیکھا؟“ عالیہ اٹھ کر ایلیسا کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔

”عالیہ بیٹی! تم نے گیند دیکھی ہے؟ دنیا بھی بالکل گیند کی طرح گول ہوتی ہے۔ جس طرح گیند کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا ایسے ہی دنیا کا بھی کوئی کنارہ نہیں ہے۔ آپ ایسے ہی مشرق کی طرف چلے جاؤ گے تو گھوم کر

واپس اپنی جگہ پر آ جاؤ گے۔ یہاں سے آگے افریقہ ہے، اس سے آگے برطانیہ آئے گا اور پھر مزید آگے جاؤ گے تو امریکہ آئے گا اور اس کے بعد پھر آپ کا ملک ہندوستان آ جائے گا۔“ ایلیسا نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”اماں! آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہو، دنیا کیسے گول ہو سکتی ہے؟ اگر یہ گول ہوتی تو ہم نیچے نہ گر جاتے؟ یہ بالکل سیدھی ہے اور ایک بہت بڑے بیل کے سینگوں پر ہے۔ بیل نے اسے سینگوں پر اٹھایا ہوا ہے۔“ عالیہ نے اپنی انگریز ماں کی بے وقوفی پر مسکراتے ہوئے کہا۔

اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس کی ماں ایک بہت بڑے حکمران کی بیوی تھی لیکن اسے اتنا بھی پتہ نہیں تھا کہ دنیا ایک بیل کے سینگوں پر ہے۔ ایلیسا اپنی بیٹی کی بات پر مسکرانے لگی۔ اس کے پاس ابھی بہت ٹائم تھا عالیہ کو بتانے کے لئے۔ وہ آہستہ آہستہ عالیہ کو تعلیم دے سکتی تھی۔

عالیہ بہت ذہین تھی۔ اس نے انتہائی مختصر سے وقت میں اس کے ساتھ رہ کر انگریزی زبان سیکھ لی تھی۔ وہ انتہائی روانی سے انگریزی بولنے لگ گئی تھی اور اسے یقین تھا کہ بہت جلد وہ دوسرے علوم میں بھی مہارت حاصل کر لے گی۔ دونوں ماں بیٹی جہاز کے عرشے پر بیٹھی باتیں کرنے لگی۔ ایلیسا اسے برطانیہ کے بارے میں بتانے لگی۔ جہاز کو برطانیہ پہنچنے میں دو مہینے سے اوپر لگ جاتے تھے۔ انھیں پورے دو مہینے سمندر کے اندر ہی رہنا تھا۔ وہ ان دو مہینوں میں ہی عالیہ کو برطانیہ کے بارے میں ایک ایک بات بتانا چاہتی تھی۔ وہ برطانیہ پہنچنے سے پہلے ہی عالیہ کو برطانیہ کے لئے ذہنی طور پر تیار کرنا چاہتی تھی لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ عالیہ کی قسمت میں برطانیہ جانا لکھا ہی نہیں تھا۔ وہ کبھی بھی برطانیہ نہیں پہنچ پائی تھی۔ وہ ہندوستان سے نکلی تو برطانیہ کے لئے ہی تھی لیکن خدا نے اس کی قسمت میں برطانیہ نہیں کچھ اور ہی لکھا تھا۔

”سر! عالیہ جتنی زیادہ خوبصورت تھی وہ اتنی ہی زیادہ بد قسمت تھی۔ وہ پیر کے انگوٹھوں سے لیکر سر کے بالوں تک قدرت کی خوبصورتی کا شاہکار تھی لیکن اس کی قسمت اچھی نہیں تھی۔ خدا نے شاید اس کی قسمت میں دنیا جہان کی آزمائشیں لکھ دی تھیں۔ سر! عالیہ کئی جنتی روح تھی۔ وہ اپنی ہر آزمائش میں پوری اترتی تھی۔“ میری آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔

میری آواز میرے حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھی اور مجھ سے مزید بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ میں کہانی سناتے سناتے خاموش ہو گیا۔ عالیہ کا درد اور بے بسی مجھے یاد آنے لگی تو میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں درد کی

زیادتی سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ امریکی ایمبیسڈر نے جلدی سے ملازم کو اشارہ کیا تو وہ پانی کا گلاس لیکر آ گیا۔ میں نے پانی کے گلاس کو منہ لگایا اور ایک ہی سانس میں پورا گلاس پی گیا۔ میرے دل نے پھر دھڑکن شروع کر دیا اور میں ایک بار پھر زندگی کی طرف لوٹ آیا۔

”باباجی! آپ ٹھیک ہونا؟“ امریکی ایمبیسڈر نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ اسے میری کہانی سے دلچسپی ہو گئی تھی۔

”جی سر! میں بالکل ٹھیک ہوں، فکر مت کریں۔ میں اپنی کہانی پوری کروں گا۔ میں ایک سو بیس سال سے اوپر کا ہو گیا ہوں لیکن پھر بھی مروں گا نہیں۔ میری موت پاکستان میں لکھی ہی نہیں ہے۔ مجھے شاید امریکہ میں ہی موت آئے گی۔ پچھلے کئی سالوں سے موت سے جنگ ہی تو لڑتا آ رہا ہوں۔ اتنا کمزور نہیں ہوں۔“ میں نے انہیں تسلی دی اور دوبارہ کہانی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”گوری چمڑی والے انسان نہیں ہیں بلکہ یہ سارے شیطان ہیں۔ یہ ہماری عورتوں اور بچوں کو اغوا کرتے ہیں اور ہمارے نو جوانوں کو غلام بنا کر لے جاتے ہیں۔ ان کو مارنا ثواب کا کام ہے۔ یہ ہمارے دیہاتوں میں آتے ہیں، ان کو آگ لگاتے ہیں اور ہمارے لوگوں کو چھین کر لے جاتے ہیں۔ ہم کمزور ہیں لیکن بزدل نہیں ہیں۔ ہم ان سے لڑیں گے ہم ان کو ماریں گے۔“ وہ ایک اونچے چبوترے پر کھڑا تقریر کر رہا تھا۔

30 سال کے اس نوجوان افریقی کا نام عاکون تھا۔ جو اس وقت گلا پھاڑ پھاڑ کر انگریزوں کو گالیاں دے رہا تھا۔ یہ افریقی ملک لائبیریا (LIBERIA) میں دریائے سینٹ پال کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو جڑ چکا تھا۔ یورپی ممالک سے آنے والے گوروں نے اس پورے علاقے میں تباہی مچا کر رکھ دی تھی۔ لائبیریا کے دار الحکومت مون رویا (MONROVIA) سے محض 200 دو سو کلومیٹر دور رہنے والے عاکون (AKON) کا گاؤں پچھلے سو سال سے چل رہی جنگ اور انسانی غلامی سے بچا ہوا تھا تو وہ اس لئے کہ وہ دریائے سینٹ پال کے کنارے کی بجائے 30 کلومیٹر اندر گھنے جنگل میں تھے۔ جبکہ ان کے نزدیک ترین دوسرا گاؤں بھی کوئی پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا جو کہ مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا۔

یورپین گوروں نے پورے گاؤں میں سے کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ ان افریقیوں کے پاس لکڑی کے بالوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ جبکہ ان کے مقابلے میں یورپین کے پاس بارود تھا، ان کے پاس

بندوقیں تھیں اور وہ منظم طریقے سے حملہ کرتے تھے۔ وہ سب سے پہلے گاؤں کے گرد گھیرا ڈالتے تھے اور پھر بارود بھرے تیر پھینک کر آگ لگا دیتے تھے۔ گاؤں کے اندر آگ لگتے ہی گاؤں کے باسی جان بچانے کے لئے باہر نکلتے تھے اور پکڑے جاتے تھے۔ یورپین مزاحمت کرنے والوں کو اسی وقت گولی مار دیتے تھے۔ وہ پورے گاؤں کو اکٹھا کرتے اور بچوں اور جوان مردوں اور عورتوں کو غلام بنا کر ساتھ لے جاتے۔ جبکہ بوڑھوں کو گاؤں میں ہی چھوڑ جاتے تھے۔ غلام بنائے جانے والے افریقین باشندوں کو یورپ اور امریکہ کی منڈیوں میں بیچا جاتا تھا۔ یہ بہت بڑا کاروبار تھا اور سترہویں اور اٹھارویں صدی میں اس کا روبرار کو عزت کی نگاہ سے بھی دیکھا جاتا تھا۔

امریکہ کی جنوبی ریاستیں کپاس کی کاشت کرتی تھیں۔ جس کے لئے بہت زیادہ مزدوروں کی ضرورت ہوتی تھی۔ امریکہ میں ان مزدوروں کی کمی سیاہ فام غلاموں سے پوری کی جاتی تھی۔ غلام صرف دو وقت کی روٹی پر کام کرتے تھے۔ سفید فاموں کا ان پر فل اختیار ہوتا تھا۔ وہ اپنے غلاموں پر جانوروں سے بھی زیادہ ظلم کرتے تھے۔ امریکہ میں غلاموں کے کوئی حقوق نہیں تھے۔ ان کو مارنا ایک جانور کو مارنے کے برابر تھا۔ سفید فام آقا اپنے غلاموں سے جو چاہے سلوک کر سکتا تھا۔ امریکی حکومت اس میں کوئی مداخلت نہیں کرتی تھی۔ امریکہ میں ابراہم لنکن نے انسانی غلامی کو ختم کیا تھا۔ انسانی غلامی کو ختم کروانے کے لئے امریکہ میں ایک بہت بڑی جنگ لڑی گئی تھی۔ جسے سول وار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سول وار میں ابراہم لنکن کو فتح حاصل ہوئی تھی۔ وار اس نے پوری دنیا سے انسانی غلامی کو ختم کر دیا تھا۔

ایک انسان کسی دوسرے انسان کا غلام نہیں ہو سکتا چاہے وہ کسی بھی رنگ یا مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ امریکہ بالکل ٹوٹنے کے قریب چلا گیا تھا لیکن خدا نے اس دنیا سے غلامی ختم کرنی تھی۔ اس لئے لنکن اور متحدہ امریکہ کو فتح نصیب ہوئی اور پوری دنیا سے غلامی کا خاتمہ ہو گیا۔ اس وقت 1850ء کا زمانہ چل رہا تھا۔ انسانی غلامی اپنے آخری عشرے میں داخل ہو چکی تھی لیکن پورے زوروں پر چل رہی تھی۔ لائبریا میں سینٹ پال وریا کے ارد گرد کا علاقہ سفید فاموں نے تقریباً خالی کر دیا تھا۔ دریا کے اندر کشتیوں اور چھوٹے جہازوں کی مدد سے آمدورفت ہوتی تھی۔ یورپی سفید فام اسی راستے سے آتے تھے اور سیاہ فام افریقیوں کو پکڑ کر لے جاتے تھے۔

عاکون کا گاؤں دریا سے دور ہونے کی وجہ سے بچا ہوا تھا لیکن ایک ہفتہ پہلے ان کے گاؤں پر بھی

قیامت ٹوٹ پڑی۔ ان کے گاؤں کے کچھ مرد اور عورتیں دریا سے پانی بھرنے کے لئے گئے تھے لیکن ان کی بد قسمتی کہ اسی وقت ایک چھوٹا جہاز وہاں آ گیا۔ سفید فاموں کا وہ جہاز افریقینیا (GUINEA) سے کچھ غلاموں کو لیکر آ رہا تھا۔ عاکون کے گاؤں والوں نے جہاز کو دیکھ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ رانفلوں کی گولیوں نے ان کے کچھ لوگوں کو زخمی کیا تو وہ ان کو اٹھانے میں لگ گئے۔ اتنی دیر میں جہاز والے نیچے اتر آئے اور انھوں نے گھبراہٹ کر انھیں پکڑ لیا۔ وہ پچیس لوگ پانی بھرنے آئے تھے۔ ان میں سے چار لوگوں کو گولیاں لگ گئی تھیں جبکہ پانچ اور لوگ جو جان بچا کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ باقی 16 لوگ پکڑے گئے تھے اور سفید فام ان سب کو لے گئے۔

عاکون کے گاؤں میں اس وقت صفِ ماتم کبھی ہوئی تھی۔ عاکون کی بیوی اور بہن بھی ان کے ساتھ پانی بھرنے گئی تھیں۔ اس کی بہن کو تو سفید فام پکڑ کر لے گئے تھے جبکہ اس کی بیوی کو گولی لگ گئی تھی اور وہ وہیں دم توڑ گئی تھیں۔ اس کی لاش ہی گاؤں واپس آئی تھی۔ پورا گاؤں اس وقت غم سے ڈوبا ہوا تھا۔ وہ لوگ کمزور تھے اور سفید فاموں سے چھپ کر رہ رہے تھے لیکن ان کی بد قسمتی سے وہ ان کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ سفید فام ان کے سولہ لوگوں کو اغوا کر کے لے گئے لیکن وہ ان کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ عاکون جو ان تھا اور اس کا خون جوش مار رہا تھا۔ وہ سفید فاموں سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ وہ ان سے لڑنا چاہتا تھا۔

”خدا نے جنگل میں بڑے بڑے ہاتھی، شیر اور چیتے پیدا کئے ہیں مگر ہم ان سب سے طاقت ور تھے لیکن یہ سفید چمڑی والے جانور ہم سے بھی طاقت ور ہیں اور ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“ گاؤں کے سردار نے عاکون سے کہا۔

”نہیں سردار! ہم ان شیطانوں سے زیادہ طاقت ور ہیں اور ہم ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔“ عاکون نے چیختے ہوئے سردار کی بات کا جواب دیا۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔

”عاکون! تمہاری بیوی کو ان سفید چمڑی والوں نے مار دیا ہے جبکہ تمہاری بہن کو وہ لوگ اٹھا کر لے گئے ہیں۔ تمہارا پورا گھر تباہ ہو گیا ہے۔۔۔ ہمارے بھی گھر تباہ ہوئے ہیں لیکن میرے بچے! ہم مجبور ہیں ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ ہم سے کئی گنا زیادہ طاقت ور ہیں۔ جو بھی ان کے پیچھے جائے گا وہ مارا ہی جائے گا۔ ہم میں سے کوئی بھی ان کے پیچھے نہیں جائے گا۔“ سردار نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

وہ پورے قبیلے میں سب سے طاقت ور تھا لیکن سفید چمڑی والے انگریزوں کے خوف نے اس بہادر کو

بھی بزدل بنادیا تھا۔ اس دور میں یورپ کی سفید چٹری والے واقعی کسی بلا سے کم نہیں تھے۔ اٹھارویں صدی میں پوری دنیا تیر اور تلوار کے علاوہ اور کسی ہتھیار سے واقف ہی نہیں تھی۔ لیکن یہی یورپ والے بندوق بنانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ بارود سب سے پہلے ہمارے ہمسائے چین نے دریافت کیا تھا۔ چینی تیروں کے سروں پر بارود کی تہہ جماتے اور اسے آگ لگا کر دشمن کی طرف پھینکتے تھے۔ یہ منجیق کی مدد سے بھی بارود کے گولے پھینکے جاتے تھے۔

یہ بارود جب انگریزوں کے ہاتھ لگا تو انھوں نے اسے پھینکنے کے لئے توپ ایجاد کر لی تھی۔ تیروں کی جگہ بندوقیں آگئی تھیں۔ تیر کی جگہ گولی نے لے لی جو بارود کی مدد سے فائر کی جاتی تھی۔ بارود لوہے کی بٹ یا توپ کے گولے کو تیر کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقت اور تیزی سے پھینکتی تھی۔ تیر اور نیزے میں نشانہ بہت اہمیت رکھتا تھا۔ جنگجو اسی لئے کامیاب ہوتے تھے کیونکہ ان کا نشانہ بھی تیز تھا اور وہ گھوڑے کی پیٹھ پر سے بھی نشانہ لگانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ بندوق اور توپ نے نشانے کی اہمیت بھی ختم کر دی۔ جہاں 100 تیروں میں سے 10 تیر ہی نشانے پر لگتے تھے وہاں 100 گولیوں میں سے 90 فیصد گولیاں نشانے پر لگ جاتی تھیں۔ تیر تو صرف ایک آدھ انچ تک انسانی جسم میں گھستا تھا جبکہ ایک گولی تو پورے جسم کو چھاڑ کر ہی نکل جاتی تھی۔

بارود بنایا تو چائے نہ تھا لیکن اس کا صحیح فائدہ یورپ والوں نے اٹھایا تھا۔ ایشیا اور افریقہ والے چھوٹی چھوٹی لکڑی کی کشتیاں بناتے تھے لیکن برطانیہ کے دیو ہیکل بحری جہاز ہوتے تھے۔ جو اسلحے اور بارود سے مکمل لیس ہوتے تھے۔ منجیق مسلمانوں کی ایجاد تھی۔ یہ ہزار سال تک بغیر کسی تبدیلی کے ایسے ہی استعمال ہوتی رہی۔ یہی منجیق جب برطانیہ کے ہاتھ لگی تو انھوں نے اسے توپ بنادیا۔ انگریز پورے ایشیا، افریقہ، آسٹریلیا اور امریکہ تک پھیل چکے تھے۔ اٹھارہویں صدی میں برطانیہ کے پادری عیسائیت کی تبلیغ کے لئے جاپان تک جا پہنچے تھے۔ جبکہ دوسری طرف امیزون کے جنگلات بھی عیسائی پادریوں سے بھر گئے تھے۔ برطانیہ نے بارود اور بحری بیڑے کی مدد سے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک حکومت کی تھی۔ امریکہ کو زراعت کے لئے مزدوروں کی بہت ضرورت تھی۔

کپاس کی فصل کو کاشت سے لیکر چنائی تک ڈھیر سارے مزدوروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کپاس کی روٹی سے دھاگہ بنتا ہے جس سے کپڑا، کھیس، رضائیاں، کمبل اور مختلف قسم کی رسیاں تیار ہوتی تھیں۔ جبکہ

کپاس کے بیج سے گھی تیار ہوتا تھا جس کو کھانے میں ڈالا جاتا ہے۔ بناسیتی گھی کپاس کے بیج سے ہی تیار ہوتا ہے۔ کپاس کی فصل اس دور کی سب سے بڑی فصل تھی۔ انسان کی بنیادی ضروریات میں سے ایک کپڑا ہے۔ تن ڈھانپنے کے لئے کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ کپاس کی فصل کپڑے کے لئے روئی بھی پیدا کرتی تھی۔ کھانے کے لئے گھی بھی کپاس سے ہی تیار ہوتا تھا۔ کپاس آج بھی دنیا کی چند بڑی فصلوں میں سے ایک ہے۔ کپاس کی فصل کو بہت زیادہ آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک عام نارمل آدمی ڈیڑھ سے دوسن کے قریب کپاس چنتا ہے۔ جبکہ ایک ایکڑ میں 40 من کے قریب کپاس ہوتی ہے۔

ایک آدمی کو ایک ایکڑ فصل کی چنائی کے لئے 25 دن لگتے تھے۔ یہ تو صرف چنائی ہے جبکہ کپاس کی بجھائی، فالٹو جڑی بوٹیوں کو اکھاڑنا، چنائی کے بعد پودوں کو کاٹنا، کپاس کی فصل اس دور میں انتہائی منافع بخش تھی اور اسی حساب سے اس پر محنت بھی زیادہ ہوتی تھی۔ امریکی کسان سینکڑوں ایکڑ پر کپاس کاشت کرتے تھے اور ان کو سینکڑوں کے حساب سے ہی مزدوروں کی ضرورت تھی لیکن دہاں مزدور نہیں ملتے تھے۔ انسانی غلامی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ انگریزوں نے افریقہ کے کالے لوگوں کو پکڑنا شروع کر دیا اور وہ انھیں امریکہ لے جا کر بیچنے لگے۔ یہ کام سولہویں صدی میں شروع ہوا اور اٹھارہویں صدی تک یہ اپنے پورے عروج تک پہنچ گیا۔ یورپین لوگ افریقہ آتے حملہ کرتے اور یہاں کے جوان مردوں اور عورتوں کو اٹھا کر لے جاتے۔ یہ جوان افریقی مرد اور عورتیں امریکہ کی منڈیوں میں جانوروں کی طرح فروخت ہوتے اور ان سے جانوروں کی طرح ہی کام لیا جاتا تھا۔ ان سے کھیتوں میں کام کروایا جاتا۔ یورپین گورے بحری جہازوں پر آتے تھے۔ افریقہ کے ساحلوں اور جہاں جہاں تک دریا لگتے تھے انگریز وہاں تک گئے اور انھوں نے لاکھوں کی تعداد میں افریقی حبشیوں کو امریکہ اور یورپ کی منڈیوں میں لے جا کر بیچا۔

عاکون کی بیوی اور اس کے قبیلے کے دوسرے افراد کو برطانیہ کی ایک پارٹی نے پکڑا تھا۔ گشتی پارٹی اوپر گینیا کی طرف سے کافی سارے کالوں کو پکڑ کر نیچے سمندر کی طرف آرہی تھی۔ عاکون کے قبیلے کے لوگ اسی وقت دریا سے پانی بھرنے گئے اور پکڑے گئے۔ گشتی پارٹی کا سربراہ فرانک ملن تھا۔ اس کی عمر پچاس سال کے قریب تھی اور وہ سکاٹ لینڈ کا رہنے والا تھا۔ انگریزوں کی دہشت اور خوف کی وجہ سے افریقی ساحلوں سے دور گھنے جنگلوں میں چلے گئے تھے۔ اس لئے انھیں اب ڈھونڈنا کافی مشکل ہو گیا تھا۔ گشتی پارٹیوں کو اب غلاموں کے لئے افریقہ کے کافی اندر تک جانا پڑتا تھا۔

فرائٹ ملن کی پارٹی بھی سمندری ساحل سے کوئی تین سو کلومیٹر اندر تک چلے گئے تھے۔ فرائٹ ملن کوئی دوسو کے قریب کالوں کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے پانچ دیہاتوں پر حملہ کیا تھا اور صرف بوڑھوں اور بہت چھوٹے بچوں کے علاوہ وہ سب کو لیکر آ گیا تھا۔ اس کے چھوٹے جہاز میں 10 سال سے لیکر 40 سال تک کے مرد اور عورتیں قیدی تھیں۔ ملن کے صرف دو سپاہی ہی اس لڑائی میں مارے گئے تھے جبکہ پانچ اور بھی تھے جن کو زخم آئے تھے۔ صرف دو لوگوں کے نقصان پر وہ دوسو غلام اٹھانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ جبکہ عاکون کے قبیلے والے اسے بونس میں ہی مل گئے تھے۔ وہ واپس ساحل سمندری کی طرف جا رہا تھا کہ وہاں سے برطانیہ اور پھر برطانیہ سے آگے امریکہ جاسکتے۔ اس کا جہاز سینٹ پال دریا سے گزر رہا تھا۔ اسے عاکون کے قبیلے والے پانی بھرتے ہوئے نظر آئے تو اس نے حملہ کر کے ان کو بھی پکڑ لیا اور انھیں بھی اپنے ساتھ لیکر ساحل کی طرف چل پڑا۔

عاکون کے قبیلے کا سردار ڈرا ہوا تھا، وہ انگریزوں سے لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بہت سے قبیلوں کو انگریزوں سے مقابلہ کرتے اور مرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ خود بھی ایک مقابلے میں شریک ہوا تھا اور مرتے مرتے بچا تھا۔ وہ پانچ سو لوگ تھے جنھوں نے انگریزوں کی ایک چھوٹی سی فکٹری پر حملہ کیا تھا۔ انگریزوں کے پاس آتش ہتھیار تھے۔ انھوں نے ایک جھٹکے میں ہی کوئی 100 کے قریب لوگ مار دیئے تھے۔ جبکہ باقیوں کو پکڑ لیا تھا۔ 500 لوگوں میں سے صرف 12 لوگ ہی بچے تھے جو پسپا ہوئے اور بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ سردار کو بھی ایک گولی لگی تھی لیکن وہ اس کے بازو کو چھو کر گزرتی تھی اور وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ سردار کو انگریزوں کی طاقت کا پتہ تھا اس لئے وہ ان سے لڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن عاکون نوجوان لڑکا تھا۔ اس کا پورا گھر ہی اجڑ چکا تھا۔ عاکون کی ابھی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اس کے گھر میں اس کے بوڑھے ماں باپ بیوی اور ایک بہن تھی۔ وہ صرف دو ہی بہن بھائی تھے۔ انگریزوں نے اس کی بیوی کو مار دیا تھا جبکہ اس کی اکلوتی بہن کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ اس کا پورا گھر ہی اجڑ چکا تھا۔ وہ اب انگریزوں سے اس کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔

”سردار! آپ یا آپ سب لوگوں میں سے کوئی بھی میرے ساتھ نہ جائے لیکن پھر بھی میں جاؤں گا۔ ان لوگوں نے ہمارے گھر کو اجڑا ہے، ہمارے قبیلے کی عورتوں کو پکڑا ہے۔ یہ ہماری غیرت کا معاملہ ہے۔۔۔ اگر آج ہم خاموش ہو گئے اور اگر آج ہم نے کچھ نہ کیا تو کل کو وہ پھر آئیں گے اور پھر ہمیں ماریں گے، ہماری عورتوں اور مردوں کو غلام بنالیں گے/ آج نہیں تو کل وہ ہم سب کو پکڑ لیں گے یا مار دیں گے۔ اس

لئے چھپ چھپ کر مرنے کی بجائے ان کا مقابلہ کرو، مارو اور مر جاؤ لیکن ڈرو مت! مقابلہ کرو۔ غلامی سے موت بہتر ہے۔“ عاکون چوتھے پر کھڑا دھاڑ رہا تھا۔

اس کی تقریر کا اثر ہو گیا اور بہت سے نوجوان اس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ عاکون کے گاؤں سے آگے جنگل میں مزید اندر کی طرف کچھ اور گاؤں بھی تھے۔ سردار نے جب عاکون اور کچھ دوسرے لڑکوں کو انگریزوں سے لڑنے پر تیار دیکھا تو اس نے بھی ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے معلوم تھا وہ لوگ کبھی بھی انگریزوں سے جیت نہیں سکتے لیکن پھر بھی اب مزید چھپ کر نہیں رہا جاسکتا تھا۔ انگریزوں نے ان کے علاقے کو دیکھ لیا تھا اور وہ دوبارہ ضرور آتے۔ ان کے پاس قبیلے کے قیدی موجود تھے۔ وہ ان کی مدد سے راستہ معلوم کرتے اور پوری طاقت سے حملہ کر کے پورے قبیلے کو ہی تباہ کر سکتے تھے۔ سردار کو معلوم تھا کہ وہ اب اس جنگل میں محفوظ نہیں تھے۔ موت یا غلامی کوئی ایک چیز ان کا مقدر بننے والی تھی۔ اس لئے چھپ چھپ کر دشمن کا انتظار کرنے کی بجائے آگے بڑھ کر مقابلہ کرنا زیادہ بہتر تھا۔

سردار نے باقی قبیلوں میں بھی جانے اور وہاں سے بھی اور لوگ اکٹھے کرنے کا مشورہ دیا۔ جسے عاکون نے مان لیا۔ وہ لوگ باقی قبیلوں میں بھی گئے اور دو دن میں ہی وہ تین ہزار کے قریب قبائلی لڑکے اکٹھے کر چکے تھے۔ سبھی کو گوری چڑی والوں سے نفرت تھی اور سارے قبائلی ہی ان سے بدلہ لینا چاہتے تھے۔ عاکون کی شعلہ بیان تقریروں نے ان کے اندر آگ لگا دی تھی اور وہ سارے گوری چڑی والے وحشیوں سے لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ عاکون نے ان سب کو ساتھ لیا اور دریائے سینٹ پال کے کنارے کنارے چلتے ہوئے انگریزوں کا پیچھا کرنے لگے۔ وہ سارے لائبیریا کے دارالحکومت مون رویا (MONROVIA) کی طرف جا رہے تھے۔

عاکون کے قبیلے کے سردار نے مون رویا دیکھا ہوا تھا۔ جوان کے قبیلے سے صرف تین دن کی مسافت پر تھا۔ مون رویا پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ افریقہ کے اندرونی جنگلات سے قبائلیوں کو پکڑ کر مونو رویا لایا جاتا تھا اور پھر یہاں سے بڑے بڑے جہازوں کے ذریعے برطانیہ لے جایا جاتا تھا۔ برطانیہ سے آگے پھر ان سب کو امریکہ بھیج دیا جاتا تھا۔ عاکون کے قبیلے کے سردار کو پتہ تھا کہ گورے شمال کی طرف سے آتے تھے۔ یہاں سے سارے قبائلیوں کو پکڑ کر شمال کی جانب ہی لے جایا جاتا تھا۔ وہ کبھی شمال کی طرف نہیں گئے تھے لیکن انھوں نے گوری چڑی والوں کو شمال کی طرف ہی جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ شمال کی طرف سے ہی آتے

تھے اور واپس اسی طرف چلے جاتے تھے۔ انگریزوں کے کچھ جہاز جنوب اور مغرب کی طرف سے بھی آتے تھے لیکن وہ سارا سامان اور قیدی لیکر ہمیشہ شمال کی طرف ہی جاتے تھے۔ عاکون اور سردار کا ارادہ پہلے مون رویا جانے کا تھا۔ وہ وہاں ساحل پر کھڑے جہازوں پر حملہ کر کے ان پر قبضہ کرتے اور پھر شمال کی طرف اپنے قیدی چھڑانے چل پڑتے۔

ان کے پاس لکڑی کے بنے ہوئے تیر اور پھالے تھے۔ وہ انگریزوں کی بندوقوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے لیکن پھر بھی ان کا جذبہ بہت بلند تھا۔ وہ لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے تھے۔ عاکون نے اپنی بیوی کے مرنے کا بدلہ لینا تھا اور اپنی چھوٹی بہن کو بھی چھڑوانا تھا۔ وہ انتقام کی آگ میں اندھا ہو چکا تھا۔ اسے مرنے سے بالکل ڈر نہیں لگتا تھا۔ موت کا خوف ان کے تین ہزار سے اوپر کے قافلے میں سے کسی کو بھی نہیں تھا۔ افریقہ کے گھنے جنگلوں میں شیروں کا شکار کرنے والے جنگلیوں کا مقابلہ گوری چٹری والے شیروں سے ہونے لگا تھا۔

متحدہ ہندوستان سے عالیہ ایلیسا اور ایلیسا کا شوہر گورنریڈی کا جہاز نائیجیریا کے مرکزی شہر لاگوس (LAGOS) پہنچ چکا تھا۔ نائیجیریا کے دارالحکومت لاگوس پر بھی انگریز قابض تھے۔ (ابھی نائیجیریا کا دارالحکومت تبدیل ہو کر ابوجا (ABUJA) ہو گیا ہے۔) نائیجیریا کا شہر لاگوس انسانی غلاموں کی سب سے بڑی منڈی تھی۔ اس شہر میں روزانہ سینکڑوں غلام پکڑ کر لائے جاتے تھے۔ یہ افریقہ کی سب سے بڑی بندرگاہ تھی۔ یہاں تقریباً روزانہ ہی جہاز آ کر لگتا تھا اور روزانہ ہی یہاں سے غلام برطانیہ فرانس اور پرتگال جاتے تھے۔ عالیہ کا جہاز بھی اس وقت لاگوس کی بندرگاہ پر لگا ہوا تھا اور جہاز میں افریقی غلاموں کو سوار کرایا جا رہا تھا۔

”اما! ان کو کہاں لے جایا جا رہا ہے؟“ عالیہ نے ایلیسا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ اب ایلیسا کو ماما کہنے لگ گئی تھی۔

”بچے! یہ غلام ہیں اور ان سب کو برطانیہ لے جایا جا رہا ہے۔ وہاں سے انھیں آگے امریکہ فروخت کیا جائے گا۔“ ایلیسا نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ وہ عالیہ کو برطانیہ پہنچنے سے پہلے ہی تیار کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے زمانے کی سبھی اچھی اور بری باتیں بتانا چاہتی تھی تاکہ وہ برطانیہ میں جا کر جلدی اس معاشرے میں ضم ہو سکے۔

”اما! یہ سارے غلام ہیں؟ ان کو تو زنجیروں سے باندھا ہوا ہے۔“ عالیہ نے اگلا سوال کر دیا۔

وہ دونوں جہاز کے اوپری عشرے پر آ کر کھڑی ہو گئیں تھیں۔ جہاز ساحل پر لنگر انداز ہو چکا تھا اور اس کے نچلے تہہ خانوں میں افریقی غلاموں کو سوار کرایا جا رہا تھا۔ سبھی غلاموں کو لوہے کی زنجیروں سے باندھا گیا تھا۔ دس دس غلاموں کا ایک گروپ بنایا گیا تھا اور اس گروپ کو ایک زنجیر سے باندھا گیا تھا۔ زنجیر سب کے ایک پاؤں میں لگی ہوئی تھی۔ یہ کافی لمبی زنجیر تھی جس میں ہر دو فٹ کے فاصلے پر ایک کڑا لگا ہوا تھا۔ اسی کڑے میں قیدیوں کا ایک ایک پیر باندھا گیا تھا۔ سارے قیدیوں کو دس دس کے گروپ میں ہی جہاز میں سوار کرایا جا رہا تھا۔

”اما! ان کو تو باندھا بھی گیا ہے، بالکل جانوروں کی طرح۔۔۔ یہ جانور تو نہیں ہیں!“ عالیہ جہاز کے عرشے پر کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔

اسے ابھی غلامی کا اندازہ نہیں تھا اسی لیے اسے ترس آ رہا تھا۔ ویسے بھی وہ انتہائی نازک دل کی تھی۔ اس نے تو کبھی جانور پر بھی ظلم ہوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ صرف کچھ مہینے جب وہ نواب احمد خان کی بیوی تھی۔ وہ صرف اس دوران ظلم کا شکار ہوئی تھی۔ اسے نواب احمد خان کے جسم سے گھن آتی تھی۔ بوڑھے پیلے جسم سے اسے نفرت تھی۔ حد سے زیادہ نفرت تھی لیکن وہ بے بس تھی۔ مجبور تھی اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ایک سال سے بھی کم عرصہ نواب کے محل میں رہی تھی لیکن اس عرصے نے اس کی معصومیت اور بچپن سب کچھ چھین لیا تھا۔ اس کی قسمت اچھی تھی جو وہاں ایلیسا آ گئی۔ ایلیسا کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اسے عالیہ میں اپنی بیٹی نظر آنے لگی تو وہ اسے نواب کے چنگل سے چھڑا کر لے گئی تھی۔ وہ عالیہ کو لے کر برطانیہ جا رہی تھی۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک لگ رہا تھا لیکن ایسا نہیں تھا۔ عالیہ کی زندگی میں ابھی بہت سی آزمائشیں باقی تھیں۔

”عالیہ بیٹی! یہ سارے غلام ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں صرف گورے رنگ والے ہی حاکم ہیں۔ ہم لوگ اپنے گھروں، فیکٹریوں اور کھیتوں میں کام کرنے کے لئے ملازم بھی رکھتے ہیں اور غلام بھی۔ ملازم تو غریب گورے لوگ ہی ہوتے ہیں۔ وہ پیسے زیادہ لیتے ہیں اور کام بھی تھوڑا کرتے ہیں جبکہ یہ کالے غلام چونکہ غلام ہوتے ہیں اس لئے یہ پیسوں کے بغیر کام کرتے ہیں۔ بس جانوروں کی طرح ایک بار ہی غلام خریدنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ساری زندگی آپ اس سے جو مرضی کام لو۔ ان کے کوئی حقوق نہیں ہوتے۔ ایک گورا مالک اپنے غلام کو اذیتیں دے دے کر مار بھی دے تو توبہ بھی اسے حکومت کچھ نہیں کہہ

سکتی۔ تم جب برطانیہ جاؤ گی تو تمہیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تم سانولے رنگ کی ہو بالکل ان افریقی غلاموں کی طرح۔ تمہیں لوگوں کی طرف سے امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں اسی لئے تمہیں ان سب چیزوں کے لئے پہلے ہی تیار کر رہی ہوں۔ بیٹا! حالات مشکل ضرور ہوں گے لیکن جب تم بہادری سے ان کا مقابلہ کرو گی تو ان سب پر قابو پا لو گی۔ لوگ تمہاری ذہانت دیکھ کر تمہارے رنگ کو نظر انداز کرنے لگیں گے۔ ایک دن ضرور آئے گا جب لوگ تمہیں اہمیت دیں گے۔“ ایلیسا اسے سمجھاتے سمجھاتے جذباتی ہو گئی۔ اس نے عالیہ کو اپنے سینے سے لگالیا۔

جہاز نے نائیجیریا کی بندرگاہ چھوڑی اور لائبیریا کی طرف بڑھنے لگا۔ انھوں نے نائیجیریا سے غلام لے لئے تھے اور اب وہ لائبیریا جا رہے تھے تاکہ وہاں سے بھی غلاموں کو اٹھا سکیں۔ انسانی غلامی یورپ اور امریکی میں باقاعدہ تجارت کی حیثیت رکھتی تھی۔ یورپ سے مختلف مہم جو اور شکاری گشتی پارٹیاں لیکر افریقہ آتے تھے۔ وہ یہاں جنگلوں میں انسانوں کا شکار کرتے تھے۔ جتنے بھی افریقی ان کے ہاتھ لگتے وہ انھیں لیکر لاگوس یا مون رویا کی بندرگاہ پر آ جاتے۔ یہاں فرانس اور برطانیہ کے جہاز روزانہ آتے تھے۔ انسانی غلاموں کو ان جہازوں میں سوار کرایا جاتا اور برطانیہ فرانس پرتگال اور امریکی منڈیوں میں انھیں بیچ دیا جاتا۔ جہاز نے آہستہ آہستہ لاگوس کی بندرگاہ چھوڑی اور لائبیریا کی طرف بڑھنے لگا۔ جہاز کی اگلی منزل لائبیریا کا دار الحکومت مون رویا تھا۔ ریٹائرڈ کرنل فرانک ملن غلاموں کو لیکر بحری جہاز کا انتظار کر رہا تھا۔

فرانک ملن کے غلاموں میں عاکون کی بہن بھی شامل تھی۔ جہاز مون رویا کی بندرگاہ کی طرف جا رہا تھا جبکہ دوسری طرف عاکون بھی اپنے ساتھ ہزاروں قبائلیوں کو لیکر مون رویا آ رہا تھا۔ مون رویا کی بندرگاہ پر لے جانے والے اور بچانے والے سب اکٹھے ہو رہے تھے۔ مون رویا میں ایک بہت بڑی جنگ ہونے والی تھی۔ عالیہ اور اس کی منہ بولی ماں ایلیسا اور ایڈی تینوں ان سب چیزوں سے بے خبر کمرے میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ نائیجیریا سے مون رویا بحری جہاز کا صرف ایک دن کا سفر تھا۔ وہ صبح دس بجے کے قریب لاگوس سے چلے تھے۔ سارا دن اور ساری رات کا مسلسل سفر کرنے کے بعد وہ دوسرے دن دوپہر کے دو بجے کے قریب لائبیریا پہنچ گئے۔ مون رویا کی بندرگاہ دریائے سینٹ پال کے کنارے پر نہیں تھی۔ سینٹ پال بہت بڑا دریا تھا۔ یہ جب سمندر میں گرتا تھا تو بہت بڑی بڑی لہریں پیدا کرتا تھا۔ دریا کا پانی انتہائی تیزی سے سمندر میں گرتا تھا۔ اس کی وجہ سے سمندر کا کنارہ ٹوٹا پھوٹا ہوا تھا جبکہ وہاں دلدلیں بھی کافی

تھیں۔ وہ پورا علاقہ ہی دلدلی تھا۔

انگریزوں نے ساحل سے کچھ کلومیٹر پیچھے دریا سے ایک نہر نکالی اور اسے اوپر کی طرف لے جاتے ہوئے کافی آگے جا کر دوبارہ سمندر میں ڈال دیا۔ نہر اوپر کی طرف ہونے کی وجہ سے پانی کا تیز بہاؤ تو سیدھا سمندر کی طرف ہی ہوتا تھا جبکہ نہر میں پانی نارمل ہی رہتا تھا۔ اوپر سے آنے والے سارے بحری جہاز اسی نہر میں چلے جاتے تھے اور آگے نہر کے کنارے پر بندرگاہ بنائی گئی تھی۔ جہاں باقی سمندر سے آنے والے جہاز لگتے تھے۔ یہ مرکزی دریا سینٹ پال سے کوئی دس کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ یہ انتہائی پرسکون پہاڑی علاقہ تھا جبکہ بہت تھوڑا سا میدانی علاقہ تھا۔ جہاں بڑے بڑے سٹور روم بنائے گئے تھے۔ انہی سٹوروں میں غلاموں کو رکھا جاتا تھا۔ بحری جہاز مومن رویا پہنچ گیا اور اب آہستہ آہستہ بندرگاہ کی طرف بڑھنے لگا۔ کرنل فرانک ملن بھی بندرگاہ پر کھڑا جہاز کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے پاس دو سو سے اوپر غلام تھے۔ اس نے افریقہ کے پندرہ سولہ چکر لگائے تھے۔ وہ پچھلے دس سال سے افریقہ کے چکر لگا رہا تھا لیکن کبھی بھی 100 سے اوپر قبائلیوں کو نہیں پکڑ سکا تھا۔

اس بار پہلی دفعہ وہ 200 سے اوپر کالوں کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کا یہ دورہ بہت کامیاب ثابت ہوا تھا۔ اسے واپس آتے ہوئے بھی عاکون کے قبیلے کی عورتیں اور بچے ہاتھ لگ گئے تھے۔ وہ بہت امیر ہونے والا تھا۔ اڑھائی سو کے قریب غلام۔۔۔ وہ واقعی بہت زیادہ امیر ہونے والا تھا۔ اسے دور سمندر میں بحری جہاز کے بادبان نظر آ گئے۔ جہاز آہستہ آہستہ بندرگاہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کرنل فرانک کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اس نے ایک نظر پیچھے مڑ کر گودام کی طرف دیکھا۔ جہاں اس کے غلام زنجیروں سے بندھے ہوئے پڑے تھے۔ سارے افریقی غلام اس کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے لئے کرنل فرانک کسی موت کے فرشتے کی طرح تھا۔ کرنل فرانک نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ بحری جہاز کی طرف دیکھنے لگا۔

عاکون اور اس کے قبیلے کا سردار دونوں اپنے ساتھ تین ہزار کے قریب قبائلیوں کا لشکر لے کر دریائے سینٹ پال ڈیلٹا سے چار کلومیٹر پیچھے بنائی گئی نہر پر پہنچ گیا۔ عاکون کے ساتھ آئے ہوئے سردار کو پتہ تھا کہ انگریزوں کے جہاز سیدھے دریا کے ڈیلٹا کی طرف جانے کی بجائے نہر کی طرف چلے جاتے ہیں۔ اس نے نہر کے کنارے پر بنی ہوئی بندرگاہ بھی دیکھی ہوئی تھی۔ اس نے سارے لشکر کو اپنے ساتھ لیا اور نہر کے

کنارے کنارے چلتے لگا۔ ایک کلومیٹر آگے جا کر ان کو ایک نسبتاً کم چوڑی جگہ ملی تو ان سب نے نہر بھی کر اس کر لی اب وہ سب تیزی سے نہر کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بندرگاہ کی طرف جا رہے تھے۔ نہر کے آخری کنارے پر ایک اونچی پہاڑی تھی۔ وہ جیسے ہی پہاڑی کی چوٹی پر پہنچے انہیں دوسری طرف بندرگاہ نظر آ گئی۔ بندرگاہ پر اس وقت کافی چہل پہل ہو رہی تھی۔ سردار کو دوسرے سمت میں ایک بہت بڑا جہاز نظر آ گیا جو آہستہ آہستہ بندرگاہ کی طرف آ رہا تھا۔ بندرگاہ پر اس وقت 100 کے آس پاس انگریز فوجی بھی نظر آ رہے تھے جبکہ بہت سے افریقی کالے بھی تھے۔ جو بندرگاہ پر آئے ہوئے سامان کو باہر نکال کر بندرگاہ پر ترتیب سے لگا رہے تھے تاکہ جیسے ہی جہاز بندرگاہ پر آ کر لگتا وہ سامان جہاز میں لوڈ کر سکیں۔

جہاز کو بندرگاہ تک پہنچنے میں آدھا گھنٹہ لگتا تھا۔ بندرگاہ پر کافی چہل پہل ہو رہی تھی۔ سب لوگ جہاز کے آنے سے پہلے پہلے پوری تیاری کر لینا چاہتے تھے تاکہ جیسے ہی جہاز بندرگاہ پر آ کر رکے تو وہ جلدی سے سامان لوڈ کر سکیں۔ عاکون نے انگریز فوجیوں کو دیکھا تو اس کا غصے سے خون کھولنے لگا۔ وہ پہاڑی سے نیچے اترنے لگا لیکن سردار نے اسے منع کر دیا۔

”عاکون! اگر ابھی ہم نیچے اترے تو شاید وقتی طور پر ان گورے فوجیوں کو مار کر ان پر برتری حاصل کر لیں، یہ ناممکن ہے۔ بندرگاہ کی طرف آنے والا جہاز بہت بڑا ہے۔ اس کے اندر بھی لازمی فوجی ہوں گے اور بارود بھی بہت زیادہ ہے۔ انہوں نے ایک سیکنڈ میں ہی ہم سب کے چھیتڑے اڑا کر رکھ دیئے ہیں۔“ سردار نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”نہیں سردار! آپ ایسے ہی ڈر رہے ہیں۔۔۔ یہ زیادہ سے زیادہ بھی دو سو ہیں جبکہ اتنے ہی جہاز پر بھی ہوں گے۔ ان کے مقابلے میں ہماری تعداد ان سے کہیں زیادہ ہے۔ ہم آسانی سے ان سب پر قابو پا لیں گے۔“ عاکون نے جوش سے کہا۔

”عاکون! تم ابھی بچے ہو اور تمہیں ان انگریزوں کی طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔ یہ ایک بھی ایک ہزار کے برابر ہے۔“ سردار نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”سردار! آپ بہت ڈر پوک ہو، ان انگریزوں کا خوف تمہارے حواسوں پر چھایا ہوا ہے۔ حالانکہ یہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ ہم اچانک ان پر حملہ کریں گے تو ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہیں بچے گا۔“ عاکون نے اونچی آواز میں چیختے ہوئے کہا۔

پہاڑی کافی اونچی تھی۔ نیچے وادی میں ان کی آواز نہیں جاسکتی تھی۔ ویسے بھی وہ سارے بندرگاہ کی طرف آنے والے جہاز کی طرف متوجہ تھے۔ انہیں افریقیوں سے کوئی ڈر نہیں لگتا تھا۔ ان کی دہشت نے افریقیوں کو ڈرا ہی اتنا دیا تھا کہ کوئی بھی ان پر حملہ کرنے کا سوچتا بھی نہیں تھا۔ فوجیوں کو افریقیوں سے ڈر ہی نہیں لگتا تھا اس لئے وہ مطمئن ہو کر ساحل پر پھر رہے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ کوئی بھی افریقی قبیلہ اتنی ہمت نہیں کرے گا۔ یہ تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اوپر پہاڑی پر کئی قبیلے اکٹھے ہو گئے ہیں اور وہ سب نفرت سے بھرے ہوئے تھے۔ عاکون اپنے قبیلے اور ساتھ والے نزدیکی قبیلوں سے تین ہزار قبائلی لیکر چلا تھا لیکن یہاں تک پہنچتے پہنچتے اور بھی ہزاروں قبائلی ان کے ساتھ مل گئے تھے۔ اس وقت ان کی تعداد کسی بھی طرح سات آٹھ ہزار سے کم نہ تھی۔ وہ سارے نیچے جا کر گوری چڑی والے انگریزوں سے لڑنا چاہتے تھے۔ وہ ایک ایک گورے کو مار کر اپنا انتقام لینا چاہتے تھے لیکن سردار نے انھیں روکے ہوا تھا۔

”عاکون! سمندر میں موجود بڑے بحری جہاز کو ساحل پر آنے دو، اس کے بعد حملہ کریں گے۔ اگر اب حملہ کیا تو وہ جہاز ساحل پر آنے کی بجائے سمندر سے ہی ہم پر بارود کی آگ برسانا شروع کر دے گا۔ ان کے پاس بڑے بڑے ہتھیار ہیں۔ ہم سمندر کے اندر ان سے نہیں لڑ سکیں گے۔ اسے ساحل پر آنے دو پھر حملہ کریں گے اور اپنے لوگوں کو چھڑا کر لے جائیں گے۔“ سردار نے اونچی آواز سے کہا تو وہ سارے سردار کی بات مان گئے۔

پہاڑی پر بڑے بڑے پتھر موجود تھے۔ سردار نے سب لوگوں کو پتھر اکٹھے کرنے کا حکم دیا تو وہ سارے پہاڑی پر موجود بڑے بڑے پتھر اکٹھے کرنے لگے۔ یہ بہت بڑے بڑے پتھر تھے۔ دیوہیکل پتھر جنہیں دس دس لوگ ملکر بھی بمشکل حرکت دے رہے تھے۔ آدھے گھنٹے تک جیسے ہی جہاز ساحل پر آ کر لگا۔ اسی وقت سردار نے سارے پتھروں کو نیچے بندرگاہ کی طرف لڑھکانے کا حکم دے دیا۔ ہزاروں کی تعداد میں بڑے بڑے پتھر پہاڑی کی ڈھلان سے نیچے لڑھکتے ہوئے تیزی سے بندرگاہ کی طرف بڑھنے لگے۔ سردار اور اس کے ساتھ آئے ہوئے قبائلی بھی پتھروں کے پیچھے پیچھے پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔

”بابا! اوپر پہاڑی پر کوئی زلزلہ آیا ہوا ہے؟ کتنی گرد اڑ رہی ہے۔“ عالیہ نے انگلی سے پہاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ انگریز گورنر کو بابا کہنے لگی تھی۔ جہاز ابھی ابھی عرشے پر آ کر لگا تھا اور اس میں سامان رکھا جا رہا تھا۔

ایڈی اپنی بیوی اور عالیہ کے ساتھ اوپر کھڑا مزدوروں کو جہاز میں سامان لوڈ کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ عالیہ نے اوپر پہاڑی کی طرف اس کی توجہ دلائی تو اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ پہاڑی کے اوپر سے لڑھکتے ہوئے بڑے بڑے پتھروں نے اس کی آنکھیں خوف سے بھر دیں۔ وہ گورنر کے بڑے عہدے پر فائز تھا۔ اس نے افریقہ اور ایشیا کے کئی ممالک میں فرائض سرانجام دیے تھے۔ وہ کئی عرصے سے برطانوی کالونیوں میں رہ رہا تھا۔ اسے قبائلوں سے کئی بار لڑنے کا موقع مل چکا تھا۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ہی اسے پتہ چل گیا کہ بہت بڑا حملہ ہونے والا ہے۔

”عالیہ! ایلیسا! جلدی کرو، بھاگو! ہمیں جلد سے جلد اس جہاز سے باہر نکل کر گوداموں کی طرف جانا ہے۔“ اس نے چیختے ہوئے کہا۔ اس نے عالیہ کا بازو پکڑا اور جہاز کی چلی منزل کی طرف بھاگنے لگا۔ ایلیسا بھی ان کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہوئی آرہی تھی۔

”ایلیسا! جلدی کرو، ہمیں جلد سے جلد جہاز سے باہر نکل کر پناہ لینی ہے۔ جلدی کرو! حملہ ہو گیا ہے۔ یہ جہاز ڈوبنے والا ہے۔ جہاز سے باہر نکل کر گوداموں کی طرف بھاگو!“ اس نے اپنے پیچھے آنے والی ایلیسا کا بھی بازو پکڑا اور اسے جھٹکا دیتے ہوئے آگے بڑھانے لگا۔

پہاڑی سے پتھر انتہائی تیزی سے نیچے آرہے تھے۔ یہ بہت بڑے بڑے پتھر تھے جو سیدھے نیچے بندرگاہ کی طرف آرہے تھے۔ جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز ہو چکا تھا۔ اسے رسوں کی مدد سے مضبوطی سے باندھا ہوا تھا۔ پتھر انتہائی تیزی سے نیچے آرہے تھے۔ ان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ وہ دوبارہ جہاز کو سمندر میں لے جاسکتے۔ جہاز کو رسوں کی مدد سے باندھا ہوا تھا جبکہ جہاز کے انجن بھی بند کر دئے گئے تھے۔ اس وقت جہاز کو کونکوں کی مدد سے چلایا جاتا تھا۔ پیڑول یا ڈیزل تو ابھی تک دریافت ہی نہیں ہوا تھا۔ بھاپ کا انجن ایجاد ہو چکا تھا۔ برطانیہ کے سبھی بحری جہاز کونکوں کی مدد سے ہی چلتے تھے۔ بحری جہاز کے تہ خانے میں ایک بھٹی لگی ہوئی تھی۔ یہاں کونکے کو جلا یا جاتا تھا اور اس کی مدد سے بھاپ پیدا کی جاتی تھی جس سے جہاز چلتا تھا۔ درجنوں کے حساب سے نیچے مزدور ہوتے تھے جو بھٹی میں کونکے ڈالتے تھے۔ جہاز کا انجن ایک بار بند ہو جاتا تو اسے دوبارہ حرکت میں لانے کے لئے آدھا گھنٹہ لگ جاتا تھا۔ یہ کوئی ڈیزل سے چلنے والا انجن نہ تھا کہ ادھر سے سوئچ آن کیا اور انجن سٹارٹ ہو گیا۔

گورنر ایڈی کو ان سب باتوں کا علم تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جہاز بند ہو چکا ہے اور اسے اب حرکت میں

لانا ناممکن ہے۔ پہاڑی کے اوپر سے لڑھکتے ہوئے پتھر پانچ منٹ میں ہی نیچے بندرگاہ تک پہنچ جاتے۔ ان کے سنبھلنے سے پہلے پہلے ہی پتھر جہاز کے اندر گھس جاتے۔ دو ہزار فٹ سے زائد کی بلندی سے لڑھک کر نیچے آنے والے پتھر کسی توپ کے گولے کی طرح ہوتے ہیں اور جہاز کی دیواریں کبھی بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ اتنی بلندی سے گرنے والے بھاری پتھر جہاز کی دیواریں توڑتے ہوئے گھس جاتے اور اسے تباہ کر دیتے۔ جہاز کا تباہ ہو کر سمندر میں غرق ہونا پکا تھا۔ ایڈی اسی لئے باہر بھاگ رہا تھا۔ گودام پتھروں سے بنے ہوئے تھے اور کافی مضبوط تھے۔ وہ اگر گودام کی دیواروں کی آڑ لے لیتے تو اوپر سے گرنے والے پتھروں سے بچ سکتے تھے۔ وہ اسی لئے اپنی بیوی اور عالیہ کو لیکر جہاز سے باہر نکلنے کے لئے سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ وہ جہاز کی اوپری منزل پر تھے۔ انھیں جہاز سے باہر نکلتے نکلتے پانچ منٹ لگ گئے لیکن وہ بحر حال جہاز سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

پہاڑی کے اوپر سے لڑھکتے ہوئے پتھر نیچے آچکے تھے اور انتہائی تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ گردوغبار کا ایک طوفان اوپر اٹھ رہا تھا۔ وہ لوگ جیسے ہی جہاز سے باہر نکل کر زمین پر اترے پتھر لڑھکتے ہوئے ان کے پاس آگئے، یہ نسبتاً چھوٹے اور گول پتھر تھے جو پہلے نیچے پہنچ گئے تھے۔ بڑے اور بھاری پتھر ان کے پیچھے آ رہے تھے۔ پوری بندرگاہ لوگوں کی چیخوں کی آواز سے گونج رہی تھی۔ بندرگاہ پر موجود فوجی اور مزدور سب چیخ رہے تھے۔ سب بھاگ رہے تھے، جس کا جدر منہ ہو رہا تھا وہ ادھر ہی بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ چھوٹے پتھر بھی گولیوں کی طرح لگ رہے تھے۔ درجنوں لوگ ان پتھروں سے زخمی ہو کر گر گئے تھے۔ ایڈی ان دونوں کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے اور وہ تیزی سے ایک سٹور روم کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ سٹور بندرگاہ پر لگے جہاز سے تھوڑے ہی فاصلے پر موجود تھا۔ اوپر سے پتھروں کی بارش تیز ہو گئی تھی لیکن وہ تینوں اتنے پتھروں سے بچتے ہوئے بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ اچانک ایک پتھر اڑتا ہوا آیا اور ایڈی کی بیوی ایلیسا کے کندھے پر لگا۔ ایلیسا کا ہاتھ ایڈی سے ایک جھٹکے کے ساتھ نکلا اور وہ زمین پر اونڈھے منہ گر گئی۔ اس کے ماتھے پر بھی چوٹ لگ گئی جس سے خون نکلنے لگا۔ ایلیسا کا ہاتھ چھوٹے ہی ایڈی اور عالیہ دوڑتے دوڑتے کافی آگے نکل گئے۔

”ایلیسا۔۔۔“ ایڈی نے پیچھے مڑ کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو زمین پر گری پڑی تھی اور بہت سے پتھر اسے روندتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔

”عالیہ! تم جلدی سے بھاگ کر سٹور روم کی دیوار کی آڑ لو میں تمہاری ماما کو لیکر آتا ہوں۔“ ایڈی نے عالیہ کو آگے کر طرف دھکا دیا اور بھاگتے ہوئے واپس اپنی بیوی کی طرف آ گیا۔ عالیہ نے بھی آگے کی طرف جانے کی بجائے پیچھے جانا مناسب سمجھا اور وہ بھی ایڈی کے ساتھ ہی ایلیسا کے پاس آ گئی۔

”عالیہ! بھاگو یہاں سے اور اپنی جان بچاؤ۔۔۔ یہ پتھر تمہیں روندتے ہوئے چلے جائیں گے۔ میری فکر مت کرو بچی!“

”تم دونو مجھے چھوڑ دو۔“ ایلیسا نے عالیہ کو بھی واپس آتے دیکھا تو وہ دونوں کو ہی واپس جانے کا بولنے لگی لیکن دونوں ہی اسے اکیلا چھوڑ کر جانے کے لئے تیار نہیں تھے۔ دونوں ہی اسے محبت کرتے تھے اور محبت کو اتنی جلدی کھو یا کہاں جاتا ہے۔ عالیہ کو اپنی اصل ماں سے بھی زیادہ اس سے محبت تھی۔ وہ اسے اس حالت میں کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ ایڈی کی تو وہ بچپن کی محبت تھی۔ وہ دونوں ایک ہی محلے میں پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ دونوں نے ایک ہی سکول میں پہلی بار اے بی سی پڑھی تھی۔ پہلی بار اے بی سی لکھنے کی اکٹھی کوشش کی تھی۔ ایڈی اسے کیسے چھوڑ کر جاسکتا تھا۔ تینوں ہی محبت کرتے تھے تینوں ہی اکٹھے مرنا تو منظور کر لیتے لیکن اکیلے اکیلے رہ کر جی نہیں سکتے تھے۔

”ماما! میں آپ کو ساتھ لیکر جاؤں گی۔۔۔ آپ کی طرف آنے والے ہر پتھر کو پہلے مجھ سے ٹکرانا ہو گا اس کے بعد ہی وہ آپ کی طرف آئے گا۔“ عالیہ نے پر جوش لہجے میں کہا۔

عالیہ اور ایڈی دونوں نے ایلیسا کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور انہیں تیز تیز چلاتے ہوئے سٹور روم کی دیوار کی طرف بڑھنے لگے۔ عالیہ پہاڑی کی طرف آنے والے پتھروں کی طرف تھی۔ درجنوں کی تعداد میں اوپر سے لڑھکتے ہوئے پتھر عالیہ سے ٹکرا رہے تھے لیکن وہ پتھر عالیہ کو متزلزل نہیں کر رہے تھے۔ وہ چھوٹی سی لڑکی ایک بہت بڑا پہاڑ بن گئی تھی جو ہر پتھر کو اپنی جسم پر روک رہی تھی۔ ایک بھی پتھر ایلیسا اور ایڈی سے نہیں ٹکرا رہا تھا۔ عالیہ ان کے درمیان آ گئی تھی۔ ایڈی نے عالیہ کی طرف جانا چاہا تھا لیکن عالیہ اپنی جگہ پر ڈٹی رہی۔ سٹور روم زیادہ دور نہیں تھا وہ جلد ہی سٹور روم تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان تینوں نے دیوار کی اوور لی اور پتھروں کو لڑھکتے ہوئے دیکھنے لگے۔ چھوٹے پتھروں کے بعد اب بڑے بڑے دیو ہیکل پتھر نیچے آنا شروع ہو گئے تھے۔ سینکڑوں کی تعداد میں پتھر لڑھکتے ہوئے نیچے آ رہے تھے اور اپنی سامنے آنے والی ہر چیز کو بہا کر سمندر برد ہو رہے تھے۔ بحری جہاز کی سامنے والی دیوار ٹوٹ چکی تھی۔ پتھر سیدھے

جہاز کے اندر جا رہے تھے۔ جہاز کے سامنے والی دیوار کے ٹوٹنے کے بعد سائیڈوں والی دیواروں میں بھی سوراخ ہونے شروع ہو گئے۔ جہاز کے اندر دیواروں کے ٹوٹنے کی وجہ سے پانی جانے لگا۔ جہاز اب آہستہ آہستہ سمندر برد ہونا شروع ہو گیا تھا۔

”عالیہ! میری بچی! ان پتھروں کے پیچھے پیچھے ہی افریقی قبائلی بھی حملہ کریں گے۔ پتھروں کی تعداد سے اندازہ لگا سکتا ہوں کہ ان کی تعداد ہزاروں میں ہوگی۔ وہ ہماری گوری چھڑی سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ یہاں ہمیں مارنے اور اپنے علاقوں کو چھڑانے کے لئے آئے ہیں۔ تم ادھر ہی خاموشی سے بیٹھی رہنا! تمہارے سانولے رنگ کی وجہ سے وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ قبائلی تمہیں بھی افریقی ہی سمجھیں گے۔ ہم دونوں کو یہاں سے نکلنا ہوگا تا کہ کسی محفوظ جگہ کی تلاش کر سکیں۔“ ایڈی نے عالیہ سے کہا۔ اسکی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ پتھروں کی بارش سے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ افریقی ہزاروں کی تعداد میں حملہ آور ہوئے ہیں۔ جبکہ ان کے سارے ہی فوجی یا تو مر گئے تھے یا پھر زخمی تھے۔ جو تھوڑے بہت بچے تھے ان کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملنے والا تھا۔ افریقیوں نے ایک ایک کو چین چین کر مارنا تھا۔

”بابا! میں بھی آپ کے ساتھ ہی جاؤں گی، میں آپ کو کبھی بھی اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔“ عالیہ نے روتے ہوئے کہا۔

”نہیں بیٹا! تم ہمارے ساتھ مت جاؤ، ہماری وجہ سے تم بھی ماری جاؤ گی۔۔۔ تم یہاں پر محفوظ رہو گی۔“ ایڈی نے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔

”پاپا! ہم تینوں ہی یہاں محفوظ ہیں۔ میں کسی کو بھی آپ کے پاس نہیں آنے دوں گی۔“ عالیہ نے بے بسی سے کہا۔ اس نے ایڈی کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ عالیہ کی آنکھوں سے بے بسی چھلک رہی تھی۔ وہ دونوں کو ہی وہاں سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔

”عالیہ بیٹا! حالات کو سمجھو، ہم زیادہ دیر تک یہاں محفوظ نہیں ہیں۔ اگلے کچھ ہی پل میں افریقی یہاں پہنچ جائیں گے۔ ان کے پاس تیرکمان اور پھالے ہوں گے۔ وہ یہاں ہمارے سر پر پہنچے تو ہمارے پاس ان سے چھپنے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ ایک لمحہ بھی دیر کئے بغیر ہم سب کو مار دیں گے۔ مجھے کوئی محفوظ ٹھکانا تلاش کرنا ہوگا تا کہ ان سے محفوظ رہ سکوں۔ ہم دونوں کو ہی یہاں سے جلد از جلد نکلنا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ قبائلی یہاں پہنچ جائیں۔“ ایڈی نے جلدی سے کہا اور ایلینا کا ہاتھ تھام لیا۔

عالیہ بھی ان کے ساتھ ہی چل پڑی۔ ایڈی اور ایلینا نے ایک نظر عالیہ کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گئے۔ باہر میدان میں افریقائیوں کے پر جوش نعروں کی آواز آرہی تھی۔ ایڈی نے دیوار کی اوٹ سے سر باہر نکال کر دیکھا تو اسے ہر طرف کالے افریقی ہی نظر آئے۔ اس کے اپنے فوجی اور دیگر یورپی سب مارے جا چکے تھے۔ افریقی جن جن کو نہیں مار رہے تھے۔ گرد کا طوفان تھم چکا تھا۔ اسے درجنوں سفید فام زمین پر خون سے رنگے پڑے نظر آئے جو مر چکے تھے۔ سمندر میں موجود بحری جہاز بھی مکمل تباہ ہو چکا تھا۔ بحری جہاز آدھے سے زیادہ سمندر میں ڈوب چکا تھا اور آہستہ آہستہ باقی ماندہ جہاز بھی ڈوب رہا تھا۔ ایڈی نے اپنا سر واپس کھینچ لیا۔ اس نے ایک نظر پیچھے دیوار کی طرف دیکھا۔ یہاں صرف سامنے والا ہی کھلا تھا جبکہ پیچھے کی طرف ایک بہت اونچی دیوار تھی۔ یہ بیرونی حملہ آواروں سے بچانے کے لئے بنائی گئی تھی۔ جبکہ سٹور روم کی دیوار بھی کافی اونچی تھی۔ ایک سائیڈ پر سمندر تھا۔ وہ بالکل چوہوں کی طرح پھنس چکے تھے۔ نکلنے کے لئے صرف سامنے کا راستہ ہی بچا تھا اور سامنے ہزاروں کی تعداد میں سیاہ فام افریقی پھر رہے تھے۔ وہ پوری بندرگاہ پر پھیلے ہوئے تھے۔ سیاہ فام ایک ایک گورے کو تلاش کر کے مار رہے تھے۔ بحری جہاز ڈوب چکا تھا اور اس میں موجود سارے سیاہ فام جو تہہ خانے میں زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے وہ بھی سارے جہاز کے ساتھ ہی ڈوب چکے تھے۔ جبکہ لائبریریا اور گینیا سے لائے گئے غلام بچ گئے تھے۔ وہ سٹور روم کے اندر بندھے ہوئے تھے اس لئے پتھروں سے بچ گئے تھے۔ سفید فاموں نے سٹور روم میں گھس کر پناہ لینی چاہی تھی لیکن حملہ کرنے والے بھی اندر آ گئے تھے انھوں نے ایک بھی سفید فام نہیں چھوڑا تھا۔

”عالیہ! ایلینا! باہر کی طرف سیاہ فام پھیلے ہوئے ہیں۔ انہوں نے تمام سفید فاموں کو ہلاک کر دیا ہے اور اس جگہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ اگلے کچھ ہی لمحوں میں وہ یہاں پر بھی پہنچنے والے ہیں۔ ہمارے پاس اب بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہماری موت اب یقینی ہو چکی ہے۔ سمندر کی طرف جانے کا ایک راستہ ہے۔ ہم سمندر میں چھلانگ لگا دیتے ہیں اور تیرتے ہوئے پچھلی طرف جانے کی کوشش کرتے ہیں، شاید بچ جائیں۔“ ایڈی نے اپنی بیٹی اور بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ تیز تیز بول رہا تھا۔ سیاہ فام کسی بھی پل ادھر آ سکتے تھے۔

”ٹھیک ہے، پھر چلو! جتنی دیر ہوگئی اتنے ہی ہمارے بچنے کے چانس کم ہوں گے۔ سیاہ فام کسی بھی پل یہاں پہنچنے والے ہیں۔“ ایلینا نے سمندر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”عالیہ! یہاں بندرگاہ کی وجہ سے سمندر بہت گہرا ہے اور نیچے بھی بہت ہے۔ ہمیں کم از کم 50 فٹ نیچے چھلانگ لگانی پڑے گی جبکہ یہاں سے سمندر نیچے دو سو فٹ (200) سے بھی زیادہ گہرا ہوگا۔ ہم دونوں تیر لیتے ہیں لیکن تم ڈوب جاؤ گی۔“ انہوں نے عالیہ کو اپنی ساتھ لے جانے سے منع کر دیا۔

عالیہ بہاولپور کے جس علاقے میں تھی وہاں سمندر اور دریا تو ایک طرف نہر تک موجود نہیں تھی۔ پانی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ایک چھوٹا سا نالہ جو بمشکل دو فٹ بھی گہرا نہیں تھا۔ اس نالے کا پانی صرف گھٹنوں گھٹنوں تک ہی آتا تھا۔ عالیہ کبھی تیرا کی سیکھ ہی نہیں سکی تھی۔

”پاپا! میں نے آپ کے ساتھ ہی جانا ہے۔“ عالیہ نے روتے ہوئے کہا۔

”نہیں بیٹا! اب مجبوری ہے۔۔۔ تم یہاں محفوظ ہو۔ تمہاری سانولی رنگت کی وجہ سے سیاہ فام افریقی کبھی بھی تمہیں نہیں ماریں گے۔ جبکہ سمندر میں ہمارے ساتھ چھلانگ لگانی تو ڈوب جاؤ گی۔ یہاں کم از کم بھی گہرائی دو سو فٹ ہے اور اوپر سے چھلانگ لگاؤ گی تو دو سو فٹ نیچے جاؤ گی اور دوبارہ اوپر ہی نہیں آسکو گی۔ ہم دونوں تیرا کی جانتے ہیں اس لئے ہمیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ہم اگر بچ گئے تو ایک بار پھر یہاں آئیں گے پوری طاقت اور فوج کے ساتھ اور تمہیں ان افریقیوں سے چھڑا کر لے جائیں گے۔“ ایڈی نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ عالیہ مان گئی۔ وہ خاموشی سے جا کر دیوار کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئی۔

”چلو چلیں ایلیسا! عالیہ کو خدا کے سپرد کرتے ہیں۔ خدا اس معصوم بچی کی حفاظت کرے گا۔“ ایڈی نے ایلیسا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”عالیہ! میری بچی! افریقہ بہت بڑا ہے لیکن یہ کبھی بھی ایک ماں کی محبت سے زیادہ بڑا نہیں ہو سکتا۔ میں ایک بار پھر افریقہ آؤں گی اپنی بیٹی کو واپس لینے کے لئے۔“ اس نے اونچی آواز میں عالیہ سے کہا اور اپنے شوہر کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

وہ دونوں بھاگتے ہوئے ساحل کی طرف جانے لگے۔ اسی اثناء میں افریقیوں کا ایک گروپ بھی ادھر آ پہنچا۔ انھوں نے دونوں میاں بیوی کو سمندر کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھ لیا۔ سیاہ فاموں کے اس گروپ میں عاکون بھی موجود تھا۔ اس کی آنکھیں لال سرخ ہو چکی تھیں۔ اس نے درجن سے اوپر سفید فاموں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا لیکن ابھی تک اسکے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ سفید فاموں نے اس کی بیوی

کو مار ڈالا تھا۔ وہ ایک ایک سفید فام کو چن چن کر مار دینا چاہتا تھا۔ عاکون کے ساتھ دس اور بھی سیاہ فام تھے جو اس طرف آئے تھے۔ ان کی نظر دونوں میاں بیوی پر پڑ گئی جو بھاگتے ہوئے سمندر کی طرف جا رہے تھے۔ عاکون اور اس کے ساتھیوں کے پاس لکڑی کے بنے ہوئے تیز پھالے تھے۔ انھوں نے پھالوں کو سر سے اوپر کر کے نشانہ لیا۔

”نہیں۔۔۔!“ عاکون کو ایک چیخ سنائی دی تو اس کا نیزے والا ہاتھ نیچے آ گیا جبکہ باقی سارے بھالے تیزی سے اڑتے ہوئے ایڈی اور اس کی بیوی کی طرف گئے اور ان کے جسموں کے آ رہا ہو گئے۔ ایک نیزہ ایڈی کے پیچھے گردن میں لگا اور آگے حلق سے باہر نکل گیا۔ وہ زمین پر گر ا اور اسی وقت مر گیا۔ اسے ایک سیکنڈ بھی تڑپنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایلیسا کو تین بھالے لگے تھے۔ وہ زمین پر گری تڑپ رہی تھی۔ عالیہ نے سیاہ فاموں کو دیکھ کر چیخ ماری تھی۔ وہ سیاہ فاموں کو منع کرنا چاہتی تھی لیکن اس کی چیخ بیکار گئی تھی۔ اس کی چیخ نے صرف عاکون کا بھالہ ہی روکا تھا۔ عالیہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بھاگتی ہوئی ایڈی اور ایلیسا کے پاس پہنچ گئی۔ ایڈی مر چکا تھا جبکہ ایلیسا انک انک کر سانس لے رہی تھی۔ تینوں بھالے ایلیسا کے جسم میں ترازو ہو چکے تھے۔ اس کا خون کسی فوارے کی طرح ابل ابل کر باہر آ رہا تھا۔ عالیہ ان کے پاس پہنچ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی ماں کا سراٹھایا اور اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ حملہ آور سیاہ فاموں نے ایک بار پھر بھالے نکالے وہ عالیہ کو بھی مارنا چاہتے تھے لیکن عاکون ان کے آگے آ گیا۔ عاکون کی آنکھوں سے نکلنے والے شعلے بچھ چکے تھے۔ پتہ نہیں کیوں اچانک ہی اسے عالیہ سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ اس نے صرف ایک پل کے لئے ہی عالیہ کے چہرے کی طرف دیکھا تھا لیکن ایک پل کی نظر نے ہی اسے عالیہ کا ہمدرد بنا دیا تھا۔ عالیہ کے چہرے پر پھیلی ہوئے بے بسی اور درد سیدھا اس کے دل میں اتر چکا تھا۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے سبھی لڑکے عالیہ کو بھی مار دینا چاہتے تھے لیکن عاکون نتائج کی پروا کئے بغیر ان کے آگے آ گیا۔ وہ عالیہ کو بچانا چاہتا تھا۔

”عاکون! آگے سے ہٹ جاؤ، یہ گورے ہمارے دشمن ہیں۔“ ایک لڑکے نے عاکون سے کہا۔ اس نے بھالا اپنے سر سے بلند کیا ہوا تھا۔

”نہیں! یہ لڑکی ہماری دشمن نہیں ہے بلکہ یہ ہم میں سے ایک ہے۔“ عاکون نے عالیہ کا دفاع کرتے ہوئے کہا۔

عالیہ اپنی ماں کا سر گود میں لئے رو رہی تھی۔ ایلیسا کا سانس اب بہت مشکل سے اٹک کر چل رہا تھا۔ اس نے ایک نظر اپنی بیٹی عالیہ کی طرف دیکھا۔ سانولہ رنگ، دکھ اور درد کی زیادتی سے مزید سانولہ ہو گیا تھا۔ عالیہ اس کے اوپر جھکی رو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو نکل رہے تھے جو سیدھے ایلیسا کے چہرے پر گر رہے تھے۔ خدا نے ان دونوں میاں بیوی کو کوئی اولاد نہیں دی تھی۔ ایلیسا کو عالیہ کے چہرے میں اپنی بیٹی نظر آتی تھی اس لئے اس نے بہاولپور کے نواب سے لڑ کر اسے حاصل کیا تھا۔ وہ اسے بہاولپور کے نواب کے چنگل سے چھڑا کر لے آئی تھی لیکن عالیہ کی قسمت اسے افریقیوں کے چنگل میں لے آئی تھی۔

”عالیہ! میری بچی مجھے معاف کر دینا۔“ ایلیسا نے بے بسی سے کہا۔

”نہیں ماما! مجھے معاف کر دینا۔۔۔ میں آپ کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکی۔“ عالیہ نے اپنے سر کو نئی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

عاکون دونوں ماں بیٹی کے آگے کھڑا تھا۔ وہ دوسرے سیاہ فاموں کو روک رہا تھا۔ اتنی دیر میں کچھ اور بھی حملہ آور ادھر آچکے تھے۔ اچانک ایک آدمی کو موقع مل گیا۔ اس نے بھالا لہرایا اور عاکون کو ایک سائیڈ پر کرتے ہی بھالا ایلیسا کے سینے میں گھونپ دیا۔ ایلیسا کو ایک جھٹکا لگا اور وہ اوپر کی طرف اٹھی اور دھپ سے دوبارہ گر گئی۔ اس کی سانس پہلے ہی سینے میں اٹک کر چل رہی تھی۔ بھالے نے اس کی ساری تکلیفیں دور کر دیں۔ اس نے آخری ہچکی لی اور اس کی روح نکل گئی۔

”نہیں۔۔۔ نہیں ماما! پلیز! مرنا نہیں۔۔۔ مجھے چھوڑ کر مت جانا۔“ عالیہ نے چیختے ہوئے کہا۔

ایلیسا مر چکی تھی، دونوں میاں بیوی مارے جا چکے تھے۔ عالیہ نے غصے سے بھالا مارنے والی کی طرف دیکھا۔ وہ بھالے والے آدمی پر حملہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ جیسے ہی اوپر اٹھی اسی وقت عاکون بھی سنبھل چکا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا بھالا سامنے کھڑے حملہ آور کے بازو میں گھونپ دیا۔

”آہ۔۔۔ عاکون۔۔۔!“ حملہ آور کی تیز چیخ سنائی دی۔ عاکون نے عالیہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے دو قدم

پیچھے لے کر چلا گیا۔

”یہ لڑکی ہم میں سے ایک ہے، اس کی حفاظت میں کروں گا۔ جو بھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے گا میں اس کی آنکھ نکال دوں گا۔“ عاکون نے دھاڑتے ہوئے کہا۔ عاکون کا قدر چھوٹ سے اونچا تھا اور اس کی چھاتی پہلوانوں کی طرح چوڑی تھی۔ نازک سی عالیہ اس کے پیچھے پوری چھپ چکی تھی۔

”عاکون! آگے سے ہٹ جاؤ، یہ لڑکی بھی انہی کی ساتھی ہے۔ یہ بھی گوری چٹری والوں کی ساتھی ہے جنہوں نے ہمارے لاکھوں گھروں کو اجاڑا ہے۔ ہم لوگ تو بڑے سکون سے رہ رہے تھے، یہ لوگ آئے اور انہوں نے ہمارے جنگلوں کو آگ لگائی، ہمارے لوگوں کو غلام بنایا۔۔۔ یہ ظالم لوگ ہیں بہت ظالم لوگ ہیں۔ آج ہم ان سب سے بدلہ لیں گے۔“ ہجوم کی تعداد اب کافی بڑھ چکی تھی۔

وہ سب لوگ عالیہ کو بھی مار دینا چاہتے تھے لیکن عاکون ان کے آگے آگیا۔ عاکون نے صرف ایک نظر ہی اس کی طرف دیکھا تھا اور وہ ایک نظر ہی اس کا سب کچھ چھین کر لے گئی تھی۔ عاکون کو عالیہ کے چہرے پر پھیلی ہوئی بے بسی بھاگتی تھی۔ وہ عالیہ کو ہر حالت میں بچانا چاہتا تھا۔ سفید فاموں نے ان کی بیوی کو مار دیا تھا۔ وہ اس کی بہن کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔ عاکون ہی اپنی بیوی کا بدلہ لینے کے لئے قبائلیوں کو اٹھا کر کے یہاں تک لایا تھا۔ اس نے اپنی بہن اوکسانہ کو بھی سفید فاموں سے چھڑا لیا تھا۔ انہوں نے رویا میں موجود کوئی دو ہزار سے اوپر سفید فاموں کو مار گرایا تھا۔ مون رویا کی اس بندرگاہ میں اس وقت ایک بھی سفید فام نہیں بچا تھا۔ صرف ایک عالیہ رہ گئی تھی۔ سیاہ فام قبائلی اسے بھی مار دینا چاہتے تھے لیکن عاکون کو پتہ نہیں کیوں اس لڑکی کی بے بسی پر ترس آ گیا تھا۔ لڑکی کی معصومیت نے سیدھا اس کے دل پر اثر کیا تھا۔ وہ عالیہ کو بچانے کے لئے کچھ بھی کر سکتا تھا۔

”یہ لڑکی ان میں سے نہیں ہے، یہ بھی ہماری طرح ان کی غلام تھی جواب آزاد ہے۔“ عاکون نے چیختے ہوئے کہا۔

”نہیں عاکون! یہ سب ایک جیسے ہیں، یہ لڑکی بھی انہی کی ساتھی ہے۔۔۔ تم ایک سائیڈ پر ہو جاؤ اور لوگوں کو اپنا انتقام پورا کرنے دو۔“ عاکون کے قبیلے کے سردار نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ اس نے بھی ہاتھ میں ایک تیز بھالا پکڑا ہوا تھا جس سے ابھی تک سرخ خون نچڑ رہا تھا۔

”سردار! یہ لڑکی میری حفاظت میں ہے۔ میں کسی کو بھی اس تک نہیں پہنچنے دوں گا۔ جس نے آنا ہے وہ پہلے میرا مقابلہ کرے اور مجھے مار کر لڑکی لے جائے۔“ عاکون نے اپنے بھالے کو سر سے اوپر بلند کرتے ہوئے کہا۔

اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ عاکون کی بہن اوکسانہ بھی ہجوم سے باہر نکلی اور وہ بھی اپنے بھائی کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی ہو گئی۔ اوکسانہ کے پیچھے پیچھے عاکون کی برادری کے لوگ (کزیز

وغیرہ) اور پھر قبیلے والے بھی آگئے۔ سردار نے جب قبیلے والوں کو عاکون کی طرف داری کرتے دیکھا تو وہ بھی عاکون کی طرف ہو گیا۔

”میں اور میرا پورا قبیلہ اب عاکون کے ساتھ ہیں، ہم لوگ اس لڑکی کی حفاظت کریں گے۔ یہ لڑکی آج سے ہمارے قبیلے کی لڑکی ہے۔ اس پر حملہ ہمارے قبیلے پر حملہ ہوگا۔ جسے لڑنا ہے، جسے اپنی عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کرنا ہے وہ آجائے اور مقابلہ کرے۔“ سردار نے چیختے ہوئے کہا۔

سردار کے قبیلے کے صرف دو سو کے قریب لوگ تھے جو عاکون اور عالیہ کی طرف کھڑے تھے جبکہ ان کے سامنے دوسرے قبیلوں سے آئے ہوئے دس ہزار کے قریب سیاہ فام قبائلی تھے۔ عاکون اور اس کا قبیلہ عالیہ کو بچانے کے لئے دس ہزار سیاہ فاموں کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ افریقی قبائلی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ان کو موت سے ڈر نہیں لگتا۔ دشمن ایک ہو یا ایک لاکھ یہ لڑتے لڑتے مر جاتے ہیں لیکن پیچھے نہیں ہٹتے۔ عاکون اور اس کا قبیلہ بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ قبیلے والے عاکون سے محبت کرتے تھے۔ وہ قبیلے کا سب سے بہادر اور مضبوط نوجوان تھا۔ جنگل سے سب سے زیادہ شکار کر کے وہی لاتا تھا۔ افریقہ کے قبائل آپس میں مل بانٹ کر ہی کھاتے تھے۔ قبیلے کے سارے نوجوان شکار کرتے تھے اور اس گوشت کو سارے مل کر کھاتے تھے۔ قبیلے کے سارے کام مل بانٹ کر کئے جاتے تھے۔ قبیلے کے سردار کا کوئی بیٹا یا بیٹی نہیں تھی۔ اس لئے سردار کے مرنے کے بعد عاکون کو ہی اس کا جانشین سمجھا جاتا تھا۔ سردار کے بعد عاکون ہی قبیلے کا سردار ہوتا۔ گاؤں کے سارے نوجوان اسے ابھی سے ہی سردار ماننے لگے تھے۔ مون رویا کی بندرگاہ پر وہ سارے عاکون کی وجہ سے ہی آئے تھے۔ انھوں نے سفید فاموں کو مار کر اپنے قبیلے کے لوگوں کو چھڑوا لیا تھا۔ وہ سارے عالیہ کو بھی مار دینا چاہتے تھے لیکن عاکون کی وجہ سے وہ رک گئے۔ عاکون نے جب عالیہ کی حفاظت کی ذمہ داری سنبھالی تو وہ سارے ہی عاکون کے ساتھ مل گئے۔ دوسرے قبیلے والے کچھ دیر تک تو غصہ کرتے رہے لیکن آخر کار مان گئے۔ عالیہ کی شکل کسی قدر افریقی سیاہ فاموں سے ملتی جلتی تھی۔ اس لئے بھی انھوں نے زیادہ زور نہیں دیا اور وہ سارے عالیہ کو چھوڑ دینے پر رضامند ہو گئے اور واپس اپنے اپنے قبیلوں کی طرف جانے لگے۔

”عاکون اس لڑکی کا اب کیا کرنا ہے؟ یہاں مون رویا شہر میں اس کی جان کو خطرہ ہے۔ قبائلی اسے مار دیں گے۔۔۔ یہ ہماری زبان بھی نہیں جانتی ہے۔“ سردار نے فکر مندی سے کہا۔

”سردار! میں اسے لیکرا دھر ہی اوپر پہاڑی پر ایک جھونپڑی بنا کر رہتا ہوں۔ سفید فاموں کے جہاز ادھر آتے رہتے ہیں۔ جیسے ہی ان کا کوئی جہاز ادھر آئے گا تو میں اسے نیچے بھیج دوں گا اور خود واپس قبیلے میں آ جاؤں گا۔“ عاکون نے ایک نظر عالیہ کی طرف دیکھا جو وہیں زمین پر بیٹھی سسکیوں سے رو رہی تھی۔

ایڈی اور ایلیسا کی لاش قبائلی اٹھا کر لے گئے تھے۔ قبائلیوں نے ایک بھی سفید فام یہاں نہیں چھوڑا تھا۔ وہ سبھی لاشوں کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ آج رات وہ ان کے گوشت سے دعوت اڑاتے۔ سفید گوشت افریقیوں کی من پسند غذا تھی۔

”عاکون! تم بہت بہادر نوجوان ہو، میرے جانشین ہو۔۔۔ میرے بعد قبیلے کی باگ ڈور تم نے ہی سنبھالنی ہے۔ تم بہادر ضرور ہو لیکن تمہارا ذہن ابھی ناپختہ ہے۔ تمہیں گورے سفید فاموں کی وحشت اور بربریت کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ تم نے کبھی غلامی دیکھی ہی نہیں ہے ورنہ تمہیں ان گوروں کی دہشت کا اندازہ ہو جاتا۔ یہ لڑکی بھی غلام ہے، یہ بھی ہمارے جیسی ہے جسے مغربی افریقہ کے کسی قبیلے سے اٹھایا گیا ہوگا۔ جب گورے دوبارہ یہاں آئیں گے تو اسے دوبارہ غلام بنالیا جائے گا۔ پہلے والے مالک اچھے تھے اس لئے یہ ابھی تک ان کے لئے رو رہی تھی لیکن اگلے مالک کیسے ہوں گے یہ کسی کو معلوم نہیں ہے۔ یہ بے چاری دوبارہ غلام بنالی جائے گی یا مردی جائے گی۔“ سردار کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

”سردار! یہ بات ہے تو میں اسے اس کے گھر پہنچا کر آتا ہوں۔ میں نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے۔“ عاکون نے پر جوش لہجے میں کہا۔

”یار! تم واقعی بہت سادہ ہو، تمہیں اس لڑکی کی زبان نہیں آتی۔ یہ کہاں سے آئی ہے، کون ہے اور اس کا نام کیا ہے تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ تم کیسے اسے گھر پہنچاؤ گے؟ یہ سمندر بہت بڑا ہے، اس کا کوئی کنارہ نہیں ہے۔۔۔ تم ایک بار اس سمندر میں چلے گئے تو پھر کبھی بھی واپس نہیں آؤ گے۔ یہ سمندر تم دونوں کو نگل جائے گا۔“ سردار نے سمندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”عاکون! تم نے اسے بچا کر غلط کیا ہے، اسے بھی دوسرے سینکڑوں سفید فاموں کے ساتھ مر جانے دیتے تو یہ اس سے بہتر تھا۔ یہ وہ کونج ہے جو اپنی ڈار سے الگ ہو گئی ہے۔ اب یہ نہ ہی گھر پہنچ سکتی ہے اور نہ ہی اپنی منزل پر۔۔۔ اس کے لئے موت ہی سب سے آسان راستہ تھا۔“ سردار نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے تسلی دینے لگا۔

”بھائی! کیا ہم اسے اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتے؟ یہ بہت پیاری ہے اور ہمارے ساتھ ہمارے گھر میں یہ خوش رہے گی۔“ اوکسانہ نے عاکون سے پوچھا۔ وہ زمین پر عالیہ کے ساتھ بیٹھی اسے تسلی دینے لگی۔ عالیہ کی سسکیاں بھی اب بند ہو چکی تھیں۔ رورو کر اس کا حلق خشک ہو چکا تھا۔ وہ اب ہلکے ہلکے کانپ رہی تھی۔

”سردار! کیا ہم اسے اپنے ساتھ لیکر نہیں جاسکتے؟“ عاکون نے سردار کی طرف پر امید نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”جیسے تمہاری مرضی ہے بیٹے! مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ اگر تمہیں یہی ٹھیک لگتا ہے تو ٹھیک ہے ہم اسے اپنے ساتھ قبیلے لے جاتے ہیں۔“ سردار نے انہیں اجازت دی تو وہ عالیہ کو لیکر قبیلے میں آ گئے۔ عالیہ کے اندر جینے کی خواہش ہی ختم ہو گئی تھی۔ وہ خاموشی سے ان کے ساتھ چل پڑی۔ عاکون کے قبیلے میں دو جھونپڑے تھے۔ ایک جھونپڑے میں وہ اور اسکی بیوی رہتے تھے جبکہ دوسرے جھونپڑے میں عاکون کے ماں باپ اور اسکی بہن رہتی تھی۔ عالیہ کے آنے کے بعد عاکون کے جھونپڑے میں اس کی بہن اور عالیہ دونوں شفٹ ہو گئیں جبکہ اس کے ماں باپ علیحدہ جھونپڑے میں ہی رہے۔ عاکون عالیہ کو اکیلا اپنی بہن کے پاس چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کسی بھی طریقے سے عالیہ کے نزدیک رہنا چاہتا تھا۔ اسے عالیہ کی معصومیت اور سانولہ حسن متاثر کر چکا تھا۔ افریقہ کے گھنے جنگلات میں رہنے والا ایک وحشی سیاہ فام عالیہ سے محبت کرنے لگا تھا۔ اس کے دل میں محبت کی کلی پھوٹ چکی تھی۔ اسے عالیہ کی زبان نہیں آتی تھی۔ عالیہ کو ان قبائلوں کی زبان بھی نہیں آتی تھی لیکن پھر بھی محبت شروع ہو چکی تھی۔ محبت کبھی بھی اظہار کی محتاج نہیں ہوتی۔ محبت کبھی بھی الفاظ کی محتاج نہیں ہوتی۔ یہ بس ہو جاتی ہے۔ یہ عاکون کو بھی ہو گئی تھی۔

عالیہ ایک مہینے تک ان کے ساتھ رہی اس دوران وہ نارمل سی ان کی زبان سمجھنے لگ گئی تھی۔ کچھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ اور باقی ہاتھ کے اشاروں سے ان کا کام چلنے لگا تھا۔ عالیہ نے پہلے کچھ دن غصہ تو کیا ایک دو بار گاؤں سے باہر جانے کی کوشش بھی کی لیکن کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ وہ اپنے گاؤں سے بہت دور آ چکی تھی۔ پیچھے بہاولپور کے گاؤں میں بھی نواب احمد خان کا راج تھا۔ وہ واپس بھی نہیں جاسکتی تھی۔ عالیہ نے اب اس قبیلے میں رہنا سیکھ لیا تھا۔ عاکون کے پورے قبیلے والوں نے اسے قبول کر لیا تھا۔ وہ مکمل آزاد تھی اور اپنی مرضی سے کہیں بھی آ جاسکتی تھی۔ عالیہ کی معصومیت اور شرارتیں واپس آ گئی تھیں۔

اگلے تین مہینے تک عالیہ نے قبائلیوں کی زبان پر مکمل عبور حاصل کر لیا۔ اس نے زبان کے ساتھ ساتھ قبیلے والوں کا دل بھی جیت لیا تھا۔ عاکون کا پورا قبیلہ ہی اسے اپنا فرد سمجھنے لگا تھا۔ عاکون بھی عالیہ کو اپنا سمجھتا تھا۔ اسے عالیہ سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ ایک پل بھی عالیہ کے بغیر نہیں نکال سکتا تھا۔ افریقہ کے قبائلی معاشرے میں عورت کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی تھی۔ عورت کو صرف جنسی ضرورت اور بچے پیدا کرنے کے لئے ہی ضرورت سمجھا جاتا تھا۔ طاقتور مرد اپنی مرضی کی عورت رکھتا تھا۔ یہاں ایک سے زائد عورتیں رکھنے کا رواج تھا۔ یہاں طاقت ہی سب کچھ ہوتی تھی۔ جو جتنا بڑا طاقتور ہوتا تھا وہ اتنی ہی زیادہ عورتیں رکھتا تھا۔

عاکون کے قبیلے کے سردار کی پانچ بیویاں تھیں لیکن حیرت انگیز طور پر عاکون کی صرف ایک ہی بیوی تھی۔ اسے اپنی پہلی بیوی اچھی لگتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ وفادار تھا لیکن اس کی موت نے عاکون کو ہلادیا۔ وہ اپنی بیوی کی موت کا بدلہ لینے گیا تھا اور عالیہ کو بچا کر لے آیا۔ اسے عالیہ سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ صبح و شام عالیہ کی محبت کا ہی دم بھرنے لگا۔ گاؤں والوں کو عاکون کی محبت کا پتہ چل گیا۔ گاؤں والے عاکون کو عالیہ سے شادی کرنے کا بھی کہہ رہے تھے۔ عاکون اپنے قبیلے کا ہونے والا سردار تھا۔ وہ اس علاقے کا سب سے طاقتور نوجوان تھا۔ وہ زبردستی بھی عالیہ سے شادی کر سکتا تھا لیکن کوئی انجانی طاقت اسے روک دیتی تھی۔ وہ عالیہ سے عشق کرنے لگا تھا اور یہی عشق اسے عالیہ سے زبردستی کرنے نہیں دیتا تھا۔ وہ تو عالیہ کی ہلکی سی تکلیف سے بھی تڑپ اٹھتا تھا۔ عالیہ کو بھی عاکون کے جذبات کا پتہ تھا۔ اسے عاکون کی طاقت اور سادہ پن بہت متاثر کرتا تھا۔ عالیہ کو معلوم تھا کہ اس کی باقی ساری زندگی افریقہ کے انہی جنگلات میں ہی گزرنی ہے اور واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اسے اسی قبیلے میں رہنا تھا۔ اسے ایک مرد کے سہارے کی ضرورت تھی۔ اسے زندگی میں آگے بڑھنے کے لئے کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ اسے عاکون کے کندھے کی ضرورت تھی۔ اسے بھی عاکون اچھا لگنے لگا تھا۔ وہ اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ وہ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا۔

عالیہ کو عاکون کی بہن اوکسانہ اور ماں باپ سب اچھے لگتے تھے لیکن پھر بھی عالیہ عاکون سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ عاکون سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اوکسانہ نے کئی بار اسے شادی کا کہا تھا لیکن عالیہ نے اسے منع کر دیا۔ عاکون نے اپنے ماں باپ کو بھی عالیہ سے بات کرنے کا کہا لیکن عالیہ نے سب کو منع کر دیا۔ اس نے کسی سے بھی شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ عاکون عالیہ سے بہت محبت کرنے لگا تھا اس کی عالیہ

سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ اس سے انکار سننے کی ہمت نہیں تھی۔ قبیلے والے اب عاکون پر زور دینے لگے تھے۔ وہ عاکون کو شادی کے لئے بول رہے تھے۔ عاکون ان کا ہونے والا سردار تھا۔ سردار کا مطلب سب سے مضبوط اور طاقت ور ہوتا ہے۔ یہاں اولاد بھی طاقت کی علامت ہوتی ہے جبکہ عاکون تو بغیر شادی کے ہی پھر رہا تھا۔ اس کی اولاد کہاں سے ہوتی؟

”بیٹا! اب کیا سوچا ہے؟ تم عالیہ کی بجائے کسی اور سے شادی کر لو؟“ شام کو عاکون اپنے والد کے پاس بیٹھا ہوا کھانا کھا رہا تھا جب اس کے والد نے شادی کی بات چھیڑ دی۔

”ابا! آپ سب کو معلوم ہے کہ میں عالیہ ہی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ منع کر رہی ہے تو میں کسی اور سے کیسے شادی کر سکتا ہوں؟“ عاکون نے گوشت کی ایک بوٹی منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ لوگ آج ہی جنگل سے اکٹھے دس ہرن شکار کر کے لائے تھے۔

”بیٹا! لوگ تمہیں اس قبیلے کا سردار سمجھتے ہیں، لوگ تم سے محبت کرتے ہیں۔ تمہاری وجہ سے ان کے گھر والے واپس آئے ہیں اور ہم نے پہلی بار سفید فاموں کو شکست دی ہے۔ قبیلے والے تم سے محبت کرتے ہیں اسی لئے وہ تمہیں اکیلا نہیں دیکھ سکتے۔ وہ تمہارے بچے دیکھنا چاہتے ہیں۔ بیٹا! شادی تو تمہیں ہر حال میں کرنی ہی ہے ورنہ سرداری جاتی رہے گی۔“ عاکون کے ابو نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ابا! مجھے سرداری کی کوئی پروا نہیں ہے۔ قبیلے کی سرداری عالیہ سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔ میں اس لڑکی کی خاطر اپنی سرداری بھی قربان کر سکتا ہوں۔“ عاکون نے جھونپڑی سے باہر دور تک دیکھتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! تمہیں عالیہ سے کون الگ کر رہا ہے۔۔۔ تم اگر عالیہ سے محبت کرتے ہو تو شادی بھی تو کرونا! تم اس قبیلے کے ہونے والے سردار ہو تمہیں کون عالیہ سے شادی کرنے سے روک رہا ہے؟“ اس نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

”ابا! عالیہ ہی تو روک رہی ہے۔۔۔ وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ وہ کسی سے بھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ عاکون نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! عالیہ کی مرضی کون جاننا چاہتا ہے؟ ہم لوگ عورتوں سے ان کی مرضی نہیں پوچھتے بلکہ صرف فیصلے کرتے ہیں۔ ہماری عورتیں ان فیصلوں کا احترام کرتی ہیں۔ عالیہ کی مرضی پوچھ کر تم ہمارے قبیلے کی روایات کو توڑ رہے ہو۔ عالیہ کو تم بچا کر لائے ہو وہ تمہاری ملکیت ہے۔ اس کے ساتھ سونے کا اختیار تمہیں ہمارا

سورج دیوتا دیتا ہے۔ وہ تمہاری ملکیت ہے اس لئے گاؤں کا کوئی بھی اور مرد اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ تم ہمارے قبیلے کے واحد مرد ہو جو اپنی ہی عورت کے پاس جاتے ہوئے ڈر رہے ہو۔ شادی تو صرف ایک رسم ہے ورنہ عالیہ تو پہلے دن سے ہی تمہاری ملکیت ہے۔ تمہیں پہلے دن سے ہی اس کے ساتھ سب کچھ کر لینا چاہیے تھا۔“ عاکون کے والد نے غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ابا! وہ میری ملکیت نہیں ہے۔ میں نے اس کی جان ضرور بچائی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں زبردستی اس سے شادی کر لوں۔“ عاکون کو بھی تھوڑا غصہ آ گیا۔

”اچھا! اگر وہ تمہاری ملکیت نہیں ہے تو پھر کس کی ملکیت ہے۔؟ وہ ہمارے سفید دشمنوں کی ملکیت تھی جسے جنگ کے میدان سے حاصل کیا گیا ہے۔ عاکون! یہ افریقہ ہے اور یہاں دو قبیلوں کی جب لڑائی ہوتی ہے تو مفتوح قبیلے کی ساری عورتیں غلام بن جاتی ہیں۔ وہ فاتح کی ملکیت ہوتی ہیں۔ عالیہ کی جگہ پر دوسری عورتیں ہوتیں تو کیا تب بھی تم یہی کہتے؟“ عاکون کے والد نے اس سے سوال کیا۔

”بیٹا! عالیہ مجھے بھی اچھی لگتی ہے، وہ بہت اچھی لڑکی ہے لیکن بحر حال وہ عورت ہے اور عورتوں کو سر پر بٹھانے والے مرد ہمیشہ ہر میدان میں ہارتے ہی ہیں، تم ایک اچھے سردار بن سکتے ہو۔ قبیلے والے تمہاری بہادری کی مثالیں دیتے ہیں لیکن اگر تمہاری یہی حالت رہی تو ایک دن تم خود بھی مرو گے اور اپنے ساتھ پورے قبیلے کو بھی مروادو گے۔“

”ابا! اب میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں عالیہ کے ساتھ کوئی سختی نہیں کر سکتا۔“ عاکون نے بے بسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”عاکون بیٹا! مرد بنو مرد۔۔۔ تمہارے کندھوں پر ہزاروں ذمہ داریاں ہوں گی۔ تم ان ذمہ داریوں سے بھاگ نہیں سکتے۔ بیٹا! ایک لڑکی کے لئے ان سب چیزوں کو داؤ پر مت لگاؤ۔ تم سردار ہو اور صرف سرداری کرو۔ عالیہ جیسی ہزاروں لڑکیاں آتی جاتی رہیں گی۔ کسی ایک لڑکی کے پیچھے یوں پاگل ہونا کسی مرد کو زیب نہیں دیتا۔“ عاکون کے والد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”ابا! آپ نے عالیہ کو کبھی غور سے دیکھا ہی نہیں ہے۔ آپ نے اپنے بیٹے کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے۔ آپ مرد عزت، سرداری پتہ نہیں کیا کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے ان میں سے کسی کا بھی پتہ نہیں ہے۔ مجھے صرف اتنا پتہ ہے کہ میں عالیہ کے لئے جان دے سکتا ہوں اور بس! مجھے اور کچھ نہیں کہنا ہے۔“ وہ

اپنی جگہ سے اٹھا اور جھونپڑے سے باہر نکل گیا۔ اس کا باپ اسے پیچھے سے دیکھتا رہ گیا۔ وہ اپنے جھونپڑے میں آیا تو عالیہ اور اوکسانہ آپس میں گپیں لگا رہی تھیں۔

”اوکسانہ! چوبیس گھنٹے دانت مت نکالا کرو، جب دیکھو ایسے ہی پاگلوں کی طرح دانت نکالتی رہتی ہو۔“ عاکون نے جھونپڑے میں داخل ہوتے ہی غصے سے کہا۔ اس کے چہرے پر بارہ بجے ہوئے تھے۔

”یار! کیا بات ہے، تم اتنا غصہ کیوں کر رہے ہو؟“ اوکسانہ نے اپنے بھائی کو غصے میں دیکھا تو سوال کیا۔ عام طور پر وہ کبھی بھی ایسے غصہ نہیں کرتا تھا۔

”کوئی بات نہیں ہے تم بس زیادہ دانت مت نکالا کرو اور تھوڑی سمجھ دار بھی ہو جاؤ۔ تم اب جوان ہو گئی ہو، انہی سردیوں میں تمہاری شادی کر دی جائے گی اس لئے اب یہ زیادہ بچپنا مت دکھایا کرو۔“ عاکون کا غصہ ابھی تک برقرار تھا۔ وہ اوکسانہ کی بجائے عالیہ کو سن رہا تھا۔

”اوہ! میرے پیارے بھائی کو میری کتنی فکر ہے۔“ اس نے بھائی کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ہاں اوکسانہ! تم اب زیادہ گھوما پھرا مت کرو، آرام سے گھر بیٹھا کرو۔ یہ بچپنا اب ختم کرو اور تھوڑی سمجھدار ہو جاؤ۔“ عاکون نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”بھائی پکا! آپ میری شادی کی ہی بات کر رہے ہیں یا پھر اپنی شادی کی فکر ہو رہی ہے؟“ اوکسانہ نے بھائی کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ اس نے ایک ترچھی نظر عالیہ پر ڈالی۔

”میں ایک چکر ذرا باہر لگا کر آتی ہوں، ذرا چاچا چاچی کے جھونپڑے میں نظر مار لوں گی۔ ان کو اگر کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو میں ان پوچھ لوں گی۔“ عالیہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”عالیہ! میں ابھی ابھی انہی کے پاس سے ہو کر آ رہا ہوں۔ انہیں کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“ عاکون نے جلدی سے بولتے ہوئے کہا۔ وہ عالیہ سے عشق کرنے لگا تھا۔ عالیہ اگر ایک پل کے لئے بھی اس کی نظروں سے دور ہوتی تھی تو اس کی جان نکلی شروع ہو جاتی تھی۔ وہ ہر وقت عالیہ کو اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔ عالیہ سے ایک پل کی دوری بھی اب اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ وہ تواب جنگل میں شکار کے لئے بھی بڑی مشکل سے جاتا تھا۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

”نہیں عاکون! میں ویسے بھی ایک چکر باہر لگانا چاہتی ہوں۔“ عالیہ نے آگے سے جواب دیا اور وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

”بھائی! آپ اس سے شادی کی بات کیوں نہیں کرتے ہیں؟“ اوکسانہ نے بھائی سے سوال کیا۔ وہ اب کافی سنجیدہ ہو گئی تھی۔

”یار! وہ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی ہے۔ تم نے، امی ابو نے، سبھی نے تو اس سے بات کر کے دیکھ لی ہے۔ سردار نے بھی عالیہ سے کہا تھا لیکن وہ کسی کی بات بھی نہیں مان رہی ہے۔“ عاکون نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”بھائی! ان کی بات کرنے اور آپ کی بات کرنے میں بہت فرق ہے۔ وہ شاید آپ کے منہ سے شادی کی بات سننا چاہتی ہو۔ شاید آپ اسے کہیں تو وہ منع نہ کرے۔ بھائی! آپ ایک بار پوچھ کر تو دیکھو!“ اوکسانہ کے لہجے میں امید جھلک رہی تھی۔

”نہیں یار! مجھ سے عالیہ کا انکار سننا نہیں جائے گا۔ میں اس کا انکار برداشت نہیں کر سکوں گا۔“ عاکون نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

”بھائی! پھر بھی آپ کو ہمت تو کرنی پڑے گی، ایسا کب تک چلے گا۔ قبیلے والے اب آہستہ آہستہ آپ سے متنفر ہونے لگے ہیں۔ عالیہ کی عزت بھی اب کم ہونے لگی ہے۔ پورا قبیلہ آپ کی عالیہ سے شادی دیکھنا چاہتا ہے۔ پورے قبیلے کو پتہ ہے کہ آپ عالیہ سے شادی کرنا چاہتے ہو لیکن عالیہ شادی سے انکار کر رہی ہے۔ ایسے حالات میں صرف نفرت ہی بڑھے گی۔ بھائی! قبیلے والے اب باتیں کرنے لگے ہیں۔ وہ ان سب باتوں میں قصور وار عالیہ کو مان رہے ہیں۔ بھائی! آپ کو جلدی کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ گاؤں والے کوئی غلط قدم اٹھائیں۔ آپ۔۔۔“ اوکسانہ نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”اوکسانہ! قبیلے والوں کی مجال نہیں ہے کہ وہ عالیہ کی طرف ترجیحی نظر سے بھی دیکھیں۔ میں ایک ایک کی آنکھ نکال کر رکھ دوں گا۔“ عاکون نے چیختے ہوئے کہا۔ اس کو اوکسانہ کی بات پر غصہ آ گیا تھا۔

”بھائی! آپ بات کو سمجھ نہیں رہے ہو۔۔۔ خدا نخواستہ اگر عالیہ کو کچھ ہو جاتا ہے تو بعد میں بدلہ لینے سے کیا ہوگا؟ بھائی! ہم سب کو عالیہ اچھی لگتی ہے۔ اگر عالیہ کو کچھ ہو تو وہ آپ کی وجہ سے ہوگا۔ ہم آپ کو کبھی خفا نہیں کریں گے۔ عالیہ آپ کی ملکیت ہے، آپ پیار سے کرو یا زبردستی آپ کو ایک دن یہ سب کچھ کرنا پڑے گا ورنہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔“ اوکسانہ نے قدرے فکر مندی سے کہا۔

اس چھوٹی لڑکی کے ماتھے پر سوچ کی ان گنت لکیریں موجود تھیں۔ عالیہ بھی اتنی دیر میں باہر کا ایک چکر

لگا کر واپس آ گئی تھی۔ وہ خاموشی سے آکر ان کے سامنے پڑے دوسرے بستر پر بیٹھ گئی تھی۔ اوکسانہ اپنے بھائی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ کمرے میں دو ہی بستر تھے ایک پر عاکون سوتا تھا جبکہ دوسرے بستر پر عالیہ اور اوکسانہ دونوں اکٹھی سوئی تھیں۔

”ٹھیک ہے بھائی! میں اب جاتی ہوں۔ آج سے میں امی ابو کے ساتھ دوسرے جھونپڑے میں ہی سویا کروں گی۔ مجھے عالیہ کے ساتھ نیند نہیں آتی۔“ اوکسانہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

وہ پچھلے تین چار مہینے سے اکٹھی سو رہی تھیں۔ اوکسانہ اب اپنے ماں باپ کے پاس سونا چاہتی تھی۔ تاکہ یہ جھونپڑا عاکون اور عالیہ کے لئے رہے۔ دونوں کو تنہائی ملے اور وہ جلد سے جلد شادی کا فیصلہ کریں۔ دونوں اگر ایک جھونپڑے میں سونا شروع کر دیتے تو قبیلے والوں کو بھی تھوڑا سکون مل جاتا۔ انھیں بھی اپنے ہونے والے سردار کی شادی کی امید ہو جاتی۔

”اوکسانہ! تم ادھر یہاں سو جاؤ! میں مئی پاپا کے کمرے میں سو جاتی ہوں۔“ عالیہ نے جلدی سے کہا۔ وہ بھی اوکسانہ کے پیچھے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”نہیں عالیہ! تمہیں اب یہیں سونا پڑے گا۔ آج کے بعد تم دونوں اکٹھے سویا کرو گے۔ میں دوسرے جھونپڑے میں سویا کروں گی۔“ اوکسانہ نے عالیہ کے چہرے کو پیار سے سہلاتے ہوئے کہا۔

”یار! تم دونوں ادھر یہاں سو سکتی ہو۔ اگر کوئی پرالیم ہے تو میں امی ابو کے ساتھ جا کر سو جاتا ہوں اور کل سے ایک نیا جھونپڑا بھی بنانا شروع کر دیتا ہوں۔“ عاکون بھی ان کے ساتھ ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”نہیں بھائی! یہ بات نہیں ہے۔ آپ دونوں کو اب اکٹھا سونا ہی پڑے گا۔ پورا قبیلہ اب اس چیز کی آس لگا کر بیٹھا ہوا ہے۔ عالیہ کو یہاں پانچ مہینے ہو گئے ہیں اور یہ بھی شادی نہیں کر رہی ہے۔ آپ بھی ایسے ہی رہ رہے ہو۔ یہ سب کچھ ایسے نہیں چلے گا۔ ایک نہ ایک دن شادی کرنی ہی پڑے گی تو پھر اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟ آج سے آپ دونوں یہاں اسی جھونپڑے میں سویا کرو گے۔“ اوکسانہ نے دونوں کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔

”عالیہ! میری بہن، ہم سب لوگ تم سے محبت کرتے ہیں اور ہم سب ہی یہ چاہتے ہیں کہ تم عاکون سے شادی کر لو۔ تم نے دو تین بار اس جنگل سے باہر جانے کی کوشش کر کے دیکھ لی ہے لیکن تم اپنے گھر سے اتنی دور آ گئی ہو کہ اب واپسی کا راستہ ہی نہیں ہے۔ تم واپس اپنے گھر نہیں جاسکتی۔ تمہاری اب باقی زندگی اس قبیلے

میں ہی گزرنی ہے اور اس کے لئے تمہیں عاکون سے شادی کرنی ہی ہوگی۔ اس چیز کو جتنی جلدی سمجھو گی اتنا ہی اچھا ہے۔۔۔ تمہارے لئے بھی اور ہمارے لئے بھی۔“ اوکسانہ نے پیار سے اس کی گالوں کو چھوا اور جھونپڑے سے باہر نکل گئی۔ وہ دونوں واپس اپنے اپنے بستروں پر آکر بیٹھ گئے۔

”عالیہ! تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟“ عاکون اس سے پوچھنے لگا۔
 ”نہیں! نہیں! مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اب سونا چاہتی ہوں۔“ عالیہ بستر پر لیٹ گئی۔
 وہ خالی خالی آنکھوں سے جھونپڑے کی چھت کو گھور رہی تھی۔

”عالیہ! تم پریشان مت ہو، دیوتا ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ وہ ہماری مشکلوں کو ٹھیک کر دیں گے۔“ عاکون اٹھا اور وہ جا کر عالیہ کے بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے عالیہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے پیار سے سہلانے لگا۔
 ”عاکون! اگر میرے ساتھ سونا چاہتے ہو تو سو جاؤ۔“ عالیہ بستر پر تھوڑی کھسک گئی اور اس نے عاکون کو جگہ دے دی۔

”عالیہ! مجھے تم سے بہت محبت ہے، میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔“ وہ عالیہ کے پہلو میں لیٹ گیا۔
 وہ دونوں ایک دوسرے کے پہلو میں لیٹے اوپر چھت کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ عاکون نے پہلی بار محبت کا اظہار کر دیا تھا۔ اسے عالیہ سے پہلی نظر میں ہی محبت ہو گئی تھی۔ وہ پہلے دن سے ہی عالیہ سے محبت کرنے لگا تھا۔ محبت انسان کو بہادر بناتی ہے اور بزدل بھی بنادیتی ہے۔ افریقی قبائل کا جنگجو جوان سردار عاکون بھی عالیہ کی محبت میں بزدل بن گیا تھا۔ اسے عالیہ سے ڈر لگتا تھا، اسے عالیہ کی ناراضگی سے ڈر لگتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ابھی عالیہ کے پہلو میں لیٹا ہوا کانپ رہا تھا۔ ایک ایک پل ایک ایک صدی کے برابر ہو رہا تھا۔ دونوں ہی محبت کرتے تھے، دونوں کو ہی ایک دوسرے سے محبت تھی۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو چاہتے تھے لیکن دونوں ایک نہیں ہو سکتے تھے۔ عالیہ عاکون سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ کسی سے بھی شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”عالیہ! تم کچھ بول نہیں رہی ہو؟“ عاکون نے اس کی طرف کروٹ بدلی اور ڈرتے ڈرتے ایک ہاتھ آگے بڑھایا اور عالیہ کے نرم گالوں پر رکھ دیا۔

وہ آج پہلی بار عالیہ کو ہاتھ لگا رہا تھا۔ پچھلے پانچ مہینوں سے وہ ایک عاشق کی طرح عالیہ کے پیچھے پیچھے گھوم رہا تھا۔ آج پہلی بار وہ سردار بن رہا تھا۔ عالیہ اس کی ملکیت تھی اور وہ آج پہلی بات اپنی ملکیت جتا رہا

تھا۔ عالیہ کا جسم ہولے ہولے کانپنا شروع ہو گیا۔ نجانے کیوں اسے آج بڑے عرصے بعد نواب احمد خان یاد آنے لگا تھا۔ نواب احمد خان نے اس کے جسم کو ہی نہیں اس کی روح کو بھی لوٹا تھا۔ اس نے کروٹ بدلی اور عاکون کی طرف پشت کر کے لیٹ گئی۔ عالیہ نے ہتھیر ڈال دیے تھے۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ عاکون اس کے پاس آیا ہی اس لئے تھا۔ آج وہ اپنی ملکیت پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ آج وہ سردار بن گیا تھا۔ وہ اس لئے اس کی طرف پشت کر کے لیٹ گئی تھی۔ اس نے مزاحمت چھوڑ دی تھی۔ وہ عاکون کو اس کی مرضی کرنے دینا چاہتی تھی۔

عاکون نے ایک ہاتھ عالیہ کے اوپر سے گزرا اور اس کے ساتھ لیٹ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ عالیہ کے سینے پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ عالیہ کا جسم ایک بار پھر لرزنا شروع ہو گیا لیکن اس بار عاکون نے اس پر توجہ نہیں دی۔ اس نے عالیہ کی قمیض کے اندر ہاتھ ڈالا ہوا تھا اور پیار سے اس کے جسم کو سہلا رہا تھا۔ عاکون نے دوسرے ہاتھ سے عالیہ کے سر کے بالوں کو ایک سائیڈ پر کیا اور اپنے ہونٹ پیچھے اس کی گردن پر رکھ دیئے۔ لذت کا ایک انوکھا احساس اس کے رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا۔ وہ گردن سے ہوتا ہوا گلے تک آیا اور پھر وہ عالیہ کی گالوں کو چومنے لگا۔ نرم نرم گالوں کا ایک عجیب سانسہ تھا۔ وہ دو منٹ میں ہی مدہوش ہو گیا۔ اس نے جھٹکے سے عالیہ کو سیدھا کیا اور اپنے ہاتھ کو عالیہ کے پیٹ کے نیچے کی طرف لے جانے لگا۔ اس کے ہونٹ عالیہ کے گالوں سے چمٹے ہوئے تھے۔

”میں کپڑے اتار دوں؟“ عالیہ کی سسکتی ہوئی آواز آئی۔

”کیا۔۔؟ کیا کہہ رہی ہو؟“ عاکون کے چلتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔

”میں کپڑے اتار دیتی ہوں۔۔۔ آپ کو شاید ایسے مزہ نہیں آ رہا ہوگا؟“ عالیہ نے اوپر چھت کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔

”عالیہ! میں محبت کرتا ہوں تم سے۔“ عاکون سے مزید اور کچھ بھی نہیں بولا گیا۔ اس کے پاس مزید الفاظ ہی نہیں رہ گئے تھے۔ اگلے کئی لمحے ایسے ہی خاموشی سے گزر گئے۔ دونوں کے پاس الفاظ ہی نہیں رہ گئے تھے۔

”عاکون! میں تمہیں ان سب سے الگ سمجھتی تھی، بہت الگ لیکن میں غلط تھی۔ دنیا کے سارے مردوں کو شاید ایک ہی چیز سے محبت ہوتی ہے۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”عاکون! ایک غلام ہمیشہ غلام ہی رہتا ہے۔“ اس کا احساس آج تم نے مجھے کروا دیا ہے۔ اس نے آرام سے اپنی شرٹ اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ عاکون نے ایک نظر اس کے برہنہ جسم پر ڈالی اور فوراً ہی جھکالی۔ اس سے اوپر دیکھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ عالیہ اس کے سامنے شرٹ اتارے کھڑی تھی لیکن وہ اپنی نظریں جھکائے اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل رہے تھے جو نیچے عالیہ کے پیروں کو جھگور رہے تھے۔

”عالیہ! یہ جو محبت ہوتی ہے یہ بڑے بڑے سرداروں کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ بڑے بڑے سرداروں کو رونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ دیکھ لو! آج عاکون کو بھی تم نے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ تم جسم کی بات کرتی ہو میری حیثیت تو تمہارے پیروں کو ہاتھ لگانے کی بھی نہیں ہے۔“ اس نے قمیض کے پلو سے عالیہ کے پاؤں پر گرے ہوئے آنسوؤں کو صاف کیا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔

جھوپٹڑے کے باہر اس کا نیزہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے نیزہ اٹھایا اور قبیلے سے باہر نکل کر جنگل میں چلا گیا۔ یہ جنگل خطرناک جانوروں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ لوگ صرف دن کو شکار کے لئے نکلتے تھے لیکن عاکون کی آنکھوں میں خون اتر ا ہوا تھا۔ اسے اپنی جان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ نتائج سے بے پروا ہو کر شکار کھیل رہا تھا۔ عالیہ پوری رات اس کا جھوپٹڑے میں انتظار کرتی رہی لیکن وہ نہیں آیا۔ گاؤں والوں نے اسے نارمل معمول سمجھا لیکن جب بارہ بجے تک بھی عاکون نہ آیا تو قبیلے والے اسے ڈھونڈنے جنگل میں نکل گئے۔ دو گھنٹے کی مسلسل محنت کے بعد گاؤں والوں نے اسے قبیلے کی سرحد سے باہر ایک بڑے میدان میں دیکھ لیا۔ اس کے سامنے شکار ہوئے پرندوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ وہ مسلسل پوری رات تک شکار کرتا رہا اور ابھی بھی وہ تین ہرنوں کو مار کر ان کو ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹا ہوا میدان میں لا رہا تھا۔ میدان میں کم سے کم بھی دوسو کے قریب ہرن پڑے ہوئے تھے۔ اتنا شکار پورا قبیلہ مل کر بھی دو مہینے میں پکڑتا تھا جسے عاکون نے ایک رات میں ہی کر لیا تھا۔ وہ پوری رات میں ایک پل کے بھی نہیں رکا تھا۔ پوری رات عالیہ کی آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں نے اسے سونے ہی نہیں دیا تھا۔

”اوائے عاکون! یہ کیا کر رہے ہو؟ پوری رات سے تم جنگل میں لگے ہوئے ہو۔۔۔ اگر رات کو تمہیں کچھ ہو جاتا تو پھر؟“ سردار نے آگے بڑھ کر عاکون کے ہاتھ سے ہرنوں کی ٹانگیں چھڑانے کی کوشش کی۔

”کچھ نہیں ہوتا سردار! عاکون کی ہڈیاں اتنی نرم نہیں ہیں کہ کوئی بھی جانور اسے چبا سکے۔ آپ قبیلے کے

نوجوانوں کو ساتھ لیکر ان ہرنوں کو لیکر جائیں۔۔۔ مجھے ابھی اور بھی شکار کرنا ہے۔“ عاکون ہرنوں کو گھسیٹتا آگے بڑھ گیا۔

”نہیں عاکون! تم نے اگلے کئی مہینوں کا شکار ایک رات میں ہی کر لیا ہے۔ اب آگے مزید کچھ مت کرو۔۔۔ تم خاموشی سے گھر چلو اور آرام کرو، یہ سارا کام اب ہم کر لیں گے۔“ سردار نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

”نہیں سردار! میرا گھر جانے کو دل نہیں کر رہا ہے، مجھے گھر نہیں جانا ہے۔ مجھے ابھی اور شکار کرنا ہے۔“ عاکون نے ہرنوں کو ڈھیر پر پھینکا اور واپس جنگل کی طرف جانے لگا۔

”عاکون! گھر نہیں جاؤ گے۔“ اسے پیچھے سے عالیہ کی آواز سنائی دی تو وہ ٹھٹک کر رگ گیا۔ عالیہ بھی قبیلہ والوں کے پیچھے پیچھے یہاں تک آگئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ عاکون اس کے بغیر گھر واپس نہیں آئے گا۔ عاکون اس کی وجہ سے گھر چھوڑ کر گیا تھا اور اب واپس بھی اسی کے کہنے پر اسے جانا تھا۔ عالیہ اسے واپس گھر لے جانے آئی تھی۔

”عاکون! چلو گھر چلتے ہیں۔“ عالیہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے پاس آئی اور اس نے عاکون کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”عاکون! اس جنگل میں آج اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں بھی زندہ نہیں رہتی۔ یہ جنگل، یہ قبیلہ اور یہ افریقہ صرف تمہاری وجہ سے میرا ہے۔ تمہارے بغیر میں ایک پل بھی یہاں نہیں گزار سکتی۔ تمہارے علاوہ اس جنگل میں میرا اور کوئی بھی نہیں ہے۔ جس دن تم نے آنکھیں بند کر لیں اسی دن عالیہ بھی مرجائے گی۔“ عالیہ نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور واپس پلٹی۔

”عالیہ! محبت کرتی ہو مجھ سے؟“ عاکون نے اس سے پوچھا۔ وہ واپس ضرور پلٹا لیکن اس نے گھر کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھایا تھا۔ اس کا ہاتھ عالیہ کے ہاتھ میں تھا لیکن وہ مضبوطی سے اپنے قدموں پر کھڑا ہوا تھا۔

”عالیہ! محبت کرتی ہو مجھ سے؟“ اس نے دوبارہ عالیہ سے پوچھا۔

”ہاں کرتی ہوں۔۔۔ سر سے لیکر پاؤں تک تم سے محبت کرتی ہوں۔ ٹھیک ہے؟ چلو گھر چلتے ہیں۔“

اس نے عاکون کے ہاتھ کو جھکا دیکر آگے کی طرف بڑھنا چاہا لیکن وہ ابھی تک اپنی جگہ پر چٹان کی طرح کھڑا

تھا۔

”جب محبت کرتی ہو تو شادی کیوں نہیں کرتی؟“ اس نے ایک اور سوال کر دیا۔

”عاکون! ہر محبت کا اختتام شادی نہیں ہوتا۔۔۔ میں یہاں کی نہیں ہوں، میں افریقہ کی نہیں ہوں بلکہ میں ہندوستان کی ہوں۔“ عالیہ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”اگر یہاں نہیں ہو سکتی تو وہاں چلے جاتے ہیں؟ میں تمہارے ساتھ تمہارے ملک میں چلا جاتا ہوں۔ ہندوستان جا کر تو ہم ایک ہو سکتے ہیں نا؟“ عاکون کی آنکھوں میں پتھر کی سی سختی تھی۔

”نہیں عاکون! نہیں! ہندوستان بہت دور ہے۔“

”عالیہ! ہم ایک بار کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں؟“ عاکون نے اس کی بات کو درمیان سے ہی کاٹتے ہوئے کہا۔

”عاکون! میں مسلمان ہوں، میں ایک خدا کو مانتی ہوں۔ میں جتنی بھی تم سے محبت کرتی ہوں لیکن پھر بھی تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ میرا مذہب مجھے اس چیز کی اجازت نہیں دیتا۔“ عالیہ نے اسکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”مسلمان۔۔۔؟ یہ مسلمان کیا ہوتا ہے؟“ عاکون نے اس سے سوال کیا۔ وہ مسلمان کا لفظ سن کر الجھ سا گیا تھا۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں کبھی یہ لفظ نہیں سنا تھا۔

”عاکون! مسلمان دین اسلام کا پیروکار ہوتا ہے۔ ہم لوگ ایک خدا کی عبادت کرتے ہیں اور ایک ان دیکھے خدا کی عبادت کرتے ہیں جس نے یہ زمین، چاند اور سورج بنائے ہیں۔“ عالیہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”سورج دیوتا تو خود خدا ہیں، اسے کوئی کیسے بنا سکتا ہے؟“ وہ اس کی باتوں سے الجھ گیا تھا۔

”عاکون! سورج دیوتا، جنگل دیوتا، کرنا دیوتا اور میکا ٹو دیوی سب جھوٹے ہیں۔ سورج، چاند، جنگل اور دریا سب کو ایک ہی خدا نے بنایا ہے اور ہم اس خدا کو مانتے ہیں۔ یہ دین اسلام ہے۔ میں مسلمان ہوں اور تم سورج دیوتا کے پجاری ہو، ہماری شادی کبھی نہیں ہو سکتی۔ محبت ضرور ہے تم سے لیکن اس محبت کی خاطر میں اپنا مذہب نہیں چھوڑ سکتی۔“ عالیہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور واپس پلٹ گئی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔

”عالیہ! تم سے زیادہ محبت میں نے کی ہے اور میں تمہارے لئے سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔ سورج دیوتا کو بھی!“ عاکون نے اسے پیچھے سے آواز دی۔ قبیلے کے سارے لوگ عاکون کی بات سن رہے تھے۔ وہ فوراً زمین پر اوندھے لیٹ کر سورج دیوتا سے پناہ مانگنے لگے۔ انھیں لگا عاکون سورج دیوتا کو چھوڑنے کی بات کر کے گستاخی کی ہے اور سورج دیوتا اب انھیں جلا کر بھسم کر دیں گے۔ پورا قبیلہ ہی زمین پر لیٹا عذاب سے بچاؤ کے لئے معافیاں مانگ رہا تھا۔ صرف عالیہ اور عاکون ہی کھڑے ہوئے تھے۔ عاکون آگے بڑھا اور وہ عالیہ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

”عاکون! ایک بار سوچ لو، سورج دیوتا کو چھوڑ دے تو گھر بھی چھوڑنا پڑے گا، سرداری بھی اور قبیلہ بھی۔۔۔ تمہارے اپنے لوگ ہی تمہارے دشمن بن جائیں گے؟“ عالیہ نے قدرے توقف سے کہا۔

”عالیہ! یہ عاکون تمہاری خاطر زندگی چھوڑ سکتا ہے تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے؟“ عاکون کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

”میں تمہارے خدا کو اپنا خدا مان رہا ہوں۔“ عاکون نے ایک ہاتھ اوپر اٹھا کر اونچی آواز میں اقرار کیا۔ پورے قبیلے والے زمین پر سجدے کی حالت میں پڑے کانپ رہے تھے۔ وہ سورج دیوتا کے عذاب کا انتظار کر رہے تھے۔

”عاکون! تم پر سورج دیوتا کا قہر نازل ہوگا۔ تم ایک مشرک عورت کو ہمارے قبیلے میں لے کر آیا ہے۔ تم نے سورج دیوتا کو جھٹلایا ہے۔“ سردار نے چیخنے ہوئے کہا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”ہاں ہاں عاکون! تم دونوں پر سورج دیوتا کا قہر نازل ہوگا۔“ سردار کے پیچھے پیچھے اب باقی لوگ بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

”سردار! سورج دیوتا نہیں ہے بلکہ یہ بھی ہماری طرح ایک مخلوق ہے۔ جس طرح خدا نے ہم سب کو بنایا ہے اسی طرح اس نے سورج کو بھی بنایا ہے۔ اس کا کام صرف روشنی دینا ہے اور بس! اگر سورج دیوتا ہوتا تو روزانہ ایک ہی سمت سے اور ایک وقت پر کیوں نکلتا؟ یہ اگر دیوتا ہوتا تو اپنی مرضی سے کسی بھی طرف سے نکلتا، کبھی آتا کبھی نہ آتا لیکن دیکھ لو یہ روزانہ صبح آتا ہے اور رات کو چلا جاتا ہے۔ کیوں۔۔۔؟ کیونکہ اسے میرے خدا نے حکم دیا ہوا ہے۔“ عالیہ نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز بہت اونچی ہو گئی تھی۔

”عالیہ! میں تمہارے اس خدا پر ایمان لاتا ہوں۔ آج سے میں سورج دیوتا کی عبادت نہیں کروں گا۔“

عاکون نے پر یقین انداز سے کہا۔

”ایک بار اچھی طرح سوچ لو عاکون!! سردار، قبیلہ، جنگل، گھر والے سب کچھ چھوڑنا پڑے گا؟“
عالیہ اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

”عالیہ! محبت کرنے والے کبھی سوچ کر فیصلہ نہیں کرتے، محبوب کے فیصلے ہی سب کچھ ہوتے ہیں۔ محبوب کے فیصلوں پر سر جھکانا ہی محبت ہوتی ہے۔ میں نے آج تک سورج دیوتا، کرنا دیوتا، پتہ نہیں کتنے دیوتاؤں کے آگے سجدہ کیا ہے اور ایک سجدہ تمہارے خدا کو بھی کر دوں گا۔“ عاکون نے ٹھوس لہجے میں کہا۔
”عاکون! میرے خدا کو جب سجدہ کرو گے ناتو پھر باقی تمام سجدوں سے انکار کرنا پڑے گا۔ سجدہ صرف ایک ہی خدا کو کرنا پڑے گا۔“ عالیہ کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ عاکون نے اپنے سر کو جھکا لیا۔ عالیہ نے اسے کلمہ پڑھایا جسے عاکون نے اس کے پیچھے پیچھے دہرایا۔ عالیہ نے کلمے کا اس کی مقامی زبان میں ترجمہ بھی کر کے دیا۔ اس نے اسلام کے آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے بارے میں بھی مختصر بتایا۔ پورے قبیلے والے اب ان کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہ سارے عاکون اور عالیہ پر غصہ کر رہے تھے۔ وہ عالیہ کو مارنا چاہتے تھے جس نے ان کے سردار کو گمراہ کیا تھا لیکن وہ عاکون کے ہوتے ہوئے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ عاکون کا قد ساڑھے چھ فٹ کے قریب تھا۔ انتہائی مضبوط جسم کے ساتھ وہ بہادر بھی تھا۔ اسے کسی سے بھی لڑتے ہوئے ڈر نہیں لگتا تھا۔ مخالف اس کے سامنے ایک ہو یا ایک ہزار وہ فوراً لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا تھا۔ پورا قبیلہ ہی عاکون سے ڈرتا تھا۔ وہ عاکون کے ہوتے ہوئے کبھی بھی عالیہ کو کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔

”ٹھیک ہے میں آج سے تمہارے ساتھ شادی کو تیار ہوں۔ اب قبیلے والوں کے سامنے انہیں گواہ مان کر تمہیں اپنا شوہر تسلیم کرتی ہوں۔“ عالیہ نے اونچی آواز میں کہا۔ وہ عاکون کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔
”کوئی آگ نہیں، کوئی پوجا نہیں، کسی بھی قربانی کے بغیر کیسے شادی ہو سکتی ہے؟“ عاکون نے حیرانگی سے پوچھا۔ اس کے قبیلے میں شادی سات دن تک چلتی تھی۔ مختلف رسومات پوچا، قربانیوں کے بعد کہیں شادی ہوتی تھی۔ جبکہ یہاں تو کہہ دینے سے ہی شادی ہو چکی تھی۔

”ہاں عاکون! ہماری شادی ہو گئی ہے۔ ہمارے مذہب میں صرف چار گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن کے سامنے ہم خدا کا نام لیکر شادی قبول کرتے ہیں۔ کیا تمہیں عالیہ احمد قبول ہے؟“ عالیہ نے اس سے سوال کیا۔

”ہاں! ہاں! مجھے قبول ہے۔ دل و جان سے قبول ہے۔“ عاکون نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”ارے یہ کیسی شادی ہے جو پوجا اور قربانی کے بغیر ہو گئی ہے؟“ اس بار بولنے والا سردار تھا۔

”سردار! ہمارا مذہب ایسا ہی ہے۔ ہمارا مذہب بہت آسان ہے۔ آپ کے دیوی دیوتا صرف اس

جنگل تک ہی محدود ہیں جبکہ اس جنگل کے باہر ہمارا مذہب ہی پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔“ عالیہ نے فخر سے سردار کو جواب دیا۔

”اچھا؟ تو کیا ان گوروں کا مذہب بھی وہی ہے؟“ سردار نے اگلا سوال کیا۔

”نہیں سردار! یہ عیسائی ہیں جبکہ ہم مسلمان ہیں۔ لیکن ہم دونوں ایک ہی خدا کی عبادت کرتے ہیں۔

اس دنیا میں صرف دو ہی بڑے مذہب ہیں جو دنیا کے ایک کونے سے لیکر دوسرے کونے تک موجود ہیں۔ ان میں ایک عیسائی ہیں جبکہ دوسرے ہم مسلمان ہیں۔ ان کا خدا اور ہمارا خدا ایک ہی ہے۔“ عالیہ نے انتہائی سادہ انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ اسے لگا سردار بھی اس کی باتوں میں دلچسپی لے رہا ہے۔ وہ سردار کو مطمئن کرنا چاہتی تھی۔ اگر سردار مطمئن ہو جاتا تو باقی قبیلے والے بھی مطمئن ہو جاتے۔

”اچھا! اگر دونوں کا خدا ایک ہی ہے، دونوں ایک ہی خدا کو پوجتے ہو تو پھر تم گوری چمڑی والوں سے

الگ کیسے ہو؟“ سردار نے پر اشتیاق لہجے میں کہا۔

”سردار! ہمارے پیغام رساں مختلف ہیں۔ گورے چمڑی والوں کے خدا کا پیغام عیسیٰ لیکر آئے اور اس

لئے وہ عیسائی بن گئے۔ جبکہ ہمارے پاس محمد ﷺ آئے اس لئے ہم اُمّتِ محمدی ہیں۔ یہ دنیا بہت بڑی

ہے اس لئے ایک آدمی تو پوری دنیا میں پیغام لیکر نہیں جاسکتا۔ خدا نے بہت سے لوگوں کو پیغام رساں بنایا جن

کو ہم پیغمبر کہتے ہیں۔ جو خدا کا پیغام لیکر ہمارے پاس آتے ہیں۔“ عالیہ پر خیال نظروں سے پورے قبیلے کی

طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ سارے اس کی بات توجہ سے سن رہے تھے۔ عالیہ نے کبھی بھی پانچ مہینوں میں ایک

بار بھی ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ پہلے قبیلے والوں کا اعتماد جیتنا چاہتی تھی۔ اسی لئے وہ پانچ مہینے تک قبیلے

کے سبھی افراد سے محبت سے ملتی رہی۔ اس نے پانچ مہینوں میں قبیلے والوں کا اعتماد جیت لیا تھا۔

”عاکون! میں تمہیں قبیلے کی سرداری سے الگ کرتا ہوں لیکن بحر حال تمہیں قبیلہ چھوڑنے کی ضرورت

نہیں ہے۔ تم دونوں یہاں رہ سکتے ہو۔ ہم تم دونوں پر سورج دیوتا کا قہر ٹوٹا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر عالیہ کا

خدا ہمارے سورج دیوتا سے زیادہ طاقت ور ہوگا تو تم دونوں کو کچھ نہیں ہوگا۔ عالیہ کا مذہب بہت سیدھا اور

آسان ہے۔ ہم مزید اس کے بارے میں جاننا چاہیں گے۔ تم دونوں یہاں رہو اور ہمیں بھی اپنے خدا کے بارے میں بتاتے رہو۔“ سردار نے ہاتھ اٹھا کر اعلان کیا اور قبیلے کی طرف چل پڑا۔ عالیہ اور عاکون بھی گھر کی طرف چل پڑے جبکہ باقی نوجوان عاکون کے کئے گئے شکار کو اٹھا کر گھروں کی طرف لے جانے لگے۔ میں مسلسل بولتے ہوئے تھک گیا تھا اس لئے کچھ پل کے لئے خاموش ہو گیا۔

”دادا! آپ پانی پی لیں اور دو منٹ آرام بھی کر لیں۔ مسلسل بولتے ہوئے آپ کا حلق خشک ہو گیا ہے۔“ میرے پوتے عدنان نے میری طرف پانی کا گلاس بڑھاتے ہوئے کہا۔

میرے سامنے امریکی اور فرانسیسی دونوں سفیر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں پر اشتیاق نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ پروین اور اس کا دادا چونکہ انگلش زبان سے ناواقف تھے اس لئے وہ دوسرے کمرے میں آرام کرنے چلے گئے تھے۔ امریکی سفیر نے ہمیں اپنے گھر میں ہی ایک کمرہ بننے کے لئے دے دیا تھا۔ سفیر صاحب کا ایک نوکران کو وہاں سلا کر آ گیا تھا۔

”باباجی! آپ کی کہانی تو بہت دلچسپ ہے۔ تھوڑی دردناک ضرور ہے بلکہ کافی دردناک ہے لیکن دلچسپ ہے۔ عالیہ کو آخر کار اس کی منزل مل ہی گئی۔ اس بے چاری نے بھی کافی دکھ جھیلے تھے لیکن چلو اچھا ہی ہوا۔“ فرانسیسی سفیر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کی پوری کہانی میں تو آپ کا ذکر ہی نہیں ہے۔ آپ اپنے آپ کو اس کہانی میں کہاں فٹ کرو گے؟“ امریکی سفیر نے میری طرف دیکھا۔

”سرجی! کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ عالیہ کی داستان ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ اس ہیر کی کہانی ابھی آدھی بھی نہیں ہوئی ہے۔ اس بے چاری نے تو بہت درد بہت سی تکلیفیں دیکھی ہیں۔ اس کی کہانی تو بہت لمبی ہے۔“ میرے ماتھے پر ان گنت لکیریں پھیلی ہوئی تھیں۔

”باباجی! پھر باقی کہانی بھی سناؤ نا آدھی رات ہو چکی ہے۔ باقی کی آدھی رات بھی آپ کے نام ہو گئی۔ ہم اب آپ کی کہانی پوری سن کر ہی سانس لیں گے۔“ امریکی سفیر نے پر زور لہجے میں کہا۔

”یار باباجی کے لئے چائے کا تو بولو! بوڑھے آدمی ہیں چائے پینے سے تھوڑے تازہ دم ہو جائیں گے۔“ فرانسیسی سفیر نے کہا تو وہ اٹھ گیا۔ اس نے نوکر کو چائے بنانے کا کہا اور واپس کمرے میں آ گئے۔

”جی باباجی! چائے ابھی تھوڑی دیر تک آ جائے گی۔ آپ کہانی دوبارہ شروع کیجئے۔“ امریکی سفیر

میرے سامنے آکر بیٹھ گیا۔

”جی سر! اب کہانی شروع کی ہے تو ختم کر کے ہی رہوں گا۔“ میں نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا اور دوبارہ کہانی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”عاکون! کیا کہتے تھے میرے پاؤں کو ہاتھ لگانے کی بھی حیثیت نہیں ہے؟ دیکھ لو! آج پوری کی پوری عالیہ ہی تمہاری دسترس میں آگئی ہے۔ کہاں سے شروع کرنا ہے؟“ عالیہ جھونپڑے کے اندر اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی نظریں عاکون کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ سامنے دیکھ رہی تھی لیکن اس بار عاکون نیچے دیکھ رہا تھا۔ عاکون کو عالیہ کی طرف دیکھنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔

”عاکون! اب کیا ہوا یا؟ اب تو میں تمہاری بیوی ہوں۔۔۔ اب کیوں نظریں چرا رہے ہو؟“ عالیہ نے اس کی ٹھوڑی کو پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کیا۔ عاکون کی نظریں عالیہ کے چہرے پر پڑیں تو پھر وہ اپنی نظروں کو ہٹانا ہی بھول گیا۔ وہ اگلے کئی لمحوں تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے رہے۔ وقت ایک ایک لمحہ کر کے گزرتا رہا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر ہی مدہوش ہوتے رہے۔

”عالیہ! تم بہت خوبصورت ہو۔ پوری دنیا میں سب سے زیادہ خوبصورت ہو۔ دنیا کی کوئی بھی اور خوبصورتی تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ تم سب سے منفرد ہو، تم سب سے انوکھی ہو، تم سب سے خوبصورت ہو۔ تمہارے جسم کا ایک ایک حصہ سر سے لیکر پاؤں تک اس پوری کائنات سے بڑھ کر ہے۔ اس عاکون کی واقعی کوئی حیثیت نہیں ہے جو تمہیں ہاتھ بھی لگا سکے۔ ملکیت کا دعویٰ تو کوئی پاگل ہی کر سکتا ہے۔ تم میری سوچ سے بھی زیادہ حسین ہو۔ تمہاری پوجا تو کی جاسکتی ہے لیکن تمہیں حاصل نہیں کیا جاسکتا۔“ یہ کہتے ہوئے عاکون نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور واپس پلٹنے لگا۔

”کدھر میری جان! شادی کی ہے تو اب اتنی آسانی سے کہاں جانے دوں گی؟“ عالیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”عاکون صاحب! تم پوجا کرتے رہنا مجھے تو محبت کرنی ہے۔ بیوی ہوں تمہاری آخر کچھ تو حق میرا بھی بنتا ہے؟ مجھے تو چنگ ٹچنگ والی محبت چاہیے۔“ عالیہ نے شرارت سے اسے آنکھ ماری۔

”ٹچنگ ٹچنگ؟ یہ کیا ہوتا ہے؟“ اسے عالیہ کے انگلیں میں بولے گئے الفاظ کی سمجھ نہیں آئی۔

”ٹچنگ ٹچنگ والی محبت بتائی نہیں جاسکتی دکھا سکتی ہوں۔۔۔ دیکھنی ہے؟“ عالیہ کی آنکھیں شرارت

سے بھری ہوئی تھیں۔

”ہاں ہاں!“ عاکون نے پر اشیاق لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے! تو پھر آنکھیں بند کرو۔“ عالیہ نے اسے آنکھیں بند کرنے کا کہا تو اس نے ایک پل کے لئے عالیہ کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

عالیہ نے ایک ہاتھ اس کے گالوں پر رکھا اور اپنے ہونٹ عاکون کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نرم و نازک ہونٹ عاکون کے ہونٹوں پر جمے ہوئے تھے۔ عالیہ نے ایک پل کے لئے اپنے ہونٹ الگ کئے تو عاکون نے آگے بڑھ کر دوبارہ اس کے ہونٹوں کو جکڑ لیا۔ اس نے ایک ہاتھ عالیہ کی کمر میں ڈالا اور اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کے ہونٹ عالیہ کے ہونٹوں میں پیوست ہو گئے تھے۔ وہ عالیہ کے ہونٹوں کا سارا رس ایک بار میں ہی چوس لینا چاہتا تھا۔ اس نے عالیہ کو انتہائی مضبوطی سے اپنی بانہوں میں جکڑا ہوا تھا۔ عالیہ کا سانس بند ہونے لگا۔ اس نے عاکون کی پسلیوں سے نیچے پیٹ پر ایک زور دار چٹکی کاٹ لی۔

”آہ۔۔۔ تو تو کاٹتی ہے۔“ عاکون کے منہ سے آہ نکل گئی اور وہ پھدک کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا ایک ہاتھ ابھی تک عالیہ کے ہاتھ میں ہی تھا۔

”میری جان! پیار سے تم تو مارنے والے تھے مجھے۔۔۔ میں پانچ فٹ کی ہوں اور تم سات فٹ کے پہاڑ ہو۔ یار! کچھ تو خیال کرو، پیار کرنا ہے تو تھوڑا پیار سے کرو نا۔۔۔ مارو تو مت!“ عالیہ نے اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبایا اور اسے دوبارہ آنکھ ماردی۔

”جانو جی! میرا بھی مرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ عالیہ دوبارہ اس کے نزدیک آگئی۔ اس نے عاکون کے گرد بازو حائل کیا اور اس کے سینے سے لگ گئی۔

”سوری یار! تم خوبصورت ہی اتنی ہو کہ ہر کوئی بہک سکتا ہے۔“

”آہ۔۔۔“ عالیہ نے ایک اور چٹکی کاٹ دی۔

”کوئی اور بہک کر تو دیکھے میں جان نہ لے لوں اس کی! تمہاری بیوی ہوں، صرف تمہیں ہی حق ہے بہکنے کا اور وہ بھی میرے لئے۔۔۔ جس دن کسی اور کی طرف گئے قسم سے اس کو بھی ماردوں گی، تمہیں بھی اور پھر خود بھی مرجاؤں گی۔“ عالیہ کے لہجے میں حد درجہ سنجیدگی تھی۔ عاکون اس سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”کیا ہوا جانو! پاس نہیں آؤ گے؟“ عالیہ اس کی طرف بڑھی تو وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”نہیں یار! تم بہت کاٹتی ہو۔ میں تم سے دور دور ہی اچھا ہوں۔ ہم دور دور سے ہی محبت کریں گے۔“ عاکون چنگی والی جگہ کو سہلانے لگا۔ عالیہ نے اس بار کافی زور سے چنگی کاٹی تھی۔

”ارے! میرے جانو کو درد ہو رہا ہے؟“ عالیہ نے چنگی والی جگہ سے کپڑا ہٹایا اور وہاں اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ عالیہ اس جگہ کو چوسنے لگی۔ عاکون کی جلن سیکنڈ کے ہزار ویں حصے میں ہی ختم ہو گئی تھی۔ وہ بغیر پیئے ہی مدہوش ہو رہا تھا۔ عالیہ کے سلکی بال بار بار اس کے چہرے پر آرہے تھے جسے وہ ہر بار ہٹا کر گردن کی دوسری طرف کر لیتی تھی۔ عاکون کچھ دیر تو ایسے ہی دیکھتا رہا، آخر اس کی برداشت ختم ہو گئی۔ اس نے پیار سے عالیہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کے مکھڑے ہوئے گیسو سنوارنے لگا۔

”باباجی! آپ کہانی بڑے پیار سے سناتے ہو۔۔۔ بڑے مزے لے لے کر سناتے ہو۔“ فرنیسی سفیر نے مسکراتے ہوئے کہا تو میرا تسلسل ٹوٹ گیا۔ میں ماضی سے حال میں آ گیا۔ ان کا ملازم چائے لیکر آ چکا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر چائے کی پیالی پکڑی اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگا۔

”باباجی! آپ واقعی بڑے پیار سے کہانے سناتے ہیں۔ رومانس کی اس طرح منظر کشی کر رہے ہیں جیسے آپ بھی وہاں موجود تھے۔“ اس بار بات کرنے والا امریکی سفیر تھا۔

”بیٹا! میں نے عالیہ کو شروع سے لے کر آخر تک جانا ہے۔ عالیہ کی زندگی کا ایک ایک پل مجھے اپنے ماضی سے زیادہ یاد ہے۔ میں اپنے بیٹوں اور پوتوں پوتیوں کے نام تک بھول سکتا ہوں لیکن عالیہ کی زندگی کا کوئی ایک پل بھی ایسا نہیں ہے جسے میں بھلا سکوں۔ اسی کو تو محبت کہتے ہیں۔“ میری آواز میں ہلکی سی نمی تھی۔

”باباجی! عالیہ سے تو آپ محبت کرتے تھے جبکہ عاکون عالیہ کا شوہر بن گیا تھا؟“ سفیر نے مجھ سے

پوچھا۔

”وہ دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اگر وہ دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے تو ان دونوں کے درمیان آپ کہاں سے آ گئے؟“ امریکی سفیر نے الجھتے ہوئے کہا۔

”سرجی! آپ ہر چیز ایک پل میں ہی جان لینا چاہتے ہیں؟ میں سناتا رہا ہوں۔۔۔ اگر آپ کہتے ہیں تو میں یہ چھوڑ کر سیدھا آخر پر چلا جاتا ہوں؟“ میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”نہیں نہیں، باباجی! آپ پوری تفصیل سے بتاؤ۔ ہمارے پاس پوری رات پڑی ہوئی ہے۔“
فرانسیسی سفیر نے جلدی سے جواب دیا۔

”ویسے عاکون تو اس حساب سے آپ کا رقیب بنتا ہے نا؟ آپ کو عاکون سے تھوڑی بہت جلن تو ہوتی ہو گی؟“ میرے پوتے عدنان نے اس بار سوال کیا۔ اسے عاکون کے کردار سے جلن ہونے لگی تھی۔
”نہیں بیٹا! محبت میں رقیب نہیں ہوتا بلکہ محبت میں صرف محبت ہوتی ہے۔ محبوب کے ساتھ جڑے سبھی لوگ بھی پیارے ہوتے ہیں۔ کیوں۔۔۔ کیونکہ وہ آپ کے محبوب کو پیارے ہوتے ہیں۔ یہ عشق ہے۔۔۔ ہیر رانجھ والا عشق، لیلیٰ مجنوں والا عشق اور آپ کے رومیو جولیٹ والا عشق۔“ میں نے امریکی سفیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”صحیح کہتے ہیں آپ باباجی! جب عشق ہوتا ہے تو پھر اس عشق کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا ہے۔ واقعی محبت میں رقیب نہیں ہوتے۔“ اس کے لہجے میں حد درجہ سنجیدگی تھی۔

”سر! جس محبت میں رقیب ہوتے ہیں اور جہاں رقابت محسوس ہوتی ہے وہاں محبت نہیں ہوتی۔ مجھے عالیہ سے محبت تھی۔ یہ محبت آج بھی ہے، میں نے کبھی رقابت محسوس نہیں کی ہے۔ عالیہ کی زندگی میں آنے والا ایک ایک کردار میرے لئے اسی طرح محترم ہے جیسے وہ عالیہ کے لئے محترم ہو۔ جس نے ہمیشہ عالیہ کی ہی خوشی چاہی تھی۔ میں صرف اسے ہی خوش دیکھنا چاہتا تھا۔“

”داداجی! آپ کہانی سے بھٹک گئے ہو!“ عدنان نے مجھے کندھے سے پکڑ کر ہلایا۔ وہ خود بھی پروین سے بہت پیار کرتا تھا۔ اسے پیار اور محبت والی کہانیاں اچھی لگتی تھیں اور یہ کہانی تو ویسے بھی اس کے دادا کی تھی۔ یہ کہانی تو اس کے دادا دادی کی تھی اس لئے اس کی دلچسپی عروج پر تھی۔

”بیٹا! کہانی سے بھٹک نہیں رہا ہوں بلکہ میں کہانی ہی سن رہا ہوں۔ میرے محبوب کی کہانی ہے نا اس لئے اس کی ایک بات یاد کر رہا ہوں۔“ میں دوبارہ کہانی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

عاکون اور عالیہ کی شادی کے دوسرے دن ہی عالیہ نے عاکون پر محنت کرنی شروع کر دی۔ وہ اسے اسلام کے بارے میں سکھانے لگی۔ وہ کبھی سکول تو نہیں گئی تھی۔ اس زمانے میں سکول صرف بہاولپور شہر میں ہی تھا اور وہ شہر سے ایک دن کی مسافت پر تھا۔ اسے شہر جانے میں ایک دن لگ جاتا تھا۔ عالیہ نے صرف قرآن پاک ہی پڑھا ہوا تھا۔ قرآن پاک پڑھنے کی وجہ سے اسے لکھنا پڑھنا آ گیا تھا۔ اپنے انگریز ماں

باپ ایڈی اور ایلیسا کی وجہ سے اسے انگلش زبان پر بھی پورا عبور حاصل ہو گیا تھا۔ اسے عیسائیت کا بھی کافی علم تھا۔ عالیہ کا علم اسلام کے بارے میں بہت زیادہ وسیع تو نہیں تھا لیکن پھر بھی اسے کافی پتہ تھا۔ وہ اسی اسلام کو آگے عاکون میں منتقل کرنے لگی۔

قبیلے کے دوسرے لوگوں کو بھی اس نئے خدا کے بارے میں جاننے کا شوق تھا۔ وہ بھی عالیہ سے پوچھنے لگے۔ کچھ لوگ عالیہ کے نظریات کے خلاف بھی تھے۔ وہ لوگ عالیہ سے نفرت کرتے تھے لیکن عاکون کی وجہ سے وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ عالیہ کے نظریات سے سب سے پہلے عاکون کی بہن اوکسانہ متاثر ہوئی۔ وہ پہلے ہی عالیہ سے بہت قریب تھی، عالیہ کا اس پر بہت اثر تھا۔ عاکون کے بعد سب سے پہلے اوکسانہ مسلمان ہوئی اور پھر آہستہ آہستہ پورا قبیلہ ہی مسلمان ہونے لگا۔ صرف تین مہینے کے اندر اندر ہی ان کا پورا قبیلہ مسلمان ہو چکا تھا۔ عاکون اور عالیہ کی شادی کے صرف ایک سال کے اندر اندر ہی اسلام عاکون کے قبیلے سے باہر نکل کر نزدیک کے مزید دس بارہ اور قبیلوں تک پھیل چکا تھا۔

عالیہ کو خدا نے اولاد کی نعمت سے محروم رکھا تھا۔ شادی کے ایک سال بعد بھی عالیہ کی گود ہری نہیں ہوئی تھی۔ ان دونوں کے ہاں کوئی بھی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ عاکون کے ماں باپ کو تھوڑی فکر تو ضرور ہوتی تھی لیکن عاکون کو ان چیزوں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ عاکون کو عالیہ کے سوا اور کسی چیز کا ہوش ہی نہیں تھا۔ عاکون کی محبت اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ حالات بالکل ٹھیک چل رہے تھے۔ ہر طرف امن اور سکون تھا۔ افریقہ کے جنگل جنت کی تصویر بن گئے تھے لیکن پھر اچانک جارج (GERORG) آ گیا۔ جارج ہسپانوی نژاد امریکی تھا۔ جارج بہت بڑا شکاری تھا۔ اس نے امیزون کے جنگلات میں بہت شکار کھیلا تھا۔ امریکہ بھی یورپ کے پیچھے پیچھے افریقہ آ گیا تھا۔

جارج نے کمبوڈیا کے جنگلات میں دس سال گزارے تھے۔ جب امریکہ کا لائبریا پر قبضہ ہو گیا تو امریکی شکاری لائبریا سے براہ راست حبشی غلاموں کو پکڑ کر امریکہ لے جانے لگے۔ پہلے اس پورے خطے پر تاج برطانیہ اور فرانس کا قبضہ تھا۔ یہ دونوں ممالک پورے افریقہ پر راج کرتے تھے لیکن پھر امریکہ بھی اس میدان میں کود پڑا۔ لائبریا امریکی کالونی بن گیا۔ پورے افریقہ میں لائبریا ہی واحد امریکی کالونی تھی۔ امریکہ یہاں سے حبشی غلاموں کو پکڑ پکڑ کر امریکہ لے جانے لگا۔ جارج پہلے کمبوڈیا ہوتا تھا۔ امریکہ نے جیسے ہی لائبریا کو اپنی کالونی بنایا اور یہاں سے غلاموں کی تجارت شروع ہوئی تو جارج بھی قسمت آزمائی لائبریا

آگیا۔

جارج سفاک ترین انسان تھا۔ اس نے امریکی فوج کے ساتھ کمبوڈیا میں کئی آپریشن بھی کئے تھے۔ اسے انسانوں کو تڑپا تڑپا کر مارنے میں مزہ آتا تھا۔ وہ پچاس سال کے قریب کی عمر کا آدمی تھا۔ اس کا جسم انتہائی ورزشی تھا۔ اس نے کمبوڈیا میں سینکڑوں باغیوں کو مارا تھا۔ اسے بھی ہلاکوخان کی طرح کھوپڑیوں کے مینار بنانے میں مزا آتا تھا۔ امریکہ کا لائبریا پر قبضہ ہوا اور یہاں سے انسانی غلاموں کی تجارت شروع ہوئی تو جارج نے کمبوڈیا کو خیر آباد کہا اور وہ بھی لائبریا آگیا۔ اس کے پاس اپنا بحری جہاز تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس سو کے قریب ملازم بھی تھے۔ اس کا بحری جہاز ایک پوری فوج کے برابر تھا۔ وہ مون رویا کی بندرگاہ پر پہنچا اور اس نے دریائے سینٹ بال میں جہاز ڈالا اور اوپر کی طرف جانے لگا۔ اس کا ارادہ بھی اوپر جانے کا تھا۔ وہ دریائے کنارے کنارے نظر رکھے جا رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ افریقی دریا سے ہٹ کر اندر گھنے جنگل کی طرف چلے گئے ہیں۔

یورپین شکاریوں کے ڈر سے دریا کے نزدیک سارے ہی قبائلی اندر گھنے جنگل کی طرف چلے گئے تھے۔ سفید فاموں نے لاکھوں کی تعداد میں یہاں سے غلاموں کو پکڑا تھا۔ یہ علاقہ سیاہ فاموں سے بالکل خالی ہو چکا تھا۔ شکاری اوپر شمال کی جانب جاتے تھے۔ جارج بھی شمال کی طرف ہی جا رہا تھا لیکن وہ دریا کے کنارے پر بھی نظر رکھ رہا تھا۔ دریا سے مختلف قسم کے جانور پانی پینے کے لئے آتے تھے۔ ان جانوروں کی وجہ سے جنگل میں مختلف چھوٹے بڑے راستے بنے ہوئے تھے۔ جارج کو ان راستوں کی پہچان تھی۔ اسے معلوم ہو جاتا تھا کہ کونسا راستہ جانوروں کی وجہ سے بنا ہے اور کونسا راستہ انسانی آمد و رفت کی وجہ سے وجود میں آیا ہے۔ جانور عموماً گروپوں کی صورت میں دریا کی طرف آتے تھے جبکہ انسان ایک لائن کی صورت میں آتے بڑھتے تھے۔ انسان ہمیشہ جھاڑیوں میں ایک یا دو آدمیوں کا راستہ ہی بناتے تھے اور وہیں سے ایک ایک کر کے گزرتے تھے جبکہ جانور یہ چیز نہیں سوچتے تھے۔ وہ اندھا دھند ہر چیز کو روندتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ جانوروں کے چلنے پھرنے سے راستے خود بخود بن جاتے تھے۔

”آندریا! جہاز کو روکو! جلدی کرو، جہاز کو ادھر ہی کنارے پر لگاؤ۔“ جارج نے کشتی کے عرشے سے چلاتے ہوئے کہا۔

اس کی آواز کو جہاز کے کپتان کے باہر کھڑے آدمی نے سن لیا اور وہ جلدی سے اندر کیمین میں چلا گیا

تاکہ وہاں کپتان کو بتا سکے۔ جہاز کا کپتان تو جارج ہی تھا لیکن اس کی عدم موجودگی میں آندریا جہاز کا کنٹرول سنبھال لیتا تھا۔ آندریا بھی ہسپانوی نژاد امریکی تھا اور وہ جارج کا نائب تھا۔ آندریا کی عمر ابھی صرف 30 سال کے قریب ہی تھی لیکن وہ اتنی سی عمر میں ہی انتہائی شاطر شکاری ہو چکا تھا۔ غصے اور سفاکیت میں وہ بھی بالکل جارج پر ہی گیا تھا۔ وہ بھی انسانوں کو تڑپا تڑپا کر مارنے میں خوشی محسوس کرتا تھا۔ امریکہ اور یورپ میں چونکہ ایک مناسب قانون تھا اور وہاں یہ سب کچھ نہیں چل سکتا تھا۔ جبکہ یورپی اور امریکی کالونیوں میں ہر چیز کی اجازت تھی۔

ان کالونیوں میں صرف سفید فاموں کے لئے ہی قانون موجود تھے۔ باقی یہاں کے مقامی آبادی کی کیڑے مکوڑوں سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں تھی۔ آندریا اسی لئے امریکہ چھوڑ کر کمبوڈیا چلا گیا تھا۔ وہاں اس نے جارج کے جہاز پر ملازمت کر لی۔ اس کی جوشیلی اور نڈر طبیعت جارج کو بہت پسند آئی۔ وہ کہیں بھی کسی بھی حالات میں ڈرتا نہیں تھا۔ کمبوڈیا کے انتہائی خطرناک ترین جنگلات میں بھی وہ کبھی گھبرایا نہیں تھا۔ بہت جلد ہی وہ ترقی کرتا کرتا جارج کا نائب بن گیا۔ کین کے اندر آنے والے آدمی نے جارج کا پیغام اسے دیا تو آندریا نے جلدی سے جہاز کو روکا اور اسے ایک کنارے پر لگا کر کین سے باہر آ گیا۔ جارج ابھی تک عرشے پر ہی کھڑا ہر کنارے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”آندریا! تم جہاز پر ہی رہنا، میں اپنے ساتھ کچھ لوگ لیکر جنگل کی طرف جاتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے یہاں پر سیافام حبشیوں کا کوئی نہ کوئی قبیلہ ضرور ہوگا۔ مجھے جنگل کے اندر کافی راستے نظر آئے ہیں جو ممکنہ طور پر انسانوں نے ہی بنائے ہوئے ہیں۔ شاید وہ دریا سے پانی بھرنے آئے ہوں۔“ جارج نے اسے وہیں کشتی پر ہی چھوڑا اور خود بیس کے قریب آدمی لیکر کنارے پر اتر گیا۔

وہ آہستہ آہستہ دریا کے ساتھ ساتھ پیچھے کی طرف جانے لگا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک وہ کنارے کے ساتھ ساتھ مختلف جگہوں کی نشان دہی کرتا رہا۔ آخر کار اسے کامیابی مل ہی گئی۔ اسے ایک جگہ مل گئی جہاں اسے انسانی پیروں کے کافی نشانات مل گئے۔ اس نے اس علاقے کا چل پھر کر تھوڑا معائنہ کیا اور پھر واپس جہاز پر آ گیا۔

”کیا ہوا باس! کچھ کامیابی ملی ہے یا آگے کی طرف مزید سفر کرنا ہے؟“ وہ جہاز کے کین میں آیا تو آندریا جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”نہیں! ہمیں ادھر ہی قسمت آزمائی کرنی ہے۔ مجھے بہت سے قبائلیوں کے قدموں کے نشانات مل گئے ہیں۔ کچی بات ہے یہاں اس جنگل میں ہمیں کوئی نہ کوئی قبیلہ ضرور مل جائے گا۔“ جارج نے آندریاس سے کہا اور اس کی خالی کی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”یار! مجھے اس جنگل کا نقشہ دینا۔۔۔ میں ایک بار بار یک بینی سے اس علاقے کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔“ جارج نے اس سے نقشہ مانگا تو آندریاس نے ایک بڑا نقشہ نکال کر دے دیا۔

یہ برطانیہ کا بنایا ہوا نقشہ تھا۔ برطانیہ نے جس جس ملک پر بھی حکومت کی تھی اس نے وہاں کا مقامی نقشہ ضرور بنایا تھا۔ آج تو گوگل ویب اور سیٹلاٹ کی مدد سے پوری دنیا ہمارے سامنے ہے۔ اس وقت یہ سب کچھ نہیں ہوتا تھا۔ انگریز نقشہ نویسوں نے اپنی جانوں پر کھیل کر جنگلوں، صحراؤں اور پہاڑوں کے نقشے پیدل چلتے ہوئے بنائے تھے۔ انگریز افریقہ اور ایمیزون کے شمالی گھنے جنگلوں میں بھی گئے تھے۔ انھوں نے پوری دنیا کا نقشہ بنایا تھا۔ جارج کے پاس بھی ایسا ہی ایک برطانیہ کا بنا ہوا لائبریا کا نقشہ تھا۔ وہ نقشے پر بنے ہوئے مختلف مقامات کا جائزہ لے رہا تھا۔

”بالکل! میرے خیال میں اس جگہ پر ضرور کوئی نہ کوئی انسانی آبادی ہوگی۔“ جارج نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ یہ سینٹ پال دریا سے کوئی 20 کلومیٹر دور ایک نسبتاً اونچی جگہ تھی۔ یہاں درختوں کا گھنپن بھی کافی کم ہو گیا تھا۔

”کیوں آندریاس! کیا کہتے ہو؟ مجھے لگتا ہے ہمیں اس علاقے کو ایک نظر دیکھ لینا چاہیے؟ تمہاری کیا رائے ہے؟“ جارج نے اسکی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں! بالکل، مجھے بھی یہی لگتا ہے۔ ہمیں اس علاقے سے ہی کامیابی مل جائے گی۔ ہمیں اوپر شمال کی طرف جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ آندریاس نے اسکی تائید کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، تو پھر تم جہاز کا ادھر ہی لنگر اٹھا دو۔ ہم آج رات ہی جنگل میں شکار کے لئے نکلیں گے۔“ جارج نے آندریاس کو حکم دیا اور خود نیچے تہہ خانے میں چلا گیا۔

یہاں اس کے سپاہی موجود تھے۔ اسلحہ خانہ بھی کشتی کے نچلے حصے میں تھا۔ جارج نے سپاہیوں کو بھی تیار ہونے کا کہا۔ وہ رات کے دس بجے کے قریب یہاں سے سفر کرنا شروع کر دیتا تو آسانی سے صبح صبح وہاں پہنچ سکتا تھا۔ وہ جگہ، وہ قبیلہ عالیہ اور عاکون کا قبیلہ تھا۔ جارج اور آندریاس میں کشتی ڈالے ان پر حملہ کرنے

کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ وہ صبح صبح ان کے قبیلے پر دھاوا بولنے والا تھا۔ جبکہ وہ سارے ان سے بے خبر اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔

شام کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ عالیہ نے کھانا تیار کر لیا تھا اور وہ اب عاکون کا انتظار کر رہی تھی جو جنگل میں شکار کھیلنے گیا تھا۔ قبیلے والوں نے عاکون کو سردار بنا دیا تھا۔ قبیلے کے سردار نے اپنی سرداری سے دستبرداری کا اعلان کر دیا تھا اور اس نے اپنی جگہ پر عاکون کو سردار بنا دیا تھا۔ پورا قبیلہ ہی مسلمان ہو چکا تھا۔ قبیلے کے اندر ایک چھوٹی سی مسجد بھی بن چکی تھی جس کی امامت قبیلے کے پرانے سردار نے سنبھال لی تھی۔ وہ سرداری چھوڑ کر امامت کی طرف چلا گیا تھا۔ عاکون کی بہن اوکسانہ کی بھی شادی کر دی گئی تھی۔ عالیہ کا دل صبح سے ہی عجیب سا ہو رہا تھا۔ اسے بے چینی محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ اس گھراہٹ کو کوئی نام نہیں دے سکتی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت برا ہونے والا ہے۔ وہ کھانہ بنانے کے بعد کوئی چار مرتبہ جھونپڑی کے دروازے تک آچکی تھی۔ اس نے ایک چکر قبیلے کی باہری حدود تک کا بھی لگا لیا تھا۔ اسے عاکون کی فکر ہو رہی تھی۔ آخر خدا خدا کر کے اسے عاکون کی ایک جھلک دکھائی دی۔ وہ گھر کی طرف ہی آ رہا تھا۔ عالیہ سے رہانہ گیا۔ وہ بھاگتی ہوئی گئی اور عاکون کے گلے سے لگ گئی۔ عاکون نے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک ہرن پکڑا ہوا تھا جسے وہ ہسٹیتے ہوئے گھر کی طرف لا رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے گاؤں کے دوسرے جوان بھی آ رہے تھے۔ وہ عالیہ کو یوں عاکون سے لپٹے دیکھ کر مسکرانے لگے۔

”کیا ہوا عالیہ! تم تو کافی ڈری ہوئی لگ رہی ہو؟“ عاکون نے اس کی کپکپاہٹ محسوس کر لی تھی۔ وہ ایسا ہی تھا۔ اسے عالیہ کی ایک ایک سوچ کا پتہ چل جاتا تھا۔

”عاکون! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ پتہ نہیں کیوں آج میرا بہت دل گھبرا رہا ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ مجھے تمہاری بہت فکر ہو رہی تھی۔“ عالیہ اس کے سینے سے لگی مسلسل بول رہی تھی۔

”ارے یار! مجھے کیا ہونا ہے؟ دیکھ لو تمہارے سامنے بالکل ہٹا کٹا ہوں۔ جس آدمی کے پیچھے تمہارے جیسی محبت کرنے والی عورت ہوا ہے کبھی بھی کچھ نہیں ہوگا۔“ عاکون نے اس کے گرد اپنے بازو حائل کرتے ہوئے کہا۔ اس نے دونوں شکار کئے ہوئے ہرن چھوڑ دئے تھے جسے قبیلے کے دوسرے نوجوان اٹھا کر لے گئے تھے۔

”شکر ہے اللہ کا! آپ خیریت سے گھر واپس آ گئے ہیں۔ آپ بس زیادہ دور مت جایا کریں۔ مجھے آپ کی طرف سے بہت فکر ہونے لگی ہے۔“ عالیہ ابھی تک اس کے سینے سے لپٹی ہوئی تھی۔

”ٹھیک ہے یار! کوشش کروں گا لیکن بحر حال کھانا بھی تو چاہیے ہوتا ہے نا؟ قبیلے سے باہر نہیں جاؤں گا تو کھانا کہاں سے کھائیں گے؟“ عاکون آہستگی سے اس سے علیحدہ ہوا۔ اس نے عالیہ کا چہرہ اوپر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

”عالیہ! میں نے اپنی زندگی پوری گزار لی ہے، مجھے اب موت سے ڈر نہیں لگتا۔ میں جینا چاہتا ہوں تو صرف اور صرف تمہارے لئے تمہاری خوشیوں کے لئے۔۔۔ میں صرف تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم اگر منع کرو گی تو قسم ہے اس عاکون کو اپنی عالیہ کی، میں جھوٹے سے باہر قدم بھی نہیں رکھوں گا۔“ عاکون نے اس کے نرم گالوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں! مجھے تو ویسے ہی تمہاری فکر ہو رہی تھی۔ تم اس قبیلے کے سردار ہو اور تمہارے کندھوں پر سرداری کا بوجھ بھی ہے۔ میں تمہیں گھر میں تھوڑا باندھ کر رکھ سکتی ہوں؟ بس تم صرف اپنا خیال رکھا کرو۔“ عالیہ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور وہ دونوں گھر کی طرف چلنے لگے۔

”عاکون! مجھے سفید فاموں کے حملوں کا ڈر لگا رہتا ہے۔ ابھی پچھلے مہینے ہی اوپری دو قبیلوں میں سفید فاموں نے حملہ کیا تھا اور وہ وہاں سے سبھی نوجوان مردوں اور عورتوں کو اٹھا کر لے گئے تھے۔“ عالیہ نے عاکون کے آگے کھانا رکھا اور اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

عالیہ کبھی بھی عاکون سے پہلے اکیلی کھانا نہیں کھاتی تھی۔ وہ کھانا بنا کر رکھ دیتی تھی اور عاکون کا انتظار کرتی رہتی تھی۔ عاکون جیسے ہی گھر آتا تھا وہ بھی کھانا کھاتی تھی۔ عالیہ سے پہلے قبیلے والے صرف گوشت اور کچھ جنگلی پھل ہی کھاتے تھے۔ عالیہ ان چیزوں کی عادی نہیں تھی۔ وہ عاکون کے ساتھ مون رو یا شہر تک گئی تھی۔ اسے ہندوستان جانے کا راستہ تو نہیں ملا تھا لیکن وہ واپسی پر گندم، سبز مرچ اور کچھ اور سبزیوں کے بیج لے آئی تھی۔ عاکون نے جنگل میں کچھ ہرن شکار کئے تھے۔ انھوں نے مون رو یا میں ہرن کا گوشت بیچ کر یہ سامان خریدا تھا۔ افریقہ میں بارش بہت ہوتی تھی یہاں پانی کی کوئی کمی نہیں تھی۔

عالیہ نے ایک پلاٹ کی زمین سیدھی کر کے وہاں بیج لگا دیے تھے۔ قبیلے میں گندم اور سبزیاں آگئی تھیں۔ گندم کی فصل 5 مہینے میں تیار ہوتی تھی لیکن یہاں افریقہ کی گرمی اور حد سے زیادہ زرخیز زمین ہونے کی

وجہ سے گندم تین تین مہینے میں ہی تیار ہو جاتی تھی۔ قبیلے میں گندم کی ریل بیل ہو چکی تھی۔ عالیہ نے پتھروں کی مدد سے چکی بھی بنائی تھی۔ وہ ایک بڑی کھال کے اوپر ایک پتھر رکھ کر اس کے اوپر گندم کے دانے رکھ کر اسے دوسرے پتھر کی مدد سے کوٹ کوٹ کر آٹا بنا لیتے تھے۔ قبیلے کے سبھی گھروں میں اب گندم کی روٹی بنتی تھی۔ عالیہ نے ایک باڑا بھی بنالیا تھا اور اس میں کافی سارے ہرنوں کو پالنا شروع کر دیا تھا۔ قبیلے والے پہلے مردہ ہرنوں کو ہی سٹور کرتے تھے۔ عالیہ نے پالتو ہرن رکھنے شروع کر دیئے تھے اور وہ ان ہرنوں کا دودھ بھی نکال لیتی تھی۔ ایک سال کے اندر اندر ہی عاکون کا قبیلہ کافی ترقی یافتہ ہو گیا تھا۔ ان کے پاس پانچ سو کے قریب ہرن تھے جن سے کافی دودھ مل جاتا تھا۔ جبکہ وہ اب ذراعت بھی کرنے لگے تھے۔

شکار کے دوران اکثر قبیلے والے مارے بھی جاتے تھے۔ ان کا واسطہ اکثر شیر، چیتے اور جنگلی جانوروں سے پڑ جاتا تھا۔ عالیہ زیادہ سے زیادہ ہرنوں کو پالنا چاہتی تھی تاکہ شکار مکمل طور پر ہی ختم ہو جائے۔ یہاں جنگل میں چراگا ہوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ہرنوں کو پالتو جانوروں کی طرح باڑوں میں پالا جائے اور ان کا دودھ اور گوشت استعمال کیا جائے۔ شکار ختم ہو جاتا تو وہ قبیلے میں محفوظ تھے۔ عالیہ کو قبیلے سے باہر جانا خطرہ لگتا تھا لیکن خطرہ خود چل کر ان کے قبیلے کے پاس آ رہا تھا۔

جارج اور اس کے ساتھ آنے والے سپاہی دریا کے کنارے پر بیٹھے ان کے قبیلے پر حملہ کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ وہ صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی حملہ آور ہونے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ وہ رات کو سفر کرتے اور صبح سے پہلے پہلے ان کے سر پر پہنچ جاتے۔ جارج ان پر رات کو حملہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ قبائلیوں کی نسبت رات ان کے لئے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ سیاہ فام رات کے اندھیرے میں دیکھ سکتے تھے۔ یہ جنگل ان کا جانا پہچانا تھا جبکہ جارج اور اس کے ساتھ آئے ہوئے ساتھیوں کے لئے یہ جگہ انجان تھی۔ اس کے علاوہ انہیں سیاہ فاموں کو مارنا نہیں تھا۔ انہیں سیاہ فام قبائلیوں کو پکڑنا تھا۔ تاکہ انہیں امریکی منڈیوں میں بیچا جاسکے۔ جارج صبح صبح حملہ کرتا تو اس وقت تک قبائلی سو رہے ہوتے۔ وہ آسانی سے سوتے ہوئے قبائلیوں کے سروں پر جاسکتا تھا۔

جارج رات کے دو بجے کے قریب ان کے قبیلے تک آ گیا تھا اور اب اوپر جنگل میں چھپا صبح ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اپنے سارے آدمیوں کو قبیلے کے چاروں طرف پھیلا دیا تھا۔ وہ صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی حملہ کر دیتے۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی کچھ لوگ رفع حاجت کے لئے جنگل کی طرف

آتے۔ ان سب کو بغیر کسی بڑے مسئلے یا شور شرابے کے پکڑ لیا گیا تھا۔ ابھی سورج نکلنے کو آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ ہلکی ہلکی روشنی پھیلنی شروع ہو چکی تھی۔ جارج نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور وہ لوگ قبیلے کی طرف بڑھنے لگے۔

قبیلے کے اندر کوئی سو کے قریب گھر موجود تھے۔ جارج نے پانچ پانچ آدمیوں کے گروپ بنائے اور گھروں میں گھسنے لگے۔ اس نے آدھے لوگوں کو باہر نگرانی کے لئے چھوڑا تھا جبکہ باقی آدھے ایک ایک گھر میں گھس رہے تھے۔ ان کے پاس چھوٹے چھوٹے لوہے کے کڑے تھے جو ایک ہاتھ اور ایک ٹانگ میں لگتا تھا۔ اس سے ہاتھ کو ٹانگ کے ساتھ جکڑ دیا جاتا تھا اور پھر آدمی بے بس ہو جاتا تھا۔ ہاتھ اور ٹانگ جکڑنے کے بعد آدمی حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کپڑے کی مدد سے منہ بھی بند کر دیتے تھے تاکہ کوئی چیخ نہ سکے اور باقی نہ اٹھیں۔ یہ سارا کام آدھے گھنٹے تک چلتا رہا اور اس کے بعد شور ہونا شروع ہو گیا۔ سیاہ فام قبائلی جھونپڑیوں سے باہر آنا شروع ہو گئے اور ان کی جھڑپیں ہونا شروع ہو گئیں۔ جارج اور اس کے تمام لوگ جھونپڑیوں سے باہر نکل آئے اور انھوں نے بلا دریغ قتل عام شروع کر دیا۔ وہ اپنے سامنے آنے والے ہر شخص کو گولی مار رہے تھے۔ دس منٹ کے اندر ہی انھوں نے بیس کے قریب قبائلیوں کو گولی مار دی تھی جن کی لاشیں میدان میں پڑی ہوئی تھیں۔

عالیہ اور عاکون بھی اٹھ چکے تھے۔ عاکون ان سے مقابلہ کرنے لگا۔ اس کا نشانہ بہت اچھا تھا۔ اس نے دوسفید فاموں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا لیکن بہر حال ان کی بندوقوں کے سامنے قبیلے کے بھالے کچھ بھی نہیں تھے۔ عاکون کی قسمت اچھی تھی کہ وہ گولیوں سے بچا ہوا تھا۔ لڑائی نے زیادہ شدت اختیار کی تو جارج کے لوگ مرنے لگے۔ جارج نے اپنے کچھ آدمیوں کو مرتے دیکھا تو وہ پاگل ہو گیا۔ وہ تھوڑا پیچھے ہٹا اور قبیلے کے باہر درختوں کی آڑ لیکر فائرنگ شروع کر دی۔ بھالے تو صرف دس بیس گز سے آگے نہیں جاتے تھے لیکن بندوق کی گولی دودو سو گز تک چلی جاتی تھی۔ ذرا سی دیر میں ہی میدان سیاہ فاموں کی لاشوں سے بھر گیا۔ سیاہ فام قبائلی بھاگ کر جھونپڑیوں میں پناہ لینے لگے۔ ان کے پیچھے ہٹتے ہی جارج ایک بار پھر آگے آ گیا اور اس بار اس نے بھاگنے والے اور چھپے ہوئے قبائلیوں کو پکڑنا شروع کر دیا۔

عاکون ابھی تک پوری جان سے باہر کھڑا لڑ رہا تھا۔ وہ جارج کے آدمیوں کے ساتھ گتھم گتھا ہو کر لڑ رہے تھے۔ جارج نے اسے لڑتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ اسے آسانی سے گولی مار سکتا تھا لیکن اس نے اسے

زندہ پکڑنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ عاکون جیسے جوان اور مضبوط غلاموں کی بہت اچھی قیمت ملتی تھی۔ وہ اسے مار کر اپنا نقصان نہیں کروانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بھی اسے زندہ پکڑنے کا حکم دیا تھا۔ اس لئے اکٹھے دس آدمی اس سے لڑ رہے تھے۔ آخر کار جارج کے آدمیوں نے عاکون پر قابو پا لیا۔ اس کا ایک ہاتھ اور پاؤں کڑے کی مدد سے باندھا گیا اور اسے وہیں پھینک دیا تھا۔ جارج چلتا ہوا اس کے پاس آیا۔ عاکون نے غصے سے اس کی طرف دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ وہ بے بس ہو چکا تھا اور کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

”گڈ بوائے! بہت اچھا لڑتے ہو۔“ جارج نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”خدا کو مانتے ہو؟“ جارج کے کانوں میں آواز آئی اور اس کے چلتے قدم رک گئے۔ اس نے مڑ کر عاکون کی طرف دیکھا۔

”تمہیں انگلش آتی ہے؟“ جارج نے سوال کیا۔

”خدا کو مانتے ہو؟“ عاکون نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے جارج کے سوال کو نظر انداز کر دیا تھا۔

”ہاں مانتا ہوں، میں عیسائی ہوں۔“ جارج نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”عیسائی۔۔۔؟ تم لوگ تو جانوروں کو بھی نہیں مارتے ہو۔۔۔ کیا ہم سیاہ فام جانوروں سے بھی بدتر ہیں؟ ہمارا کیا قصور ہے؟“ عاکون کے پاس ہزاروں سوالات تھے لیکن جارج کے پاس کسی ایک کا بھی جواب نہیں تھا۔

”بچے! یہ بزنس ہے۔۔۔ خالص بزنس، کوئی لڑائی نہیں ہے۔“ جارج نے مسکراتے ہوئے کہا اور عاکون کو ادھر ہی چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

عالیہ بھی پکڑی جا چکی تھی۔ جارج کے آدمیوں نے پورے قبیلے پر قابو پا لیا تھا۔ پورے قبیلے میں چار سو کے قریب لوگ تھے۔ ان میں سے ستر کے قریب لڑتے ہوئے مارے جا چکے تھے۔ جارج کے اپنے بھی دس لوگ اس لڑائی میں مارے گئے تھے۔ اس کا یہ بہت بڑا نقصان ہو گیا تھا۔ عاکون کی بہن اوکسانہ بھی ماری جا چکی تھی۔ جارج نے اڑھائی سو کے قریب جوان مرد اور عورتوں کو اپنے ساتھ لیا اور باقی بہت چھوٹے بچوں اور بوڑھوں کو چھوڑ دیا۔ عاکون کے ماں باپ کو بھی چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ گاؤں کا پرانا سردار لڑتے ہوئے مارا گیا تھا۔ جارج نے قیدیوں کو ساتھ لیا اور سینٹ پال دیا لے آیا جہاں اس کا جہاز کھڑا

تھا۔ اس نے قیدیوں کو جہاز کے تہہ خانے میں رکھا اور دریا کے ساتھ ساتھ کھلے سمندر کی طرف بڑھنے لگے۔ کھلے سمندر میں پہنچتے ہی انھوں نے امریکہ کی طرف سفر کرنا شروع کر دیا۔

مومن رویا کی بندرگاہ سے انھوں نے کافی خوراک خرید لی تھی۔ جہاز کو امریکہ پہنچنے میں دو مہینے لگ جانے تھے۔ جہاز پر اس وقت ساڑھے تین سو 350 کے قریب لوگ سوار تھے۔ جارج نے ان سب کے لئے خوراک کا بندوبست کیا تھا۔ جارج کے اپنے سپاہی سو کے قریب تھے جبکہ اتنی ہی تعداد میں انھوں نے عورتوں کو بھی پکڑا تھا۔ جہاز پر عورت، شراب اور کھانا تینوں چیزیں وافر مقدار میں موجود تھیں۔ جارج اور اس کے سپاہی پچھلے کئی مہینوں سے عورت کے بغیر جنگلوں، پہاڑوں اور سمندروں کی خاک چھان رہے تھے۔ یہاں جب اچانک ان کے پاس اتنی ساری جوان عورتیں آئیں تو وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑے۔

جہاز کے نیچے تہہ خانہ بہت بڑا تھا۔ انھوں نے ایک طرف تمام سیاہ فام غلاموں کو اکٹھا کیا اور دوسری طرف عورتوں کو کر دیا۔ لوہے کی بڑی بڑی زنجیروں کے ساتھ بیس بیس کر کے ان سب کو باندھا گیا تھا۔ زنجیروں کے سرے بحری جہاز کی دیواروں میں لگے کڑوں میں پھنسائے گئے تھے۔ جہاز کے ایک سرے پر مرد جبکہ دوسری سرے پر عورتیں رکھی گئی تھیں۔ درمیان میں کوئی پردہ نہیں تھا۔ وہ لوگ تہہ خانے میں بندھی ہوئی عورتوں پر ہی جھپٹ پڑے۔ بحری جہاز کے تہہ خانے میں ایک درد بھرا شیطانی کھیل چل رہا تھا۔ ان عورتوں کے بھائی، باپ اور شوہر اپنی عورتوں کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر کرب سے رو رہے تھے، چلا رہے تھے لیکن کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اپنی عورتوں کو بچا نہیں سکتے تھے۔ وہ سارے غلام تھے، سیاہ فام۔۔۔ جن کے کوئی بھی حقوق نہیں تھے۔ وہ اپنی عورتوں کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے پاس صرف ایک ہی اختیار تھا اور وہ ان کی آنکھیں تھیں۔ وہ صرف اپنی آنکھیں بند کر سکتے تھے۔ ان سب کی آنکھیں بند تھیں لیکن پھر بھی درد اور اذیت میں کوئی کمی نہیں ہو رہی تھی۔ ان کی بہن، بیٹیوں اور بیویوں کی چیخیں ان کے کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھیں۔ وہ اپنے کان بند نہیں کر سکتے تھے۔

درجنوں کی تعداد میں سفید فام بھیڑیے شراب کے نشے میں دھت شیطانی فعل میں مصروف تھے۔ ساری عورتیں چیخ رہی تھیں اور ان دردندوں کی منیتیں کر رہی تھیں لیکن کسی بھی سفید فام پر ان کی منتوں اور سسکیوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ بحری جہاز کا تہہ خانہ مردوں اور عورتوں کی چیخوں سے گونج رہا تھا۔ ان

سب میں سے صرف دو لوگ ہی خاموش تھے۔ ایک عالیہ تھی اور دوسرا عاکون۔۔۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ عاکون کی اپنی آنکھیں بند نہیں تھیں وہ عالیہ کو دیکھ رہا تھا۔ عالیہ چونکہ سب سے زیادہ خوبصورت تھی۔ وہ سیاہی مائل رنگت کی ضرورت تھی لیکن اس کے حسن میں ایک تیکھا پن موجود تھا۔ وہ جہاز کے کپتان جارج کے ہاتھ میں تھی۔ جارج تھوڑا بوڑھا ضرور تھا لیکن اس کے اندر جوانوں کی طرح پھرتی تھی۔ شراب کے نشے نے اسے جانور بنا دیا تھا۔ وہ جانوروں کی طرح عالیہ پر ظلم کر رہا تھا۔ عالیہ کے جسم کا ایک ایک حصہ درد کر رہا تھا لیکن وہ ضبط کئے ہوئے تھی۔ جارج کو اپنی مردانگی پر بہت ناز تھا لیکن وہ باوجود کوشش کے بھی عالیہ کی ایک بھی چیخ نہ نکلا سکا۔

”سالی! بہت ٹھنڈی عورت ہے تو!“ جارج اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے نفرت سے ایک زوردار لالت عالیہ کے پیٹ پر ماری۔ وہ درد سے دہری ہو گئی لیکن پھر بھی وہ خاموش لیٹی رہی۔

”عالیہ! یہ افریقی سردار ہمیشہ تم سے محبت کرتا رہے گا۔“ جہاز کے دوسرے کونے سے عاکون نے چلاتے ہوئے کہا۔ عالیہ کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ اس کا دل اندر سے کٹ چکا تھا۔

”اوہ! تو یہ ہمارے شہزادے کی شہزادی ہے؟ افریقی شہزادی!“ جارج نے عاکون کی آواز سن لی تھی۔ وہ عاکون کی طرف آ گیا جبکہ اس کے پیچھے عالیہ کے ساتھ اب اس کا نائب آندریا چلا گیا تھا۔ عالیہ کے ساتھ وہی شیطانی کھیل ایک بار پھر شروع ہو چکا تھا۔ شیطان بدل چکا تھا لیکن کھیل وہی تھا۔

”کیوں شہزادے! یہ تمہاری شہزادی ہے نا؟“ جارج عاکون کے سر پر جا کھڑا ہو گیا۔

”تم انسان نہیں ہو، تم لوگ انسان ہو ہی نہیں سکتے۔“ عاکون نے نفرت سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”شہزادے! یہ ظلم تو کچھ بھی نہیں ہے، تم نے ابھی کچھ بھی نہیں دیکھا ہے۔ ایک بار امریکہ پہنچ جاؤ اس کے بعد تمہیں پتہ چلے گا کہ ظلم کیا ہوتا ہے۔“ جارج نے جھومتے ہوئے کہا۔

شراب کا اثر اس پر کافی ہو رہا تھا۔ وہ جھومتے جھومتے اوپر عرشے کی طرف چلا گیا۔ جارج کا نائب آندریا بھی اس کے پیچھے پیچھے اوپر چلا گیا۔ عالیہ اب تیسرے آدمی کے پاس پہنچ چکی تھی۔ وہ زیادہ خوبصورت تھی اس لئے اس کے طلب گار بھی زیادہ تھے۔ اگلے چوبیس گھنٹے تک عالیہ کو مسلسل زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔ باقی عورتیں جہاں تین یا چار مرتبہ ہی زیادتی کا نشانہ بنیں۔ وہاں عالیہ کے ساتھ مسلسل زیادتی ہوتی

رہی۔ اس کے جسم سے جان بالکل ختم ہو چکی تھی۔ وہ چوبیس گھنٹوں میں کئی بار بے ہوش ہوئی۔ وہ لوگ بے ہوش پڑی ہوئی عالیہ کو بھی زیادتی کا نشانہ بناتے رہے۔ جارج دوسرے دن تہہ خانے میں آیا تو عالیہ کی حالت دیکھ کر اس کا پارہ ہائی ہو گیا۔

”اوئے بے غیر تو! اسے مارنے کا ارادہ ہے؟“ جارج نے عالیہ کے اوپر لیٹے ہوئے ایک سپاہی کو زور دار ٹھٹھا مارا۔ وہ سپاہی جارج کی لات کھا کر دوسری طرف لڑھک گیا۔

”بے غیر تو! یہ مر جائے گی۔ یہاں پر سوسے اوپر لڑکیاں موجود ہیں لیکن تم سب اس بے ہوش پڑی لڑکی کے پیچھے پڑے ہوئے ہو!“ جارج نے چلاتے ہوئے کہا۔ اس کے آواز سن کر سارے سپاہی کھڑے ہو گئے۔

اگلے تین دن تک کوئی بھی سپاہی اس لڑکی کی طرف نہیں آئے گا۔ باقی ساری لڑکیاں آپ کے پاس ہیں۔ تم لوگ صبح شام جب چاہو انہیں استعمال کر سکتے ہو لیکن اس لڑکی کے پاس میری اجازت کے بغیر کوئی نہیں جائے گا۔ میں نے ان سب کو زندہ رکھنا ہے۔ یہ زندہ امریکہ پہنچیں گے تو انہیں بیچ کر پیسے ملیں گے جن سے تمہاری تنخواہیں دی جائیں گی۔ مری ہوئی لڑکیوں کے کوئی بھی پیسے نہیں دے گا۔“ جارج نے ایک چھوٹی سی تقریر کی۔

”آندریا! اس لڑکی کو پانی پلاؤ، اس کی مرہم پٹی بھی کرو اور اسے خوراک بھی دو۔ امید ہے کل تک یہ ٹھیک ہو جائے گی۔ اس نے اپنے نائب کو حکم دیا اور جہاز کے ایک کونے کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں ایک نسبتاً کم عمر کی لڑکی زنجیر سے بندھی ہوئی تھی۔ وہ پندرہ سولہ سال کی ایک نوجوان لڑکی تھی۔ دوسرے دن عالیہ کو ہوش آگئی۔ عاکون سویا ہوا تھا۔ عالیہ کے جسم کا انگ انگ درد کر رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں بالکل نیم مردہ سی ہو گئی تھیں۔ اس کے ساتھ بندھی ہوئی ایک لڑکی نے ہلکی سی حرکت کی تو عالیہ کی ٹانگ بھی ہلنے لگی۔ درد کی ایک تیز لہر عالیہ کی ٹانگ میں اٹھی اور اس کی آنکھیں گئی۔ عالیہ کی ہلکی سی کراہ نے ہی عاکون کو جگا دیا۔ اس نے عالیہ کی طرف دیکھا تو عالیہ پہلے ہی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ عاکون کی نظر جیسے ہی عالیہ پر پڑی تو عالیہ نے فوراً اپنی نظر پھیر لی۔ وہ نیچے زمین کی طرف دیکھنے لگی۔ عالیہ کا سب کچھ ہی لوٹا جا چکا تھا۔ وہ اپنی عزت عاکون کی نظروں کے سامنے ہی درجنوں بار لٹا چکی تھی۔

”مجھے معاف کر دینا عاکون! میں اب تمہارے قابل نہیں رہی ہوں۔ میری عزت کو ایک ہی دن میں

درجنوں بار لوٹا جا چکا ہے۔“ عالیہ اس سے اپنی نظریں چرانے لگی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے جسم کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”عالیہ۔۔۔! عاکون کے دل میں تمہاری عزت کبھی بھی کم نہیں ہوگی۔ میں نے تجھ سے عشق کیا ہے۔ ایک بیوی کی حیثیت سے تو تجھے کبھی دیکھا ہی نہیں میں نے۔۔۔ تو پھر آج تیری نظریں کیوں جھک رہی ہیں؟ میرے دل میں آج بھی تمہارے لئے وہی عزت ہے جو پہلے دن تھی۔“ عاکون کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔ مرد بڑے مضبوط ہوتے ہیں اتنی جلدی ٹوٹتے نہیں ہیں۔ ان کے حوصلے چٹانوں کی طرح مضبوط ہوتے ہیں لیکن یہی مرد جب محبت کرتے ہیں تو پھر ٹوٹتے بھی ہیں، بکھرتے بھی ہیں اور روتے بھی ہیں۔ عاکون افریقی شہزادہ تھا لیکن آج عالیہ کی محبت میں ٹوٹ بھی رہا تھا اور بکھر کر رو بھی رہا تھا۔ بحری جہاز کھلے سمندر میں امریکہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ امریکہ کا سفر آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا۔

”عاکون! مجھے میری ماں بچپن میں جنوں پر یوں کی کہانیاں سناتی تھی۔ شہزادی کو دیوا اٹھا کر لے جاتا ہے اور اسے ایک بہت بڑے قلعے میں قید کر لیتا ہے۔ شہزادی کو چھڑانے کے لئے پھر شہزادہ آتا ہے۔ یار! میری کہانی میں شہزادہ پہلے آگیا تھا اور دیوا اب اٹھا کر لے جا رہا ہے۔ میری اس کہانی میں دیو نے شہزادی کے ساتھ ساتھ شہزادے کو بھی اٹھا لیا ہے۔ ہم دونوں ہی سات سمندر پار دیو کے قلعے میں جا رہے ہیں۔ آنے والی زندگی کیسی ہوگی، کتنی اذیتیں اور ہمیں برداشت کرنی ہوں۔۔۔ مجھے اس کا پتہ نہیں ہے لیکن پھر بھی شہزادی دوبارہ تمہارا انتظار ضرور کرے گی۔ بس یار! جہاں بھی رہنا جیسے بھی رہنا، کیسے بھی حالات اور سختیاں ہوں، انہیں برداشت کرنا اور زندہ رہنا۔۔۔ یہ بڑے ظالم لوگ ہیں۔ ان کے نزدیک ہم سیاہ فاموں کی جان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ یہ ایک سیکنڈ بھی نہیں لگاتے مار دینے میں۔ بس تم کوئی بہادری مت دکھانا اور زندہ رہنا۔ خدا ایک بار ہمیں ضرور ملائے گا۔“ عالیہ کی آواز بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گئی۔

اس کا حلق خشک ہو گیا تھا اور کمزوری بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ اس کا پورا وجود کانپنے لگا تھا۔ اس نے اپنے پیروں کو سیدھا کیا اور جہاز کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ساتھ والی لڑکی کو ایک سپاہی نے پکڑ لیا تھا۔ وہ لڑکی بھی ابھی کافی کم عمر تھی۔ اس کی درد بھری چیخیں پورے جہاز میں گونج رہی تھیں۔ عالیہ نے اپنی آنکھیں بند کی ہوئی تھیں لیکن وہ بند آنکھوں کے ساتھ بھی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی۔ لڑکی کی ایک ایک چیخ اس کے کانوں میں دھماکے کر رہی تھی۔ عالیہ نے اپنی آنکھیں کھولیں

اور ایک نظر لڑکی کے چہرے پر ڈالی اور پھر اوپر آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔

”واہ رے میرے مالک! تو نے بڑے بڑے خطرناک جانور پیدا کئے ہیں، وحشی ترین جانور۔۔۔ لیکن اس انسان کو بنا کر پوری دنیا کی وحشت اس کے اندر ڈال دی تو نے۔ واہ رے میرے مالک! جب تو نے انسان بنا دیا تھا تو پھر جانور بنانے کی کیا ضرورت تھی؟“ اس نے ایک خاموش سوال کیا اور منہ پھیر لیا۔

”باباجی! آپ نے تو کمال کر کے رکھ دیا ہے، کہانیاں ایسی بھی ہوتی ہیں؟ یہ تو میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ میں نے تو واقعی صرف جنوں اور پریوں کی کہانیاں ہی سنی تھیں۔ ایسی کہانیاں کبھی نہیں سنی تھی۔ آپ کے ایک ایک لفظ میں سچائی اور درد ہے۔ مجھے معلوم نہیں یہ کہانی آپ کی ہے یا کسی اور کی لیکن جس کی بھی ہے سچی ہے۔“ امریکی سفیر کی آواز نے مجھے خیالات سے باہر نکال دیا۔ میں افریقی پانیوں کی یادوں سے باہر نکل کر کراچی آ گیا۔ رات کے دو بج چکے تھے۔

”باباجی! آپ کو چائے کی طلب ہو رہی ہوگی، میں چائے بناؤں؟“ سفیر نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”نہیں بیٹا! ٹائم بہت ہو چکا ہے، آدھی رات سے اوپر وقت ہو گیا ہے۔ اس وقت تنگ کرنا مناسب نہیں ہے۔“ میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ مجھے چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی لیکن میں اس وقت کسی کو زحمت دینا نہیں چاہتا تھا۔

”ارے داداجی! آپ کیسی بات کر رہے ہو؟ میں ایک منٹ میں ہی چائے بنا کر لے آتا ہوں۔ آپ بس اپنی کہانی کو ایک منٹ بڑیک لگالیں۔“ امریکی سفیر کا ملازم بھی ہمارے پاس ہی بیٹھا کہانی سن رہا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور بچن میں چائے بنانے کے لئے چلا گیا۔ ہم سب خاموش بیٹھے چائے کا انتظار کرنے لگے۔

”باباجی! میں آپ کو اور آپ کی پوری فیملی کو فرانس کی شہریت دلا سکتا ہوں۔ آپ جیسے لوگوں کی یورپ کو ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ کسی بھی ملک نے آپ کی قدر نہیں کی ہے لیکن ہمارا ملک فرانس آپ کی قدر کرے گا۔ آدھے سے زیادہ افریقہ پر ہمارا قبضہ رہا ہے۔ لائبریا، سیرالیون اور گینیا پر آج بھی ہمارا کافی اثر و رسوخ ہے۔ ہم آپ کو عالیہ اور عاکون کے قبیلے تک لے کر جائیں گے۔“ فرانسیسی سفیر نے پر جوش لہجے میں کہا۔ وہ میری طرف پر امید نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”باباجی! آپ کے باپ دادا تو فرانسسی ہی تھے نا؟ اس حساب سے آپ کو فرانس میں زیادہ عزت ملے گی۔“ اسکے لہجے میں امید جھلک رہی تھی۔

”نہیں بیٹا! میرے باپ دادا بے شک فرانسسی تھے لیکن میں امریکی ہوں۔ میرا گھر میرا خاندان میرا سب کچھ ہی تو امریکہ میں ہے۔ میں تو اب بس واپس اپنے گھر جا رہا ہوں۔ لائبریا اور اس کے جنگلات میں عالیہ نے کچھ عرصہ ضرور گزارا تھا لیکن وہ لائبریا کی تو نہیں تھی، وہ تو بہا واپور کے صحراؤں کی شہزادی تھی۔ وہ سرانیکی ہیر تھی جو مجھے امریکہ میں ملی تھی۔ میرے ساتھ اس کی ساری یادیں تو امریکہ میں تھیں۔ میں نے لائبریا جا کر کیا کرنا ہے؟ مجھے فرانس سے بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ میں نے اپنے پوتے عدنان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ میرے پاس ہی بیٹھا میری کہانی سن رہا تھا۔

”باباجی! امریکہ کے لئے آپ کا ویزہ پکا ہے۔ دنیا کی کوئی بھی طاقت اب آپ کو امریکہ جانے سے نہیں روک سکتی۔“ امریکی سفیر نے پر یقین انداز سے کہا۔

”سر! کیا آپ صحیح کہہ رہے ہیں؟ کیا مجھے امریکہ کا ویزہ مل جائے گا؟“ عدنان ویزے کا سن کر اچھل پڑا۔ اسے امریکی سفیر کے کہے گئے الفاظ پر یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔

”بیٹا! ویزہ تو آپ سب کا پکا ہے، باقی آگے آپ کی مرضی ہے کہ آپ امریکہ جانا چاہتے ہو یا نہیں۔“ سفیر نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اوہ۔۔۔ اوہ سر! بہت بہت شکریہ سر! آپ کی بہت بہت مہربانی آپ نے۔۔۔ آپ نے۔۔۔ ہم سب پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔“ عدنان کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے شکریہ ادا کرے۔ اس کے منہ میں جو بھی آ رہا تھا وہی کہہ رہا تھا۔ ملازم چائے بنا کر لے آیا تھا۔ اس نے سب کو چائے کا ایک ایک کپ پکڑا یا اور دوبارہ قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

”جی باباجی! آپ چائے پیئیں اور ساتھ میں کہانی شروع کر دیں۔ ہمیں عالیہ اور عاکون کی زندگی کی بقیہ حالات جاننے کا اشتیاق ہے۔“ امریکی سفیر نے چائے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ کمرے میں موجود تمام افراد میری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

”سر! میں امریکی ریاست ٹیکس (TEXAS) کا رہنے والا ہوں۔ میری پیدائش (AUSTIN) آسٹن شہر سے شمال مغرب کی طرف تقریباً اسی 80 کلومیٹر دور برنٹ (BURNET) میں ہوئی تھی۔

برنٹ گاؤں بچانان (BUCHANA) جھیل کے کنارے پر آباد ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اب شاید وہ شہر بن چکا ہوگا۔ اس وقت وہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ گاؤں میں تقریباً سو کے قریب گھر تھے جبکہ آبادی پانچ سو کے قریب قریب تھی۔ ہمارے گاؤں کی ساری کی ساری آمدنی کا انحصار زراعت پر تھا۔ ہم لوگ کپاس، گندم، مکئی، آلو اور دیگر دوسری سبزیوں کی کاشت کرتے تھے۔ ہمارے دادا اٹھارہویں صدی سے بھی پہلے امریکہ آکر آباد ہو گئے تھے۔ وہ فرانسیسی بحریہ کے فوجی تھے۔

یورپ افریقہ، جنوبی امریکہ اور ایشیا کے مختلف ملکوں پر قبضہ کر رہا تھا۔ اس زمانے میں یورپ کے تین ملک ہی سب سے طاقتور تھے۔ برطانیہ پہلے نمبر پر تھا۔ اس کی حکومت عرب ممالک، ایشیاء اور آسٹریلیا پر تھی۔ سپین پورے جنوبی امریکہ پر قابض تھا جبکہ فرانسیسیوں کے ہاتھ میں افریقی ممالک آئے تھے۔ آدھے سے زیادہ افریقی ممالک پر فرانس کا قبضہ تھا۔ ایک طویل اور کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ حکمرانوں کا لالچ اور اقتدار کی ہوس طویل سے طویل تر ہوتی جا رہی تھی۔ سپاہی ایک ملک سے دوسرے ملک پر حملہ کر رہے تھے۔ میرے دادا بحریہ کے ایک بڑے افسر تھے۔ انھوں نے افریقہ میں بہت سی جنگیں لڑی تھیں۔ کیریبین سمندر (CARIBBEAN) کے اندر ایک چھوٹے سے جزیرے پر حملے کے دوران انھیں بہت زیادہ مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

جزیرے کے مقامی قبائلی بہت طاقتور تھے۔ ان کے پاس بارود بھی تھا۔ یہ خلاف توقع بات تھی۔ اس زمانے میں بارود صرف یورپ کے پاس ہی تھا۔ اسی کی مدد سے ہم نے پوری دنیا پر قبضہ کیا تھا۔ لیکن اس جزیرے کے پاس بارود کا کافی ذخیرہ موجود تھا اور انھیں بارود کے استعمال کا بھی پتہ تھا۔ شاید یورپ کا کوئی بھٹکا ہوا جہاز ان کے ہاتھ لگ گیا ہو۔ جہاز کے کچھ سپاہیوں نے شاید جزیرے کے باسیوں کی مدد کی ہو اور انھیں بارود دے دیا ہو۔ اس زمانے میں سونا ہی سب سے بڑی اور یونیک کرنسی تھی۔ سونے کی چمک حکمرانوں کو بھی لالچی بناتی تھی اور سپاہیوں کو بھی۔ جزیرے کے باسیوں نے سونا دیکر ہی بارود اور اس کا استعمال سیکھا ہوگا۔

میرے دادا کو خلاف توقع بہت بڑی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور ان کا جہاز تباہ ہو گیا تھا۔ جہاز پر سوار سارے سپاہی سمندر میں ڈوب کر مر گئے۔ میرے دادا کی قسمت اچھی تھی کہ انہیں ایک لکڑی کا تختہ مل گیا اور وہ اس پر دو تین دن تک مسلسل تیرتے تیرتے آخر کار امریکی ریاست ٹیکساس کے ساحل پر پہنچنے میں کامیاب

ہو گئے۔ یہاں اس وقت امریکی حکومت تھی۔ امریکہ میں افراتفری کا کوئی ماحول نہیں تھا۔ یہ علاقہ مکمل طور پر پرس امن تھا۔ میرے دادا ساحل پر ہی کوئی مہینہ بھر کسی فرانسیسی جہاز کا انتظار کرتے رہے لیکن پھر ان کا ارادہ فرانس واپس جانے سے بدل گیا۔ انھیں امریکی پرس امن ماحول پسند آ گیا اور انھیں جنگ سے نفرت ہونے لگی۔ انھوں نے ساحل چھوڑا اور برنٹ گاؤں میں آ گئے۔ میرے دادا نے برنٹ میں کچھ زمین لیکر کاشت کاری شروع کر دی۔ چونکہ وہ بحریہ کے افسر تھے اس لئے ان کے پاس خالص سونے کے میڈل موجود تھے جو ان کی وردی کے اوپر لگے ہوئے تھے۔

اس زمانے میں میڈل خالص سونے یا چاندی کے بنائے جاتے تھے۔ میرے دادا کے پاس ایسے کافی میڈل موجود تھے۔ چونکہ وہ ان کی وردی کے اوپر لگے ہوئے تھے اس لئے پورا جہاز تباہ ہونے کے باوجود وہ بچ گئے تھے۔ دادا نے ان میڈلز کو بیچ کر کچھ زمین خرید لی۔ اس وقت زمین انتہائی کم قیمت پر مل جاتی تھی۔ میرے دادا نے شروع میں دس ایکڑ زمین خریدی تھی۔ انھوں نے اس پر مکئی اور گندم کاشت کی۔ خدا نے ان کے کام میں کافی برکت دی۔ وہ فصل کے ساتھ ساتھ جانور بھی پالنے لگے۔ اگلے دس بارہ سالوں میں وہ برنٹ کے بڑے زمینداروں میں شمار ہونے لگے۔ انھوں نے مزید زمین خریدی۔ 10 ایکڑ سے زمین دوسو ایکڑ تک جا پہنچی۔ دادا کے گزرنے کے بعد میرے والد نے ان کی جگہ سنبھالی اور زمیندارے کے کام کو بھی آگے تک لے گئے۔ ہماری زمین 200 ایکڑ سے 800 ایکڑ تک چلی گئی۔ کھیتوں پر کام کے لئے مزدور تھے اس لئے ابو نے سیاہ فام غلام خریدنے بھی شروع کر دیئے۔ ان کے پاس ستر سیاہ فام غلام تھے جن میں تیس عورتیں بھی تھیں۔

ہمارا گھر پورے گاؤں میں سب سے بڑا تھا جو کہ دو ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا۔ یہ بہت بڑی حویلی تھی۔ ہم تین بھائی اور ایک بہن تھے۔ میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا۔ بڑے بھائی کا نام فیلیکس تھا اور ان کی عمر 30 سال کے قریب تھی۔ ان سے چھوٹے بھائی کی عمر ستائیس سال تھی اور ان کا جان جیکسن تھا۔ جبکہ میری بہن کی عمر اکیس سال تھی۔ اس کا نام ازبیل تھا۔ میرے دونوں بڑے بھائیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ بڑے بھائی کا ایک چھ سالہ بیٹا بھی تھا جبکہ اس سے چھوٹے بھائی کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ میری عمر اس وقت 18 سال تھی۔ میں اور میری بہن ازبیل دونوں غیر شادی شدہ تھے۔ میری والدہ ڈیانا ایک گھریلو خاتون تھیں۔ ابا کی رگوں میں ایک فوجی کا خون تھا اس لئے وہ بڑے سخت انسان تھے۔

میرے دونوں بھائی بھی بالکل ابا بلکہ دادا پر گئے تھے۔ ہمارے غلاموں کی ان کو دیکھ کر جان نکل جاتی تھی۔ وہ سارے غلاموں کے معاملے میں انتہائی سفاک ثابت ہوئے تھے۔ میں اور میری بہن ازبلا پورے گھروالوں سے بالکل الٹ تھے۔ ازبلا تو لڑکی تھی اس لئے اس کا دل قدرتی طور پر نازک تھا لیکن میں بھی کافی نرم دل کا مالک تھا۔ مجھ سے کسی کے آنسو نہیں دیکھے جاتے تھے۔ مجھ سے کسی کی بے بسی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ ابا یا بڑے بھائیوں میں سے کوئی جب اپنے غلاموں پر ظلم کرتے تھے، انہیں چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر بڑی بڑی سزائیں دیتے تھے تو میں زبردستی احتجاج کرتا تھا۔ میں اپنے بھائیوں کو منع کرتا تھا۔ بھائی الٹا مجھ سے لڑنے لگ جاتے تھے۔

شروع شروع میں تو ابا برداشت کرتے رہے لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ مجھے ڈیرے کے کام سے دور کرنے لگے۔ مجھے ویسے بھی زراعت کے کام سے نفرت تھی۔ مزدوروں پر حد سے زیادہ ظلم مجھ سے برداشت ہی نہیں ہوتا تھا۔ ابا نے مجھے زراعت کی بجائے پڑھنے کی طرف لگا دیا۔ اس زمانے میں ہمارے گاؤں میں یا اس کے آس پاس کوئی بھی سکول موجود نہیں تھا۔ ابا نے ایک استاد کو مستقل ملازم رکھ لیا۔ وہ مجھے اور میری بہن کو گھر میں ہی پڑھانے لگا۔ میرے ابو کے دوست کی بیٹی فلورین میری ہم عمر تھی۔ ہماری ایک دوسرے سے بہت دوستی تھی جو بچپن سے ہی چلتی آرہی تھی۔ ابو نے ازبلا کی منگنی کر دی تھی۔ میری بات بھی فلورین کی نسبت سے طے ہو گئی تھی۔ ابو اس سال کی کپاس کی فصل اٹھاتے ہی ہم دونوں بہن بھائی کی اکٹھی شادی کر دینا چاہتے تھے۔ کپاس کی فصل ابھی تازی تازی ہی بیجی گئی تھی۔ اس بار ہم نے بہت زیادہ ایکڑ کپاس بیجی تھی۔ ہمارے پاس غلام تھوڑے تھے۔ 70 غلاموں میں سے پانچ غلام ہمارے گھر میں کام کرتے تھے جبکہ 5 غلام ہی دوسرے جانوروں کے لئے کام کرتے تھے۔ پیچھے ساٹھ غلام بچتے تھے جبکہ تیس کے قریب ہمیں مزدور بھی مل جاتے تھے۔ یہ بہت تھوڑے تھے۔

ابو نے گندم کی فروخت سے کافی پیسے اکٹھے کئے تھے۔ وہ مزید دس غلام خریدنا چاہتے تھے۔ ان کے پاس 20 ہزار کے قریب ڈالر موجود تھے۔ یہ آج کے دور کے 50 لاکھ ڈالر کے برابر رقم تھی۔ اس زمانے میں ایک اوسط درجے کا غلام 400 ڈالر کا مل جاتا تھا۔ چار سو ڈالر آج کے ایک لاکھ ڈالر کے برابر ہے۔ یہ پاکستانی ایک کروڑ روپیہ بنتا ہے۔ یہ میں 1850ء کی دہائی کی بات کر رہا ہوں۔ اس وقت سیاہ فام غلام کی قیمت انتہائی ٹاپ پر تھی۔ جبکہ سترہویں صدی میں وہی غلام پچاس پچاس ڈالر کے مل جاتے تھے۔ انیسویں

صدی کے وسط میں پورے امریکہ میں صنعتی انقلاب آیا ہوا تھا۔ امریکہ میں مزدور ملتا ہی نہیں تھا۔ غلام کا کاروبار اسی لئے انتہائی تیزی سے اوپر اٹھا تھا کیونکہ سیاہ فاموں کی قیمت حد درجہ بلند تھی۔ ایک غلام سال بھر کام کر کے سوڈا لریٹک کما کے دے دیتا تھا۔ اس حساب سے ایک غلام پانچ سال کی مدت میں اپنی قیمت خرچے سمیت نکال دیتا تھا۔

ابومزید دس غلام خریدنا چاہتے تھے۔ ٹیکسس میں غلاموں کی سب سے بڑی منڈی اس دور میں کورپس کرسٹی (CORPUS-CHRISTI) میں لگتی تھی۔ یہ بہت چھوٹا سا شہر تھا جو ٹیکسس کے تین بڑے اور مرکزی شہروں آسٹن، سین انٹونیو اور ہیوسٹن کے تقریباً درمیان میں لگتا تھا۔ یہ کیربین سی (CARIBBEAN) کے سمندر پر ایک بڑی بندرگاہ تھی۔ اس بندرگاہ کو تین شہروں کے علاوہ دریائے ریوگرانڈے (RIOGRANDE) بھی لگتا تھا۔ تین ہزار کلومیٹر سے زائد کی لمبائی رکھنے والا یہ دریائے امریکہ کا چوتھا بڑا دریا تھا۔ اس زمانے میں ساری نقل و حمل دریاؤں میں کشتیوں کے ذریعے ہوتی تھی۔ گھوڑا گاڑیاں یا نیل گاڑیاں بھی تھیں لیکن دریا میں کشتیوں کے ذریعے سفر بہت آسان تھا۔ ہمارے گاؤں کے پاس سے بہنے والا دریا دریائے کولوراڈو (COLORADO RIVER) بھی اڑھائی ہزار کلومیٹر لمبا دریا تھا۔ میرے والد غلاموں کو خریدنے کے لئے کورپس گئے تو میں بھی ان کے ساتھ ہی ہولیا۔ ابو کے ساتھ پانچ اور ملازم بھی تھے۔ ہم بیل گاڑیوں کی مدد سے آسٹن پہنچے اور پھر یہاں سے ایک بحری جہاز میں سوار ہو گئے۔ بحری جہاز ہمیں دریائے کولوراڈو میں گزارتا ہوا ماتا گوردا کی بندرگاہ پر لایا اور پھر یہاں سے ہم ایک اور بحری جہاز میں بیٹھے اور سمندر میں سفر کرتے کرتے کورپس کرسٹی پہنچ گئے۔

ہم نے ایک سرائے میں دو کمرے لئے، ایک کمرے میں ابو اور میں تھے جبکہ دوسرے کمرے میں ہمارے ملازم آرام کرنے لگے۔ ہم شام کو شہر میں پہنچے تھے۔ اس رات ہم نے سرائے میں آرام کی اور صبح تازہ دم ہو کر بندرگاہ پر لگی ہوئی منڈی میں پہنچ گئے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار اتنا لمبا سفر کیا تھا۔ ہمیں گاؤں سے یہاں تک پہنچنے میں دس دن لگے تھے۔ ہم اوپر سے نیچے کی طرف سفر کر رہے تھے اس لئے ہمیں کم وقت لگتا تھا۔ واپسی کا سفر دریائے پانی کے بہاؤ کی مخالف سمت میں تھا۔ اس لئے واپسی 15 دن لگ جاتے تھے۔ آج کے دور میں یہی سفر صرف تین گھنٹے کا تھا۔ آج کے دور میں انسان نے بہت ترقی کر لی ہے ورنہ اس زمانے میں ایک گھنٹے کا سفر طے کرنے میں ہمیں پانچ پانچ دن لگ جاتے تھے۔ میں ابو کے ساتھ منڈی آ

گیا۔

منڈی بندرگاہ کے ساتھ ساتھ کوئی تین کلومیٹر تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں پر ایک ترتیب کے ساتھ کوئی دو سو کے قریب بحری جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز تھے۔ جہازوں کے اندر سینکڑوں کی تعداد میں زنجیروں سے بندھے سیاہ فام غلام کھڑے تھے۔ خریدار جہاز کے اندر جاتا تھا اور اپنے لئے غلام پسند کرتا تھا۔ اس کی قیمت طے کرتا تھا اور اگر سودا طے پا جاتا تو بندرگاہ پر موجود انتظامیہ کے ایک بہت بڑے ہال میں لایا جاتا تھا۔ یہاں پر آگ کی مدد سے غلام کے کندھے پر اس کا نمبر کندھا جاتا تھا اور پھر اسی نمبر کے حساب سے اس کے کاغذات تیار کئے جاتے تھے۔ خریدے گئے غلام کو باقاعدہ مالک کے نام پر ٹرانسفر کیا جاتا تھا۔ امریکی حکومت ہر غلام پر 50 ڈالر کے حساب سے ٹیکس وصول کرتی تھی۔ اسی ٹیکس کی مدد سے بندرگاہ کا پورا انتظام چلتا تھا اور امریکہ کی مرکزی حکومت کو بھی ادائیگی کی جاتی تھی۔

یہ ایک نمبر کام تھا اور ایک نمبر طریقے سے ہی ہوتا تھا۔ اس میں مالک کو تو سبھی اختیارات حاصل تھے۔ بس غلام کے پاس سوائے مرنے کے اور کوئی اختیار نہیں تھا۔ مالک انہی کاغذات کی مدد سے غلاموں کو آگے بھی بچھ سکتا تھا۔ بندرگاہ پر ایک ترتیب سے بحری جہاز لنگر انداز تھے۔ ہم ایک جہاز میں داخل ہوتے اور غلاموں کو دیکھ کر پھر دوسرے جہاز کی طرف چلے جاتے۔ ابو کے پاس پیسے تو کافی زیادہ تھے لیکن صرف دس غلام ہی خریدنے آئے تھے۔ اس سال کے لئے ہمیں بس اتنے ہی غلام کافی تھے۔ قطار میں لگے ہوئے انہی بحری جہازوں میں سے ایک بحری جہاز میں عالیہ اور عاکون بھی موجود تھے۔ وہ دونوں امریکہ پہنچ چکے تھے۔ عالیہ اور عاکون کا جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز تھا۔ جارج اور اس کا نائب آندر یا دونوں آنے والے امریکی خریداروں کو اپنے غلام دکھا رہے تھے۔ یہاں پر تقریباً ہر غلام ہی تھوک کے حساب سے فروخت ہوتا تھا۔ جارج اور آندر یا نے اپنے تمام غلاموں کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔

ایک درجے میں چالیس سال سے اوپر کے سیاہ فام غلام تھے اور ان کی قیمت کافی کم تھی۔ ایک مزدور کی قیمت تین سو کے قریب تھی۔ دوسرے درجے میں عورتیں تھیں اور ان کی قیمت تھوڑی سی زیادہ تھی۔ جبکہ تیسرے اور آخری درجے میں نوجوان غلام تھے جن کی قیمت کافی زیادہ تھی۔ جارج نے عالیہ کو ان درجوں سے الگ کیا ہوا تھا۔ چونکہ وہ باقی تمام سیاہ فام عورتوں سے زیادہ خوبصورت تھی اس لئے جارج نے اس کی قیمت بھی ڈبل رکھی ہوئی تھی۔ عالیہ کو انگلش بھی آتی تھی اس لئے جارج کو امید تھی کہ وہ عالیہ کی ڈبل قیمت

وصول کر لے گا۔ عاکون کو بھی علیحدہ رکھا گیا تھا اور اس کی قیمت بھی دوسرے غلاموں سے 100 ڈالر زیادہ تھی۔

جارج نے اب تک کوئی 50 کے قریب غلام فروخت کر دیئے تھے لیکن ابھی تک عالیہ اور عاکون نہیں بکے تھے۔ آنے والے زیادہ تر گاہک کم پیسوں میں زیادہ سے زیادہ غلام خریدنے کی فکر میں ہوتے تھے۔ انہیں عاکون اور عالیہ دونوں پسند تو آتے تھے لیکن ان کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ آخر کار عاکون کو خریدنے کے لئے ایک خریدار آ ہی گیا۔ اس کا نام مارکوس تھا اور وہ ممفس سے آیا تھا۔ ممفس امریکی ریاست ٹینیسی کا مرکزی شہر ہے۔ اسے 1819ء میں بنایا گیا تھا۔ ممفس امریکہ کی تین ریاستوں آرکنساس، مسیسیپی اور ٹینیسی کو لگتا ہے۔ دونوں ریاستوں کی نگریم ممفس شہر سے لگتی ہیں۔ ممفس شہر مسیسیپی دریا کے کنارے پر آباد ہے۔ مسیسیپی دریا تینوں ریاستوں کے درمیان سرحد کا کام کرتا ہے۔ یہ امریکہ کے چند بڑے دریاؤں میں سے ایک ہے۔ مسیسیپی دریا امریکی ریاست مینی سوٹا سے نکلتا ہے اور امریکہ کی دس ریاستوں سے ہوتا ہوا گلف آف میکسیکو کے سمندر میں جا کر گرتا ہے۔ 3730 کلومیٹر لمبا یہ دریا پاکستان کے سب سے لمبے دریا دریائے سندھ سے بھی ڈیڑھ سو کلومیٹر لمبا ہے۔ جبکہ پانی کا حساب لگائیں تو یہ دریائے سندھ سے کوئی دس گنا زیادہ بڑا دریا ہوگا۔ یہ امریکہ کے تیس لاکھ مربع کلومیٹر کے رقبے کو سیراب کرتا ہے جبکہ دریائے سندھ زیادہ سے زیادہ دو لاکھ مربع کلومیٹر کو ہی سیراب کرتا ہے۔ ممفس شہر اسی دریا کے کنارے پر بنایا گیا تھا۔ اسے 1819ء میں خاص طور پر افریقی غلاموں کی تجارت کے لئے بنایا گیا تھا۔ مسیسیپی دریا کی وجہ سے یہ علاقہ بہت زرخیز تھا اور کپاس کی کاشت کے لئے یہ پورا علاقہ آئیڈیل تھا۔ یہاں غلاموں کی بہت زیادہ فروخت تھی۔ اس زمانے میں زیادہ تر بحری جہاز اوپر نیویارک جاتے تھے یا پھر نیچے گلف آف میکسیکو میں آتے تھے۔ امریکہ کی جنوبی ریاستوں کو گلف آف میکسیکو کی بندرگاہ ہی لگتی تھی جبکہ نیویارک کا سفر مہینوں سے بھی اوپر تھا۔

امریکہ کی وسطی ریاستیں ساحل سے بہت دور تھیں۔ یہاں کے مقامی زمینداروں کو غلام خریدنے کے لئے بہت دور جانا پڑتا تھا۔ امریکی حکومت نے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے ممفس کا شہر آباد کیا اور یہاں پر بھی غلاموں کی ایک بہت بڑی منڈی قائم کر دی۔ گلف آف میکسیکو سے اب سیاہ فام غلاموں کے تاجران غلاموں کو خریدتے تھے اور مسیسیپی دریا کے ذریعے اوپر ممفس تک چلے جاتے تھے۔ ممفس سے ہر

روز درجنوں کی تعداد میں بحری جہاز نیچے نیوآرلینز آتے اور جاتے رہتے تھے۔ یہ آٹھ سو کلومیٹر کا سفر بنتا تھا۔ تاجر کورپس کرسٹی سے غلام خریدتے تھے اور پھر یہاں سے پہلے نیوآرلینز جاتے تھے اور پھر مسیسیپی دریا سے گزرتے ہوئے اوپر ممفس تک چلے جاتے تھے۔ یہاں ایک غلام اوسطاً چار سو ڈالر کا مل جاتا تھا۔ یہ تاجر اسی مزدور کو آگے ممفس جا کر چھ سو ڈالر کا بیچ دیتے تھے۔

مارکوس تاجر نہیں تھا بلکہ وہ ایک بڑا زمیندار تھا۔ اسے پہلے کافی غلاموں کی ضرورت تھی اس لئے اس نے ممفس سے مہنگے داموں غلام خریدنے کی بجائے کورپس کرسٹی آنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ اپنی مرضی سے سستے داموں غلام خرید سکے۔ کورپس کرسٹی میں اس پورے علاقے کی سب سے بڑی منڈی لگتی تھی۔ یہاں ہزاروں کی تعداد میں سیاہ فام غلام لائے جاتے تھے اس لئے یہاں غلام اچھے بھی مل جاتے تھے اور ان کے ریٹ بھی مناسب ہوتے تھے۔ مارکوس اسی لئے یہاں آیا تھا۔ وہ جارج کے جہاز میں آکر مختلف غلاموں کو دیکھ رہا تھا۔

”سر! میرے غلاموں جیسے غلام آپ کو اس پوری منڈی میں نہیں ملیں گے۔ یہ سارے غلام لائبریا سے لائے گئے ہیں اور یہ انتہائی طاقت ور غلام ہیں۔“ جارج نے مارکوس کو ریسو کیا اور اسے غلام دکھانے لگا۔ وہ اپنے غلاموں کی تعریف بھی کر رہا تھا۔ مارکوس کے ساتھ دس اور بھی لوگ تھے۔ یہ سارے اس کے ملازم تھے۔ جارج کو اس کے ظاہری حلیے سے ہی پتہ چل گیا تھا کہ وہ کافی امیر اسامی ہے اس لئے وہ مارکوس کے آگے بچھا جا رہا تھا۔

”جی جی! آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔۔۔ ایسی بات تقریباً ہر شپ والا ہی کہہ رہا ہے۔“ مارکوس نے آگے سے جواب دیا اور وہ غلاموں کو دیکھنے لگا۔

”سر! میں کوئی تاجر نہیں ہوں بلکہ میں خود شکاری ہوں۔ میں نے ان سب کو افریقہ سے اپنے ہاتھوں سے پکڑا ہے۔“ جارج مارکوس کے پیچھے کھڑا مسلسل بول رہا تھا۔

”اوہ اچھا! یہ سارے لائبریا سے ہی ہیں یا دوسرے علاقوں سے بھی ہیں؟“ اس بار مارکوس کو تھوڑی دلچسپی محسوس ہوئی تو اس نے آگے سے سوال کیا۔

”سارے لائبریا سے ہی ہیں۔۔۔ یہ مون رو یا شہر سے محض 100 کلومیٹر دور جنگل سے پکڑے گئے

ہیں۔“ جارج نے جواب دیا۔

”کیا؟ یہ سارے ایک ہی قبیلے سے ہیں؟“ مارکوس نے سوال کیا۔

”نہیں نہیں سر! یہ مختلف قبیلوں سے ہیں۔ آپ کو کتنے غلام چاہئیں؟“ جارج نے جلدی سے بات بدلی۔ زمیندار کبھی بھی ایک ہی قبیلے کے زیادہ افراد نہیں خریدتے تھے۔ اگر ایک ہی قبیلے کے تین چار غلام اکٹھے ہو جائیں تو بغاوت کا خطرہ رہتا ہے۔ اس لئے زمیندار زیادہ تر الگ الگ ہی غلام خریدنے کی کوشش کرتے تھے۔

”کتنے قبیلوں سے غلام ہیں آپ کے پاس؟“ مارکوس نے پھر سوال کیا۔

”سر! دس بارہ قبیلے ہیں۔ ان میں سے کچھ لائبریا سے ہیں اور کچھ سیرالیون سے بھی ہیں۔“ جارج نے جلدی سے جواب دیا۔ اس کے پاس ٹوٹل چار قبیلوں سے غلام آئے تھے لیکن یہاں اس نے جھوٹ بولا تھا۔ ویسے بھی کسی بھی غلام کو انگلش نہیں آتی تھی اس لئے اسے فکر بھی نہیں تھی۔ جب ان غلاموں کو انگلش ہی نہیں آتی تھی تو پھر کسی نے کیا بتانا تھا۔ بعد میں جب ان کو پتہ بھی چلتا تو تب تک جارج نے کونسا یہاں ہونا تھا۔

”آپ کو کتنے غلام چاہئیں؟“ جارج نے دوبارہ سوال کیا۔

”مجھے دو تین غلام ہی چاہئیں اگر پسند آجائیں تو۔۔۔“ وہ اس بار عاکون کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے صرف ایک نظر ہی چالیس سال سے اوپر والے گروپ پر ڈالی تھی لیکن اسے کوئی بھی پسند نہیں آیا تھا۔ اس لئے وہ نو جوان غلاموں والے گروپ کا جائزہ لے رہا تھا۔

”اس کو باقیوں سے الگ کیوں رکھا ہوا ہے؟“ مارکوس نے عاکون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ ان سب سے الگ تھلک پیروں میں زنجیریں ڈالے کھڑا تھا۔

”سر! اس کی قیمت باقیوں کے مقابلے میں 100 ڈالر زیادہ ہے، یہ 500 ڈالر کا ہے۔ یہ نو جوان لڑکا ہے اور اپنے قبیلے کا سردار بھی ہے۔“ جارج کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

”ارے یار! وہاں دس دس گھروں کے تو قبیلے ہوتے ہیں، ان کا سردار بننا کونسا مشکل ہے؟“ مارکوس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”سوری سر! اس کی اتنی ہی قیمت ہے۔۔۔ آپ کسی اور غلام کو دیکھ لیں۔“ جارج نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ عاکون کو پانچ سو سے نیچے بیچنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

”یار! تھوڑی سی قیمت تو کم کرنا! میں پانچ سو ڈالر میں دو غلام خرید سکتا ہوں۔ یہ بحر حال دو غلاموں کے

برابر تو کام نہیں کر سکتا ہے۔“ مارکوس اسے ریٹ کم کرنے کا کہنے لگا۔

”سر! آپ کوئی اور غلام دیکھ لیں، باقی لڑکے بھی کافی اچھے ہیں۔۔۔ آپ کو پسند آئیں گے۔“ جارج نے دوسرے غلاموں کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا لہجہ بالکل دو ٹوک تھا۔

”میں اس کے ساڑھے چار سو ڈالر دے سکتا ہوں۔ بولو اگر سودا منظور ہو تو بات آگے بڑھاتے ہیں؟“ مارکوس کو عاکون پسند آ گیا تھا۔

”نہیں سر! پانچ سو ڈالر سے ایک ڈالر بھی کم نہیں ہوگا۔ یہ لڑکا انگلش بھی تھوڑی بہت جانتا ہے۔ کیوں عاکون! صاحب کو انگلش بول کر دکھاؤ۔“ جارج نے عاکون کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

”جی۔۔۔ جی سر! میں انگلش بول لیتا ہوں۔“ عاکون نے جلدی سے بولتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔ میں پانچ سو ڈالر میں ہی اسے خرید رہا ہوں۔“ مارکوس نے کچھ دیر تک سوچا اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

”آندریا! ادھر آؤ اور اس کے کاغذات بنوالاؤ۔ سر! آپ کو کوئی اور غلام بھی چاہیے؟“ جارج نے اپنے ملازم آندریا کو کاغذات بنوانے کا کہا اور مارکوس سے مزید غلاموں کا پوچھنے لگا۔

”سر! میں شادی شدہ ہوں۔۔۔ آپ میری بیوی کو بھی خرید لیں، ہم دونوں کو انگلش آتی ہے۔“ عاکون نے جلدی جلدی بولتے ہوئے کہا۔

”اے چپ سالے! بکواس کرتا ہے۔۔۔ تجھے معلوم نہیں ہے کاروبار کے معاملے میں غلام درمیان میں نہیں بولتے؟“ جارج نے زوردار لالت اسے مارتے ہوئے کہا۔

”سر پلیز! ہم دونوں میاں بیوی کو الگ مت کریں، ہم دونوں آپ کے سارے کام کریں گے۔“ عاکون اندریا کی لالت کھا کر زمین پر پڑے پڑے بھی چیخ چیخ کر بول رہا تھا۔

”آندریا! مجھے اس کی آواز نہیں آنی چاہیے۔“ جارج نے غصے سے اپنے نائب سے کہا تو وہ عاکون پر جھپٹ پڑا۔ اس نے زور زور سے لالتیں زمین پر پڑے عاکون کے پیٹ میں مارنی شروع کر دیں۔

”اسکی بیوی کون سی ہے؟“ مارکوس نے جارج سے پوچھا۔

”سر! وہ اس طرف ہے۔“ جارج نے عورتوں والے حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہاں جارج کا ایک آدمی عالیہ کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے عالیہ کا منہ بند کیا ہوا تھا۔ مارکوس چلتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

”سر پلیز! ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ آپ ہم دونوں کو الگ مت کریں۔ پلیز سر! آپ مجھے بھی خرید لیں، میں آپ کے سارے کام کروں گی۔“ عالیہ نے اس کے آگے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔ اسکی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

”کیا قیمت ہے اسکی؟“ مارکوس نے پوچھا۔ اسکی نظریں عالیہ کے سراپا پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اسے سر سے لیکر پیروں تک دیکھ رہا تھا۔

”سر! ایک ہزار ڈالر اس کی قیمت ہے۔“ جارج نے مارکوس کی نظروں میں عالیہ کے لئے پسندیدگی دیکھ لی تھی اس لئے اس نے اچانک عالیہ کا ریٹ بڑھ دیا۔ اسے معلوم تھا کہ مارکوس دونوں کو خریدنے کا ارادہ رکھتا ہے اس لئے اس نے عالیہ کی قیمت انتہائی زیادہ بتادی تھی۔

”ایک ہزار ڈالر؟ یہ قیمت تو بہت زیادہ ہے۔“ مارکوس نے غصے سے جارج کی طرف دیکھا۔ اسے جارج کی شیطانی ذہنیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔

”سر پلیز! میں آپ کے سارے کام ہی کروں گی۔ پلیز سر! ہمیں الگ مت کریں۔“ عالیہ کے ہاتھ اس کے آگے بندھے ہوئے تھے۔ اس کا پورا جسم سر سے لیکر پاؤں تک کانپ رہا تھا۔

”سر پلیز! ہم دونوں کو الگ مت کیجئے گا۔“ اس بار عاکون نے چلا کر کہا۔ وہ زمین پر گرا جارج کے ٹھڈے کھار ہا تھا لیکن پھر بھی وہ چلا چلا کر بول رہا تھا۔

”جارج! ایک قیمت بولو، میں اسے بھی خرید لیتا ہوں۔۔۔ مجھے معلوم ہے تم صرف میری دلچسپی دیکھ کر ہزار ڈالر بول رہے ہو!“ مارکوس نے سنجیدگی سے کہا۔

”نہیں سر! ایک ہزار ڈالر۔۔۔ اس سے ایک ڈالر بھی کم نہیں ہوگا۔“ جارج نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”سر پلیز! میں آپ کی ساری زندگی خدمت کروں گی، مجھے عاکون سے الگ مت کیجئے۔“ عالیہ زمین پر دوڑانوں ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ باندھے ہوئے تھے۔

”سر پلیز! میں عاکون کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔“ اس سے اب مزید بولا نہیں جا رہا تھا۔ وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔

”سر! دونوں کو ایک ساتھ خریدنا بہت خطرناک ہوگا۔۔۔ بغاوت کا بھی خطرہ ہوگا اور ظاہر ہے آپ نے اس کو گھر میں بٹھا کر تو نہیں رکھنا؟ ایک ہزار ڈالر لگائیں گے تو پورے بھی تو کرنے ہیں نا؟ یہ آدمی آپ کو غیرت

میں آکر مار سکتا ہے۔“ مارکوس عالیہ کو خریدنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن اس کے مینجر نے پیچھے سے منع کر دیا۔

”سر! انسان اپنے اوپر تو ظلم برداشت کر سکتا ہے لیکن اپنے پیاروں پر ظلم ہوتا دیکھ کر جانور بن جاتا ہے۔“ مینجر نے تیز لہجے میں کہا۔ وہ ایک جہاں دیدہ شخص تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ سیاہ فام غلام زندہ رہنے کے لئے ہر ظلم برداشت کر جاتے تھے لیکن کبھی بھی ان کے بچوں پر ظلم ہوتا تو پھر یہ غلام جانور بن کر سب کچھ تباہ کر دیتے تھے۔ بیوی بچوں پر ہونے والا ظلم ان کو موت سے بھی لڑوا دیتا تھا اسی لئے زمیندار اور مالک کبھی بھی ان کی شادیاں نہیں ہونے دیتے تھے۔ اگر کسی لونڈی کے بچے ہو جائے تو دس بارہ سال کا ہوتے ہی اسے کسی دوسرے مالک کو بیچ دیتے تھے لیکن کبھی بھی ماں اور بیٹے کو ایک ساتھ نہیں رکھتے تھے۔ مینجر اسی لئے اسے دونوں کو اکٹھا خریدنے سے منع کر رہا تھا۔

”ٹھیک ہے، میں صرف مرد غلام کو ہی خریدوں گا۔ مجھے اس لڑکی کی ضرورت نہیں ہے۔“ مارکوس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”سر پلیز! ہمیں الگ مت کرو، ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ دونوں کو الگ کرو گے تو دونوں ہی مرجائیں گے۔“ عالیہ زمین پر پڑی سسک سسک کر رونے لگی۔

اس کا محبوب اس سے الگ ہو رہا تھا۔ وہ بہاولپور کے ریگستانوں سے آئی تھی۔ سب سے پہلے نواب احمد خان نے اسے اس کے ماں باپ سے الگ کیا تھا، پھر انگریز ماں باپ آئے تو افریقی قبائلیوں نے ان کو مار دیا۔ اسے عاکون سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ اس کی خاطر مسلمان ہوا تھا۔ اس کا پورا قبیلہ بھی مسلمان ہو گیا تھا۔ عالیہ کی زندگی بالکل صحیح جا رہی تھی لیکن پھر امریکی شکاری آئے اور سب کچھ جلا کر راکھ کر گئے۔ آج عالیہ عاکون سے بھی الگ ہو رہی تھی۔ اس کی زندگی مسلسل حادثات کا شکار ہو رہی تھی۔ خوشی چند پل کے لئے ہی اس کے پاس آتی تھی لیکن وہ پھر اس سے جدا ہو جاتی تھی۔ مارکوس نے جارج کو پانچ سو ڈالر کی ادائیگی کی تو جارج نے عاکون کے پیروں سے زنجیر نکالی اور اس کی جگہ پر ایک چھوٹی بیڑی ڈال دی۔ یہ ایک فٹ کے قریب لمبی بیڑی تھی۔ اس کی مدد سے اس کے دونوں پاؤں کو باندھ دیا گیا تھا۔ اب وہ آہستہ آہستہ ایک ایک پیہر آگے بڑھا کر چل تو سکتا تھا لیکن بھاگ نہیں سکتا تھا۔

جارج نے ایک اور تھکنڑی کی مدد سے اس کے ہاتھ بھی باندھے اور اسے لیکر جہاز سے باہر آ گیا۔ اب وہ بڑے آفس میں جا کر اس کے نام کے کاغذات تیار کرواتا اور پھر اس کو مارکوس کے حوالے کر دیتا۔ بڑے

آفس میں جا کر پہلے اس کے کندھے پر نمبر لگا یا گیا اور پھر اس کے کاغذات تیار کر کے اسے مارکوس کے حوالے کر دیا۔ اسے عاکون کے کندھے پر BRF-140 کے الفاظ کندہ تھے۔ مارکوس نے اس کے بعد مزید کچھ غلام خریدے اور پھر تقریباً ایک گھنٹے کے بعد تمام غلاموں کو لیکر جہاز میں بیٹھ گیا۔ اس کے پاس بیس کے قریب غلام تھے اور وہ ان کو لیکر نیوآرلینز کی طرف جا رہا تھا۔ وہ وہاں سے مسیسی دریا میں سفر کرتے اور ممفس چلے جاتے۔

میں اپنے والد اور دو ملازمین کے ساتھ مختلف جہازوں میں غلاموں کو دیکھ رہا تھا۔ اصل میں غلام تو میرے والد براون ہی دیکھ رہے تھے۔ میں اور دوسرے ملازمین ویسے ہی ان کے ساتھ چل رہے تھے۔ ہم نے اب تک پانچ پانچ غلام خرید لئے تھے اور مزید پانچ ابھی خریدنے تھے۔ ہم صبح آٹھ بجے سرائے سے ناشتہ کر کے نکلے تھے اور اب دوپہر کو دوج چکے تھے۔ ابھی تک ابو کو صرف پانچ غلام ہی پسند آئے تھے۔ وہ ایک ایک غلام کے پاس جا کر رکتے تھے اور اسے اچھی طرح چیک کر کے آگے بڑھ جاتے تھے۔ میں ابو کے ساتھ چلتے چلتے تھک چکا تھا لیکن مجبوری میں ساتھ چل رہا تھا۔

”بیٹا! اگر تم تھک گئے ہو تو واپس سرائے میں جا کر آرام کرو، ہمیں تو یہاں پر شام ہو جائے گی۔“ ابو نے یہ فقرہ کوئی دسویں بار بولا تھا اور میں ہر بار انہیں منع کر دیتا تھا۔ لیکن اس بار میرا ارادہ واپس جانے کا ہی تھا۔

”جی ابو! میں واپس سرائے میں جا کر آرام کر لیتا ہوں۔“ میں نے ابو سے کہا اور واپس مڑنے لگا۔

”یار! ایک دو جہاز مزید دیکھ لو، ایک اور غلام مل جائے تو اسے لیکر چلے جانا! تم اس کے کاغذات بنوا کر اسے ہمارے جہاز والوں کے حوالے کر کے پھر سرائے چلے جانا جبکہ ہم لوگ مزید غلام دیکھ لیں گے۔“ میں واپسی کے لئے مڑا ہی تھا جب ابو نے پیچھے سے آواز دے کر مجھے روک لیا۔

”ٹھیک ہے ابو! میں مزید دو تین جہاز اور دیکھ لیتا ہوں۔“ میں دوبارہ ابو کے ساتھ ہولیا۔

سامنے ہی ایک بہت بڑا جہاز کھڑا تھا جس کے دروازے کھلے تھے۔ ہم سب اس جہاز میں داخل ہو کر غلام دیکھنے لگے۔ میں ایسے ہی ابو کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اچانک میری نظر سانولی سی لڑکی پر پڑ گئی۔ یہ عالیہ تھی جو دوسری غلام عورتوں سے تھوڑا ہٹ کر کھڑی تھی۔ اس کے پاؤں ایک لمبی زنجیر سے بندھے ہوئے تھے جبکہ دونوں ہاتھ کھلے تھے۔ جن کی مدد سے وہ بار بار اپنی آنکھوں کو صاف کر رہی تھی۔ میں چھوٹے

چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ عالیہ تھی، اس نے ایک پل کے لئے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر دوبارہ اپنی نظروں کو جھکا لیا۔ اس نے صرف ایک پل کے لئے ہی میری طرف دیکھا تھا لیکن اس ایک پل نے ہی مجھ سے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ عالیہ کی معصومیت نے میرے دل میں گھر کر لیا تھا۔ اس کے درد اور تڑپ نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ایک پل کے لئے ایسا لگا تھا جیسے وہ درد میں اپنے دل پر محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے ایک ہاتھ کی انگلی سے اس چہرے کو اوپر اٹھایا تو وہ پھر میری طرف دیکھنے لگی۔ پتلا سا سانولہ چہرہ اور اس پر موٹی موٹی سیاہ آنکھیں۔ وہ افریقہ کی کسی شہزادی کی طرح لگ رہی تھی۔

”گڈ ایوننگ صاحب! میری قیمت کافی زیادہ ہے۔“ اس نے خالص اور صاف لہجے میں کہا اور دوبارہ اپنے سر کو جھکا لیا۔ میرا دل اچھل کر میرے حلق تک آ گیا۔

”ابا! آپ اس لڑکی کو بھی خرید لیں!“ میں نے اپنے ابو کو آواز دی۔

”بیٹا! چھوڑ دو اسے اور ادھر آ جاؤ! ہم صرف مرد غلاموں کو خریدنے آئے ہیں۔ عورتوں کی ہمیشہ پر ابلم ہی رہتی ہے۔ چھوڑ دو اور ادھر آ جاؤ! میرے ساتھ مرد غلاموں کو دیکھنے اور پسند کرنے کی کوشش کرو۔“ ابو نے وہیں سے آواز لگائی تو میں واپس مڑنے لگا۔ وہ آہستہ سے ایک قدم پیچھے ہٹی اور اس نے جہاز کی دیوار سے ٹیک لگالی۔ میں نے ایک نظر اور اس پر ڈالی اور ابو کے پاس چلا گیا۔

”ابا! میں نے اس لڑکی کو خریدنا ہے۔ پلیز! ایک بار، صرف ایک بار میری پسند بھی دیکھ لیں۔“ میں نے اس بار فریج زبان میں اپنے والد سے کہا۔

”یار ایل! میں نے کہا بھی ہے تم کو کہ ہم صرف مرد غلاموں کو ہی لیکر جائیں گے۔ لڑکیاں ہمارے پاس پہلے ہی تیس کے قریب موجود ہیں۔ اس سے زیادہ عورتیں ہوں گی تو پر ابلم ہو جائے گی۔ عورتیں ویسے بھی مردوں کے مقابلے میں آدھا کام کرتی ہیں اور ان کی موجودگی کی وجہ سے دوسرے مرد غلام بھی ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں۔“ میرے والد براون نے مجھے آہستگی سے کہا۔

”ابا! ایک بار دیکھ تو لیں!“ میں نے اپنے والد کا بازو پکڑ لیا۔

”یار! میں نے بولا ہے نا تم سے۔۔۔ لیکن تم پھر بھی بچوں کی طرح ضد کر رہے ہو!“ اس بار انہوں نے غصے سے کہا۔ وہ کافی غصے میں آ گئے تھے لیکن میں پھر بھی ان کا بازو پکڑے انہیں عالیہ کے پاس لیکر آ گیا۔

”ابا! یہ انگلش بھی بول سکتی ہے۔“ میں نے پراشیاق لہجے میں کہا۔ میری نظریں ایک بار پھر اس عورت

کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

”اچھا؟ تو اس میں کونسی نئی بات ہے؟ سارے غلام ہی چھ سات مہینوں میں انگلش بولنا سیکھ جاتے ہیں۔“ انہوں نے طنزیہ کہا۔ وہ بھی عالیہ کو سر سے لیکر پیروں تک دیکھ رہے تھے۔

”نام کیا ہے تمہارا؟“ اس بار ابو نے براہ راست اس سے سوال کیا۔

”عالیہ۔۔۔۔“ اس نے صرف ایک پل کے لئے نظر اٹھا کر ابو کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ سر جھکا لیا۔ میرا دل ایک بار پھر بڑی زور سے دھڑکا۔ عالیہ۔۔۔ اس کا نام بھی اس کے عجیب سے حسن کی طرح عجیب سا تھا۔ عالیہ انتہائی سادہ نام تھا۔ بڑی آسانی سے زبان پر بھی آ جاتا تھا اور یاد بھی رہ جاتا تھا جبکہ دوسری افریقی عورتوں کے نام بڑے بڑے اور کافی مشکل سے ہوتے تھے۔ ہم اپنی مرضی سے ان کے افریقی ناموں کو چھوٹا کر کے یا پھر ان کے انگلش بنا کر رکھ لیتے تھے جبکہ یہاں اس کا نام بالکل سیدھا سا تھا۔ یہ عربک نام تھا اور میں نے پہلی بار یہ نام سنا تھا۔ میرا نام ایلس براون تھا لیکن مجھے ایلی کہہ کر بلاتے تھے۔ ایلی اور عالیہ دونوں ایک جیسے نام لگ رہے تھے۔

”عالیہ۔۔۔ یہ تو افریقن نام نہیں ہے؟“ ابو نے جارج کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”میں ہندوستان سے ہوں۔“ عالیہ نے ایک بار پھر نظریں اٹھا کر ابو کی طرف دیکھا۔

”کیا؟ یہ ہندوستان سے ہے؟“ ابو کے ماتھے پر کئی شکنیں ابھر آئی تھیں۔

”جی جی سر! شاید ایسی ہی بات ہے۔ میں اسے لائبریا سے لیکر آ رہا ہوں۔“ جارج نے جلدی سے

کہا۔

”سر! اگر یہ ہندوستان سے بھی آئی ہے تو پھر بھی کیا فرق پڑتا ہے؟ ہمیں صرف سفید چمڑی والوں کو غلام بنانے کی اجازت نہیں ہے۔ باقی تو پوری دنیا کے سیاہ فام افراد کو ہم اپنا غلام بنا سکتے ہیں۔“ جارج جلدی جلدی بول رہا تھا۔

”ہاں! یہ بات تو ہے۔ صرف سفید فام یورپی افراد کو ہی غلام نہیں بنایا جاسکتا باقی تو سارے ہی غلام بنائے جاسکتے ہیں۔ ویسے ہندوستان کی یہ پہلی غلام ہے۔ میں نے آج تک ایشیا کے کسی بھی ملک کی غلام نہیں دیکھی ہے۔ کیا قیمت ہے اس کی؟“ ابو نے اس سے قیمت پوچھی۔

”ایک ہزار ڈالر قیمت ہے۔“ جارج کی قیمت سن کر ہم سب ہکا بکا رہ گئے۔

”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ایک ہزار ڈالر میں تو تین چار غلام آجاتے ہیں۔ تم چار چار غلاموں کی قیمت اس ایک عورت کی لگا رہے ہو؟“ ابو نے حیرانگی سے پوچھا۔

”سر! ہندوستانی غلام کی تھوڑی قیمت زیادہ ہی ہوگی۔ یہ نوجوان لڑکی ہے، اسے انگلش اور افریقن زبانوں کے علاوہ ہندی زبان بھی آتی ہے۔“ جارج اب اس کی ہندوستانی قومیت کو کیش کروانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”نہیں! ہمیں نہیں چاہیے، ہم صرف مرد غلاموں کو ہی لینے آئے ہیں۔“ ابو نے سر جھٹکا اور دوسری طرف جانے لگے لیکن میں نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔

”ابو! اسے خرید لیں، مجھے یہ لڑکی اچھی لگی ہے۔ یہ بہت اچھی غلام ثابت ہوگی۔“ میں نے عالیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اوئے ایللی! تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے؟ یہاں اڑھائی تین سو کی غلام مل رہی ہے اور تم مجھے اس لڑکی کے ہزار ڈالر دینے کو کہہ رہے ہو؟“ ابو نے غصے سے اپنا ہاتھ چھڑوایا اور دوسری طرف چلے گئے۔ انہوں نے ایک نظر غلاموں پر ماری اور باہر کی طرف جانے لگے۔ میں بھی آہستہ آہستہ ابو کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

”آپ بہت اچھے ہو ایللی! میرے لئے کوشش کرنے کا بہت شکریہ دوست۔“ عالیہ نے اونچی آواز سے کہا۔ میرے باہر کی طرف جانے والے پاؤں رک گئے اور میں واپس پلٹ کر آ گیا۔

”دوست۔۔۔؟ کیا ایک غلام بھی کبھی کسی کا دوست ہو سکتا ہے؟ تم سیاہ فام ہو اور میں سفید فام ہوں۔ تمہاری اور میری قومیت میں بہت فرق ہے، پھر بھی تم نے دوست کس حیثیت سے کہا ہے؟“ میں اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

”دوست! رنگ و نسل بے شک مختلف ہیں لیکن بنانے والا تو ایک ہی ہے نا؟“ اس نے ایک پل کے لئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور پھر اپنی نظروں کو جھکا لیا۔

”ایللی! اب ادھر کھڑا کیا کر رہا ہے؟ آ جاؤ! ہمیں پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے۔“ ابو جہاز کے دروازے پر کھڑے مجھے پکار رہے تھے۔

”جائیے ایللی صاحب! آپ کے والد آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ اس نے باہر کی طرف اشارہ کیا

جہاں ابو غصے سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

”کیا تم ہمارے ساتھ جانا چاہتی ہو؟“ میں نے ایک انگلی کی مدد سے دوبارہ اس کا چہرہ اوپر کیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”غلام کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی ایلی صاحب! ہم غلاموں کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی۔ جائیے! آپ کے والد زیادہ غصے میں آگئے ہیں۔ وہ آپ کو لینے کے لئے آرہے ہیں۔“ اس نے ہاتھ بڑھایا اور میری گالوں کو ایک پل کے لئے چھوا اور پھر واپس دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

”ایلی! میں گھنٹے سے تمہیں آوازیں دے رہا ہوں لیکن تم پر اثر ہی نہیں ہو رہا ہے۔ چلو اب نکلو یہاں سے! ہمیں بہت دیر ہو رہی ہے۔“ ابو نے مجھے بازو سے پکڑا اور باہر کی طرف لے جانے لگے۔

”ابا! عالیہ کو خرید لو!“ میں نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑوایا اور وہیں کھڑا ہو گیا۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے؟ وہ ایک ہزار ڈالر بول رہا ہے۔ میرے پاس اتنا فالٹو پیسہ نہیں ہے۔“ انھوں نے دوبارہ مجھے بازو سے پکڑ لیا۔

”ابا! میں عالیہ کے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا، میں نے کبھی آپ سے ضد نہیں کی ہے۔ آج پہلی بار ضد کر رہا ہوں۔ پہلی بار آپ سے مانگ رہا ہوں۔۔۔ مجھے یہ لڑکی چاہیے اور آپ اسے خرید لیں۔“ میں نے ایک بار پھر اپنا بازو چھڑوایا اور ابو کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

”دیکھ ایلی! تم آج پہلی بار ضد کر رہے ہو میں اسی لئے لحاظ کر رہا ہوں۔۔۔ ورنہ تم جانتے ہو کہ ابھی ایک تھپڑ ہی تمہارے کان کے نیچے لگاؤں گا تو کل تک تمہارے کان میں سوس سوس ہوتی رہے تھی۔ مجھے غصہ مت دلاؤ اور خاموشی سے نکلو ادھر سے!“ ابو کا لہجہ تحکم انگیز تھا۔

”ایلی صاحب چلے جاؤ! کیوں ایک غلام کی خاطر مار کھانے لگے ہو؟“ مجھے عالیہ کی آواز سنائی دی تو میں پیچھے مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ اس بار اس نے اپنی نظروں کو جھکایا نہیں بلکہ وہ لگاتار میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”ایلی! چلو اب۔۔۔“ ابو نے مجھے بازو سے پکڑ کر باہر کی طرف دھکا دیا تو میں جہاز کے فرش پر گر گیا۔

”نہیں ابا! اب نہیں۔ عالیہ کو خریدو گے تو جاؤں گا ورنہ ادھر ہی مرجاؤں گا لیکن یہاں سے ایک قدم بھی باہر کی طرف نہیں اٹھاؤں گا۔“ میں وہاں سے اٹھا اور جا کر عالیہ کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔

”سرجی! بے حد ضد کر رہا ہے تو لڑکی کو خرید لیں نا؟ یقین کریں آپ کو نقصان نہیں ہوگا۔“ جارج نے جلدی سے ہماری گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

”تمہارے پاس کوئی زنجیر ہے تو دیدو مجھے! یہ اگر ایسے نہیں جائے گا تو پھر اسے بھی غلاموں کی طرح ہاتھ پیر باندھ کر لے جاؤں گا۔“ ابا ایک بار پھر میری طرف بڑھے اور غصے سے ان کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔

”ابا پلیز! صرف ایک بار۔۔۔ آخری بار آپ سے مانگ رہا ہوں۔ بیٹا سمجھ کر دے دیں۔“ میں نے ابو کے سامنے دونوں ہاتھ باندھ دیئے۔

”پلیز ابو! آخری بار۔۔۔ میں زندگی میں کبھی آپ سے کچھ نہیں مانگوں گا۔“ میری آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے اور میں رونے لگ پڑا۔ ابو میرے قریب آ کر رک گئے۔ وہ کافی دیر تک مجھے روتا ہوا دیکھتے رہے۔ آخر ان کا دل پستج گیا۔

”یار! تم تو بہت پڑھے لکھے لڑکے ہو لیکن پھر بھی دیکھو کیسے جاہلوں کی طرح زمین پر پڑے رو رہے ہو۔“ ابو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ابو پلیز! عالیہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“ میرے ہاتھ ابھی تک بندھے ہوئے تھے اور میں ابھی ابھی ابو سے عالیہ کو ہی مانگ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے نایار! خرید لیتے ہیں۔ اب اٹھ جاؤ اور اپنے کپڑوں کو بھی جھاڑو۔۔۔ تمہارے سارے کپڑے گندے ہو گئے ہیں۔“ ابو نے مجھے اوپر اٹھایا۔

”ابو! آپ بہت اچھے ہیں، آپ بہت اچھے باپ ہیں۔“ میں نے ابو کے گلے لگتے ہوئے کہا۔

”اچھا اچھا! اب یہ مسخریاں چھوڑو اور مجھے بات کرنے دو۔“ ابو نے مجھے دور ہٹایا اور جارج سے عالیہ کی بات کرنے لگا۔

وہ کوئی دو منٹ تک عالیہ کی قیمت کم کروانے کی کوشش کرتے رہے لیکن جارج بھی بڑا گھاگ شکاری تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اب ہم ہر حال میں عالیہ کو خرید کر ہی جائیں گے۔ اس لئے اس نے ایک ہزار ڈالر سے ایک ڈالر بھی کم نہیں کیا۔ اس نے عالیہ کے پورے ایک ہزار ڈالر وصول کئے اور عالیہ کو ہمارے حوالے کر دیا۔ اس نے اپنے نائب آندریا کو ہمارے ساتھ بھیجا، جس نے عالیہ کو نمبر لگوا یا اور اس کے کاغذات بنوا کر اسے ہمارے حوالے کر دیا۔

”اچھا ایل! تم ایسا کرو کہ اسے لیکر جہاز تک چلے جاؤ۔ وہاں اسے چھوڑ دینا اور پھر خود واپس ہوٹل چلے جانا۔ ہم بھی شام تک خریداری مکمل کر لیں گے اور پھر ہوٹل آجائیں گے۔ جہاز تو شام کو آٹھ بجے کے قریب روانہ ہوگا۔ میرے خیال میں آج ہی ہم واپسی کے لئے نکل پڑیں گے۔“ ابو نے عالیہ کو میرے حوالے کیا اور خود ملازموں کے ساتھ مزید غلاموں کو دیکھنے کے لئے چلے گئے جبکہ میں عالیہ کو لیکر واپس آنے لگا۔

واپسی جانے والے بحری جہاز کے تہہ خانے میں غلاموں کو رکھنے کی جگہ تھی۔ یہاں تہہ خانے کے فرش میں قطاروں میں کنڈے لگے ہوئے تھے۔ تمام غلاموں کو ان کنڈوں کی مدد سے باندھ دیا جاتا تھا۔ یہاں تہہ خانے میں دس کے قریب مسلح پہرے دار بھی تھے جو ان غلاموں کا دھیان رکھتے تھے۔ انہیں کھانا پانی وغیرہ بھی دیتے تھے اور ہاتھ روم بھی لے جاتے تھے۔ میں عالیہ کو لیکر جہاز میں آ گیا۔ میں نے اس کے نمبر کے حساب سے ٹکٹ لی اور لیکر تہہ خانے میں آ گیا۔ یہاں ایک مسلح پہرے دار نے عالیہ کو مجھ سے لیا اور ایک کنڈے کے ساتھ باندھ دیا۔ اس نے عالیہ کے پاؤں میں لگی ہوئی زنجیر کے سرے کو کنڈے میں ڈالا اور تالہ لگا کر اس کی چابی مجھے دے دی۔ اپنے شہر پہنچ کر ہم ٹکٹ اور چابی پہریداروں کو دیتے تو وہ ہمارے غلام کھول کر ہمارے حوالے کر دیتے تھے۔

”عالیہ! کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟ اگر بھوک لگی ہوئی ہے تو میں کھانا لا کر دے دیتا ہوں؟“ میں نے عالیہ سے پوچھا۔

”نہیں شکریہ ایل! آپ بہت مہربان ہو۔“ عالیہ نے نفی میں سر ہلایا اور جہاز کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ میں نے پہرے دار کو پیشکش کہہ کر دیوار کے ساتھ والی جگہ لی تھی۔ عالیہ دیوار کا سہارا لیکر بیٹھ سکتی تھی اور سو بھی سکتی تھی۔ ورنہ تین چار دن کا سفر جہاز کے درمیان میں بغیر سہارے کے بہت مشکل ہوتا ہے۔

”پھر بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ؟“ میں نے دوبارہ اس سے پوچھا۔

”شکریہ مالک! مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”مالک۔۔۔؟ میں مالک نہیں ہوں۔ مجھے میرے نام سے بلاؤ!“ میں نے قدرے خفگی سے کہا۔

”آپ مالک ہی تو ہیں، آپ نے مجھے خریدا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”نہیں! مجھے مالک کہلوانہ اچھا نہیں لگتا۔۔۔ ہمارے ڈیرے پر موجود باقی غلام بھی مجھے نام سے ہی

بلاتے ہیں اس لئے تم بھی نام سے بلایا کرو۔ ویسے تم نے کھانا کب کھایا ہے؟“ میں نے سرسری طور

پر پوچھا۔

”ٹھیک ہے ایلی صاحب! کھانا تو میں نے کل کھایا تھا۔ کافی بڑا بریڈ تھا اور ٹماٹر بھی دو ملے تھے۔“ عالیہ کو بے اختیار سینے میں ایک درد سا اٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ دو ٹماٹر دینے والے نے پورے حساب سے ان کی قیمت بھی وصول کی تھی۔ پچھلے دو مہینے سے وہ مسلسل اس کرب کا شکار ہو رہی تھی۔ دو مہینے میں اسے سینکڑوں بار لوٹا گیا تھا۔ جارج اور اسکے نایب کا دل تو پہلے ہفتے میں ہی بھر گیا تھا۔ اس کے بعد دوسرے سپاہی آگئے تھے جن کی تعداد درجنوں میں تھی۔ پچھلے دو مہینے میں کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا تھا جس دن اسے لوٹا نہ گیا ہو۔ اسے دوسرے غلاموں سے قدرے زیادہ ملتا تھا اور قیمت بھی اسے زیادہ چکانی پڑتی تھی۔ ابھی بھی اس نے مسلح پہریداروں کی نظروں میں حوس کی پرچھائیاں دیکھ لی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ ایلی کے جاتے ہی یہ سارے گدھ اس کے گرد منڈلانا شروع ہو جائیں گے۔ اسے ایلی کا بھی پتہ تھا۔ ایلی بھی ایک نوجوان لڑکا تھا۔ وہ بھی عالیہ کے ساتھ صرف ایک ہی چیز کے لئے ہمدردی کر رہا تھا۔ آخر میں ایلی کو بھی وہی چاہیے تھا جو باقی سب مردوں نے اس سے وصول کیا تھا۔ اسے کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ بس ایلی کا انداز مہذب تھا۔ وہ پڑھا لکھا نوجوان لڑکا تھا۔ عالیہ میرے بارے میں ایسے ہی خیالات رکھتی تھی۔ اسے اپنی حیثیت کا پتہ تھا اس لئے وہ کسی خوش فہمی میں نہیں رہ رہی تھی۔ عالیہ کا محبوب اس کا شوہر عاکون اس سے الگ ہو کر مفسس چلا گیا تھا۔ ہمیں عالیہ کی شادی کا کوئی علم نہیں تھا۔ عالیہ اپنے شوہر عاکون کے لئے بہت روئی تھی لیکن پھر بھی ان کو الگ کر کے بیچ دیا گیا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے لیکن ہمارا سفید فام معاشرہ سیاہ فاموں کے جذبات کو نہیں سمجھتا تھا۔ ان کی شادیاں، بچے اور فیملی ہمارے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ عالیہ کو اس کی انگریز ماں نے بہت کچھ سمجھا دیا تھا اس لئے اسے معلوم تھا کہ غلامی کیا چیز ہوتی ہے۔ غلامی کی مہر اس کے کندھے پر لگ چکی تھی۔ اب اسے موت ہی اس سے نجات دلا سکتی تھی۔ وہ مرنے کے بعد ہی اپنے شوہر عاکون سے مل سکتی تھی۔ اس دنیا میں اب وہ دونوں کبھی ایک نہیں ہو سکتے تھے۔ عالیہ کو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ عاکون کو کہاں لے جایا گیا ہے۔ ہمیں عالیہ کے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لئے عالیہ نے بھی بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

”تم نے کل سے کھانا نہیں کھایا ہے، اس لئے تمہیں بھوک لگی ہوگی؟ میں تمہارے لئے کھانا لیکر آتا ہوں۔“ میں نے اس کو وہیں چھوڑا اور خود جہاز سے باہر آ گیا۔ بحری جہاز کے سامنے ہی بندرگاہ پر ایک

سرائے تھی۔ میں سیدھا وہاں گیا اور وہاں سے کھانا خریدنے لگا۔ پلاسٹک کا برتن تیار ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن وہ بہت مہنگا اور صرف بڑے بڑے امیر لوگوں کے لئے ہی تھا۔ جبکہ عام لوگوں کے لئے پیتل یا سلور کے برتن استعمال ہوتے تھے اور شاپر بیگ کی جگہ کپڑے کے تھیلے استعمال ہوتے تھے۔ میں نے سرائے سے دو بریڈ اور مٹی کے ایک پیالے میں سالن لیا اور دوبارہ بحری جہاز کی طرف آ گیا۔ وہاں ایک پہریدار عالیہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میں وہاں پہنچا تو وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”یہاں کیا کر رہے ہو؟“ میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

”کچھ نہیں، ویسے ہی بیٹھا ہوا تھا۔ کافی خوبصورت لڑکی ہے۔“ اس نے نارمل انداز میں کہا۔ اس کے چہرے پر شیطانیت رقص کر رہی تھی۔ یہ ہماری غلام ہے اور تم ہماری اجازت کے بغیر اسے ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ میں نے عالیہ کے سامنے سالن رکھا اور دونوں بریڈ اس کے حوالے کر دیئے۔

”بچے! اتنا غصہ بھی اچھا نہیں ہوتا۔ یہ کوئی صاف ستھری عورت ہے جسے آج تک کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا ہوگا؟“ پہریدار نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا؟ تو ہاتھ لگا کر دکھاؤ! تمہاری اوقات اسے ہاتھ لگانے کی بھی نہیں ہے۔ ایک ہزار ڈالر قیمت ہے اس کی۔۔۔ بیس ڈالر تنخواہ بھی نہیں ہے تمہاری اور بات کر رہے ہو۔“ میں نے جیب سے کاغذ نکالا اور اسے پہریدار کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

”غیرت غلام کی نہیں اس کے مالک کی ہوتی ہے۔ اب جاؤ اور اوپر جا کر پہرہ دو ورنہ اگر میں نے ایسوسی ایشن کو شکایت کر دی تو نوکری بھی جائے گی۔“ میں نے اس کے ہاتھ سے کاغذ پکڑا اور اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ میری طرف غصے سے دیکھنے لگا۔ عالیہ بھی کھانا چھوڑ کر میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ پہریدار کافی دیر تک مجھے گھورتا رہا اور پھر خاموشی سے اوپر کی طرف جانے لگا۔

”کتنا ہمیشہ بکریوں کے ریوڑ میں پھرتے پھرتے اپنے آپ کو شیر سمجھنے لگتا ہے۔ حالانکہ وہ ہوتا کتا ہی ہے جو مالک کی بکریوں کی حفاظت کرتا ہے۔“ میں نے پیچھے سے آواز لگائی۔ اس نے ایک پل کے لئے مڑ کر دیکھا اور پھر خاموشی سے اوپر چلا گیا۔ عالیہ میری بات پر مسکرانے لگی۔

”ایلی! آپ تو کافی غصے والے ہیں۔ میں نے تو آپ کو بہت معصوم سا لڑکا سمجھا ہوا تھا۔“ عالیہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایسی بات نہیں ہے عالیہ! مجھ سے غلط بات برداشت نہیں ہوتی۔ میں کسی سے ڈرتا بھی نہیں ہوں۔ ویسے تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کمزور پر ظلم کرنا انسانیت نہیں ہوتی۔ اس لئے آرام سے کھانا کھاؤ۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اچھا! کمزوروں کو غلام بنانا تو انسانیت ہے نا؟“ اس نے ایک پل کے لئے میری طرف دیکھا اور پھر دوبارہ کھانا کھانے میں مصروف ہو گئی۔

اس کے ایک جملے نے ہی مجھے لا جواب کر دیا تھا۔ میرے پاس صفائی دینے کے لئے کوئی الفاظ ہی نہیں رہ گئے تھے۔ اس لئے خاموشی سے اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ کھانا کھانے کے بعد میں کافی دیر تک وہیں اس کے پاس ہی بیٹھا رہا اور پھر وہاں سے اٹھ کر واپس ہوٹل آ گیا۔ مسلح پہریداروں کو واپس آتے ہوئے بھی میں دھمکی دے کر آیا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ وہ عالیہ کو ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے۔ بحری جہاز پر پہریدار کی نوکری بہت اچھی نوکری تھی اور وہ اس نوکری کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اس دور میں اصل طاقت بڑے بڑے زمینداروں اور صنعت کاروں کی ہی ہوتی تھی۔ امریکہ میں جمہوریت تھی لیکن اس جمہوریت کو چلانے والے یہی زمیندار اور صنعت کار ہی تھے۔ آسٹن شہر کے مشیر میرے ابو کے ذاتی دوست تھے۔ میرے والد امریکی سیاسی پارٹی ری پبلکن کو سپورٹ کرتے تھے۔ وہ ری پبلکن کو سالانہ چندہ بھی دیتے تھے۔ آسٹن شہر کے مشیر بھی ری پبلکن کے تھے۔ ان مسلح پہریداروں کو زمینداروں کی طاقت کا پتہ تھا اس لئے ان میں سے کوئی بھی عالیہ کے نزدیک نہیں آیا تھا۔ شام تک میرے والد نے باقی غلام بھی خرید لئے اور وہ واپسی ہوٹل آ گئے۔ ابو نے واپسی کی تیاری کرنے کا کہا اور ہم سب جلدی جلدی سامان پیک کرنے لگے۔

رات کو آٹھ بجے بحری جہاز نے روانہ ہونا تھا۔ ہم سب ساڑھے سات بجے ہی بحری جہاز میں سوار ہو گئے۔ ٹھیک آٹھ بجے جہاز نے تین بڑے بڑے ہارن دیئے۔ ملاحوں نے جہاز کے لنگر اٹھائے اور جہاز آہستہ آہستہ بندرگاہ سے باہر نکلنے لگا۔ 10 بجے کے قریب ہم کورپس کرسٹی سے باہر نکل کر کھلے سمندر میں آ گئے تھے اور اب تیزی سے مٹا گوردہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہاں دریائے کولوراڈو کا دھانہ تھا۔ بحری جہاز وہاں سے دریائے کولوراڈو میں داخل ہو جاتا اور پھر اوپر آسٹن شہر تک ہم دریا میں ہی سفر کرتے۔ آسٹن شہر کے بعد ہم نے یہ جہاز بدل کر ایک اور نسبتاً چھوٹے بحری جہاز میں سفر کرنا تھا جو اوپر پچنان جھیل تک جاتا تھا۔ ہم پچنان جھیل کے بالکل قریب برنٹ گاؤں میں رہتے تھے۔ ہم آسٹن شہر سے 80 کلومیٹر جبکہ پچنان جھیل

سے صرف 15 کلومیٹر کے فاصلے پر رہتے تھے۔ بحری جہاز کھلے سمندر میں داخل ہوا تو میں نیچے عالیہ کے پاس آ گیا۔ میرے والد نے ٹوٹل دس غلام خریدے تھے۔ ان میں تو نو مرد غلام تھے جبکہ ایک عالیہ تھی۔ جہاز کا نچلا تہہ خانہ اس وقت سیاہ فام غلاموں سے بھرا ہوا تھا۔ نیچے تہہ خانے میں اس وقت کوئی پانچ سو کے قریب غلام موجود تھے۔ یہ پورا تہہ خانہ ہی غلاموں سے کچھا کچھ بھرا ہوا تھا۔ میں نے ہال پر ایک سرسری نظر ڈالی اور عالیہ کے پاس آ گیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے ہوئے بیٹھی تھی۔ اسے میری آہٹ سنائی دی تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

”کیسی ہو عالیہ؟“ میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہوں! جینے کی کوشش کر رہی ہوں۔“ وہ عجیب سے انداز سے بولی۔

”ارے! آپ تو بڑی جلدی مایوس ہو گئی ہیں؟“ مجھے لگا آپ کافی بہادر لڑکی ہوں گی۔ میں نے متفکر

لہجے میں کہا۔

”ارے نہیں ایلی! اب آپ نے میرے ایک ہزار ڈالر بھرے ہیں، آپ کو نقصان تو نہیں ہونے دوں

گی نا؟“ وہ مسکرانے لگی۔

”چلو اچھی بات ہے۔۔۔ مجھے لگا شاید تم خود کشی کا سوچ رہی ہو۔ غلامی کی زندگی بہت مشکل زندگی

ہوتی ہے۔ شاید تم اسے سہہ نہ پاؤ گی۔“ میرے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

”میں مرنے والی نہیں ہوں ایلی صاحب! ہمارے مذہب میں خود کشی حرام ہے۔“ اس نے ٹھوس لہجے

میں کہا۔

”تمہارا مذہب؟ تم تو ہندو نہیں ہو؟“ میں نے سوال کیا۔

”نہیں! میں ہندوستان سے ہوں لیکن ہندو نہیں ہوں بلکہ مسلمان ہوں۔ ہندوستان میں مسلمان بھی

کافی تعداد میں ہیں۔ ہم نے ایک ہزار سال تک ہندوستان پر حکومت کی ہے۔“ عالیہ میری طرف دیکھنے

لگی۔ میں نے ہندو اور مسلمان دونوں مذاہب کے بارے میں پڑھا ہوا تھا۔ مجھے ہندوستان کی تاریخ بھی

پتہ تھی۔ اس زمانے میں متحدہ ہندوستان دنیا کے امیر ترین ممالک میں شمار ہوتا تھا۔

”اوہ! تو تم مسلمان ہو؟ میں نے اسلام کے متعلق کافی پڑھا ہوا ہے۔ تم بھی ہماری طرح ایک خدا کی ہی

عبادت کرتے ہو اور تم ہمارے نبی عیسیٰؑ کو بھی مانتے ہو؟“ مجھے اس کی باتوں سے دلچسپی ہو گئی۔

”جی! مسلمان حضرت عیسیٰؑ اور موسیٰؑ دونوں نبیوں کو مانتے ہیں۔ اس کے علاوہ باقی بھی سارے نبیوں کو مانتے ہیں۔“ وہ بھی اب باتوں میں دلچسپی لینے لگی۔

میں کافی دیر تک وہیں اس کے پاس بیٹھا رہا اور پھر واپس اوپر جہاز کے عرشے پر چلا گیا۔ اس بار چونکہ ہم نے دریا کی مخالف سمت میں سفر کرنا تھا اس لئے ہمیں آسٹن پہنچنے میں چار دن لگ گئے۔ وہاں سے ہم نے جہاز تبدیل کیا اور دوسرے جہاز میں بیٹھ گئے۔ مزید ایک دن کا سفر کر کے ہم بچان جھیل پہنچ گئے۔ آگے برنٹ گاؤں تک کا سفر ہم نے گھٹی میں طے کیا۔ گھٹی میں جتے ہوئے دونوں گھوڑے کافی تیز رفتار تھے۔ انھوں نے دو گھنٹے میں ہی ہمیں برنٹ گاؤں پہنچا دیا۔ گھر والے ہمارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ گھٹی گاؤں پہنچتے ہی ایک ہنگامہ سا شروع ہو گیا۔ ہمارا اپنا گھر بھی کافی بڑا تھا۔ ہماری اپنی فیملی بھی کافی بڑی تھی اس کے علاوہ میری منگیتز فلورین بھی اسی گاؤں کی رہنے والی تھی۔ ان کی فیملی بھی کافی بڑی تھی۔ فلورین کے والد ہمارے ٹاؤن کے میئر بھی تھے۔

گاؤں یا ٹاؤن کے میئر ہمارے پاکستانی نمبردار کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کا کام بھی بالکل نمبردار کی طرح ہی ہوتا ہے۔ دونوں میں صرف ایک فرق ہوتا ہے۔ پاکستان کے نمبردار موروثی ہوتے ہیں۔ باپ کے بعد اس کا بڑا بیٹا نمبردار بن جاتا ہے۔ جبکہ یہاں ہر چار سال بعد ووٹ ہوتے تھے اور گاؤں والے اپنی مرضی سے میئر چنتے تھے۔ یہی گاؤں دیہات کے چھوٹے چھوٹے میئرل کرشہر کے بڑے میئر کا انتخاب کرتے تھے۔ پاکستان میں یہی عہدہ ناظم کا ہوتا ہے۔ یہ پورے شہر کے مالک ہوتے ہیں اور شہر کے تمام معاملات یہی میئر سنبھالتے ہیں۔ برنٹ گاؤں کافی بڑا تھا۔ میری منگیتز فلورین کی فیملی گاؤں کی میئر تھی۔ ان کے دادا پہلے گاؤں کے میئر ہوا کرتے تھے۔ دادا کے بعد اب ان کے والد میئر بنے تھے۔ فلورین کے والد سریوں کافی اچھے میئر تھے۔ گاؤں والے ان سے محبت کرتے تھے۔ ہمارے گھر پہنچنے کی اطلاع انہیں ملی تو وہ بھی آ گئے۔ فلورین بھی ان کے ساتھ ہی آ گئی۔ ہم نے ملازموں کے ساتھ مل کر سامان اتارا اور نئے آنے والے غلاموں کو ڈیرے پر بھیج دیا۔ جبکہ عالیہ کو گھر میں ہی روک لیا۔ میں نے راستے میں ہی ابو سے اجازت لے لی تھی کہ میں عالیہ کو گھر میں ہی کچھ عرصہ رکھنا چاہتا ہوں۔ عالیہ ہندوستان اور اسلام کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی اور میں اس سے یہ سب کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ ابو عالیہ کو گھر رکھنے پر تیار نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے عالیہ پہلے کچھ عرصہ ڈیرے پر گزارے۔ نئے آنے والے غلاموں کو پہلے ڈیرے پر ہی رکھا جاتا تھا۔ وہ

زمیندارے کی سختیاں سہتے تھے تو ٹھیک ہو جاتے تھے۔ ورنہ اگر پہلے ہی ان کے نازخزے اٹھانے شروع کر دیئے جائیں تو پھر وہ بگڑ جاتے تھے۔ یہ ابو کا ماننا تھا اور وہ عالیہ کو اسی لئے پہلے ڈیرے پر رکھنا چاہتے تھے۔ میں نے عالیہ کے لئے کافی ضد کی تو آخر کار ابومان ہی گئے۔ ویسے بھی میرے صرف چھ مہینے رہ گئے تھے۔ میری تعلیم مکمل ہو جاتی تو ابو مجھے واشنگٹن بھیجنا چاہتے تھے۔ تاکہ میں وہاں جا کر کسی اچھے عہدے پر کام کر سکوں۔ میں نے قانون کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ابو مجھے جج بنانا چاہتے تھے۔ میں کافی نرم دل طبیعت کا مالک تھا۔ میں ملازمین اور غلاموں پر زیادتی نہیں کر سکتا تھا اس لئے کبھی بھی زمیندارے کے کام میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

”اوہ ایلی! تم آگئے ہو؟ میں تمہارا کب سے انتظار کر رہی تھی۔“ میری منگیتر فلورین نے مجھ سے لپٹتے ہوئے کہا۔ اس نے مجھے نگہی سے پورا نیچے اترنے بھی نہیں دیا تھا۔

”ارے یار! میں کونسا یورپ چلا گیا تھا۔۔۔ یہیں سمندر تک ہی تو گیا تھا۔“ میں نے فلورین کو اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا اور امی کی طرف بڑھ گیا۔

”امی آپ کیسی ہیں؟“ میں نے اپنی والدہ سے خیریت پوچھی۔

”بیٹا! ٹھیک ہوں۔ آپ لوگوں کا انتظار کر رہی تھی، مجھے تمہاری بہت فکر ہو رہی تھی۔“

”ارے ڈیانا! ہمارا ایلی اب بڑا ہو گیا ہے، اس کی فکر اب مت کیا کرو۔“ ابو نے مسکراتے ہو کہا۔

”اچھا ایلی! تم اس لڑکی کو سرورٹ کو اڑ لے جاؤ اور گھر کے باقی ملازمین سے بھی ملو ا دو۔۔۔ اور اسے کام بھی سمجھا دینا! ٹھیک ہے؟ مجھے کسی شکایت کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔“ ابو نے عالیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے ابو! میں سمجھا دوں گا۔“ میں نگہی میں کھڑی عالیہ کی طرف بڑھ گیا۔

”ایلی! اگر مجھے ہلکی سی بھی شکایت ملی تو اسی وقت اسے ڈیرے پر بھیج دوں گا۔ یہ اسے اچھی طرح سمجھا دینا۔“ ابو نے ایک بار پھر وارننگ دی اور میں عالیہ کے پاس چلا گیا۔

”ڈیانا! نئی غلام خریدی ہے، ہندوستانی مسلم ہے۔ ایلی اس سے ہندی بھی سیکھ لے گا اور اسلام مذہب کے بارے میں بھی کچھ معلومات حاصل کر لے گا۔ تم دو تین کپڑوں کے پرانے جوڑے اسے دے دینا، اس کے کپڑے بہت پرانے ہو گئے ہیں۔“ ابو اس بار امی سے کہنے لگے۔

”ایلی! نئی غلام خریدی ہے؟“ فلورین بھی میرے پیچھے پیچھے ہی آگئی۔

”ہندوستانی؟ ہندوستانی۔۔۔؟ تم ہندوستان۔۔۔“ فلورین اسے اشاروں سے پوچھنے لگی۔

”اسے انگلش آتی ہے اس لئے انگلش میں بھی بات کر سکتی ہو۔“ میں نے فلورین کو اشارے کرتے

دیکھا تو اسے بتانے لگا۔

”کیا۔۔۔؟ کیا اسے انگلش آتی ہے؟“ وہ غیر یقینی سے عالیہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”جی میم! مجھے انگلش آتی ہے۔“ عالیہ نے مختصر جواب دیا۔

”واہ ایلی! یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ مجھے بھی ہندوستان کو جانے کا بہت شوق ہے۔“ فلورین نے پر

اشتیاق لہجے میں کہا۔ (اٹھارویں صدی میں ہندوستان اور پاکستان ایک ہی ملک ہوا کرتے تھے جسے ہم برصغیر جبکہ بیرون ملک میں ہندوستان یا انڈیا کے نام سے جانتے تھے۔ یہاں میرا ہندوستان لکھنے سے مراد

انڈیا اور پاکستان دونوں ہی ہیں)

”ہندوستان تو بہت امیر ملک نہیں ہے اور وہاں کے غلام بھی نہیں ہوتے، تو پھر تم کیسے غلام بن گئیں؟“

فلورین کا اشتیاق بڑھ گیا تھا۔

”فیلی! یہ بہت لمبا سفر کر کے آئی ہے اس لئے بہت تھک گئی ہوگی۔ اسے پہلے آرام کرنے دو! یہ اب

ادھر ہی رہے گی۔ تمہارے پاس بہت وقت ہے اس سے پوچھنے کا۔“ میں نے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔

فلورین کا پورا نام تو فلورین ہی تھا لیکن اسے فیلی کہہ کر بلاتے تھے۔ فلورین چونکہ میری بچپن کی دوست

تھی، ہم دونوں اکٹھے ہی کھیلتے تھے اور ہماری دوستی بھی بہت زیادہ تھی اس لئے میرے نام ایلی کی مناسبت

سے اس کو بھی فیلی کہا جانے لگا تھا۔ فیلی کو اپنا یہ نام بہت پسند تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے

تھے۔ ہماری بچپن کی دوستی آہستہ آہستہ محبت میں بدل گئی تھی۔ فیلی اپنے والد لیون کی اکلوتی بیٹی تھی۔ انہوں

نے اپنی بیٹی کی خوشی کو دیکھتے ہوئے ہماری منگنی کر دی تھی اور اسی سال ہم دونوں شادی بھی کرنے والے

تھے۔ زندگی بہت خوبصورت اور جنت نظیر سی لگتی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے اور

دونوں ہی بہت جلد ایک ہونے والے تھے۔ مجھے کبھی کبھی اپنی قسمت پر رشک آتا تھا۔ میں برنٹ کے سب

سے امیر ترین زمیندار کا بیٹا تھا۔ گاؤں کی سب سے خوبصورت لڑکی جس سے میں محبت کرتا تھا وہ بہت جلد

میری بیوی بننے والی تھی۔ میں واشنگٹن ڈی سی جانے والا تھا۔ آسٹن شہر کے میئر میری سفارش کر رہے تھے اور

میں بہت جلد واشنگٹن کا ایک بڑا افسر بننے والا تھا۔ شاید میں واقعی ایک خوش قسمت ترین نوجوان تھا جسے سب کچھ ہی بغیر مانگے مل رہا تھا۔

میں عالیہ کو لیکر گھر کے ایک کونے میں بنے ہوئے سرونٹ کو اڑ میں آ گیا۔ یہ چار چھوٹے چھوٹے کمرے تھے جو گھر کے بالکل ایک کونے میں مرکزی دیوار کے ساتھ بنے ہوئے تھے۔ یہ چاروں ایک قطار میں بنے ہوئے تھے جبکہ آخر میں ایک کنواں بھی تھا۔ اس زمانے میں ابھی نکا ایجاد تو ہو چکا تھا لیکن وہ ابھی تک مشہور نہیں ہوا تھا۔ نکا ابھی تک امریکہ کی شمال مشرقی ریاستوں تک ہی آیا تھا۔ ٹیکساس میں ابھی تک کنوؤں سے ہی پانی نکالا جاتا تھا۔ اس دور میں باتھ روم بھی گھروں کے اندر اٹیچ بنانے کی بجائے کمروں سے باہر بنائے جاتے تھے۔ ہمارے گھر میں دو باتھ روم تھے۔ ایک مرکزی باتھ روم تھا جو ہمارے لیونگ روم کے ساتھ ہی بنا ہوا تھا۔ جبکہ دوسرا گھر کے باہر ملازمین کے کمروں کے پاس تھا۔ یہ ملازمین اور غلاموں کے لئے تھا۔ ہمارے باتھ روم کے اوپر ایک ٹینکی بنی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں پلاسٹک کی ٹینکی کی بجائے سیمنٹ کی مدد سے ہی ٹینکی بنائی جاتی تھی۔ باتھ روم میں ایک سیڑھی بھی لگی ہوئی تھی۔ ملازم صبح اٹھ کر کنوئیں سے پانی نکال لیتے تھے اور اس ٹینکی کو بھر دیتے تھے، جو سارا دن استعمال ہوتا تھا۔ باتھ روم کے ساتھ ہی ایک لوہے کا آدھا کٹا ہوا ڈرم بھی رکھا ہوا تھا جس کے نیچے لکڑی جلا کر پانی گرم کیا جاتا ہے۔ یہ سردیوں میں کیا جاتا تھا۔

ٹیکس کا موسم بالکل پاکستان کے صحرائی علاقوں کی طرح گرم اور خشک ہوتا ہے۔ یہاں بارشیں بالکل نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔ یہ علاقہ ریگستانی نہیں ہے۔ یہاں دریا کو لوراؤ کی وجہ سے پانی وافر مقدار میں دستیاب ہے جو فصلوں کو کاشت کرنے کے کام آتا ہے۔ کو لوراؤ دور یا امریکہ کے چند بڑے دریاؤں میں سے ایک ہے۔ کھاتے اس دریا کی کوئی درجن سے اوپر بڑی بڑی جھیلیں ہیں۔ جبکہ چھوٹی جھیلوں کی تعداد تو سینکڑوں میں ہے۔ ہمارے گاؤں کے نزدیک جھیل بچنان بھی انہیں جھیلوں میں سے ایک ہے۔ میں اور فلورین عالیہ کو لیکر سرونٹ کو اڑ آ گئے۔

”اوہ مالک! آپ آئے ہیں۔“ ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے تو وہاں مائیکل لیٹا ہوا تھا۔ مائیکل پچیس سال کا ایک افریقی غلام تھا۔ یہ ہمارے پاس پندرہ سال کی عمر میں آیا تھا اور پچھلے بیس سال سے ہمارے ساتھ ہی رہ رہا تھا۔ مائیکل میری پیدائش سے بھی پہلے کا یہاں آ گیا تھا۔ میرا سارا بچپن اسی کے ساتھ کھیلتے ہوئے گزرا تھا۔ میں نے اپنے بچپن کی ساری شرا تیں اسی مائیکل کے ساتھ مل کر کی تھیں۔

حقیقت میں شرارتیں تو میں کرتا تھا لیکن اس کا الزام ہمیشہ مائیکل پر آتا تھا۔ وہ ابو اور بھائیوں سے مار بھی کھاتا تھا لیکن پھر بھی کبھی سچ نہیں بتاتا تھا۔ مائیکل صرف رنگ کا کالا تھا اور غلام تھا جبکہ حقیقت میں وہ انتہائی اجلا انسان تھا۔ میرے گھر والے باقی غلاموں کی نسبت مائیکل پر کم سختی کرتے تھے۔

ہم لوگ مائیکل پر اعتماد کرتے تھے۔ ابو نے ایک ساہ فام عورت سے مائیکل کی شادی کروادی تھی۔ جس سے اس کے 3 بچے بھی تھے۔ مائیکل کی 2 بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ اس کا بیٹا دس سال کا جبکہ دونوں بیٹیاں آٹھ سال کی جڑواں تھیں۔ مائیکل کی بیوی اور بچے سارے ہمارے ہی گھر میں رہتے تھے اور یہیں گھر کے کام میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ اس وقت باقی تو سارے ہی کام کر رہے تھے صرف مائیکل ہی یہیں موجود تھا۔ اس کی دو تین دن سے طبیعت خراب ہو رہی تھی۔ اسے بخار ہو رہا تھا اس لئے ابو نے اسے آرام کرنے کا کہا تھا۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو اس وقت وہ چار پائی پر لیٹا آرام کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”مائیکل! آپ آرام کرو، ایسے ہی اٹھ کر کھڑے ہو گئے ہو۔۔۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ میں نے آرام کرنے کا کہا۔

”کوئی بات نہیں مالک! میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”مائیکل! میں نے کتنی بار آپ سے کہا ہے کہ مجھے مالک مت کہا کرو۔ کسی دن تمہاری میری لڑائی ہو جانی ہے۔“ میں نے مصنوعی غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”سوری ایل! مجھے مالک کہنا اچھا لگتا ہے۔ آپ ہمارے مالک ہی تو ہیں۔“ اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

”یار! میرے والد، بھائیوں اور دوسرے سبھی افراد کو بے شک مالک کہو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم مجھے بس ایل کہنا کرو، مجھے اچھا لگتا ہے۔ میں آپ کو دوست سمجھتا ہوں۔“ میں نے احتجاج کیا۔

”اچھا! میں کوشش کروں گا۔ ویسے یقین کریں جتنا مزا آپ کو مالک کہنے میں آتا ہے اتنا مزا اور کسی کو کہنے میں نہیں آتا۔ میں دل سے آپ کو مالک کہتا بھی ہوں اور سمجھتا بھی ہوں۔ اس گھر میں مجھے جتنا بھی مقام ملا ہے وہ سب آپ کی وجہ سے ہی ہے۔ آپ کی دوستی نے ہی مجھے یہ عزت بخشی ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ میرے پیچھے کھڑی عالیہ بھی اب متاثر نظر آنے لگی تھی۔

”اچھا اچھا! اب زیادہ مکھن مت لگاؤ، دوست ہو اور دوست ہی رہو۔ میں ایک نئی مہمان لے کر آیا ہوں آپ کا تعارف کروا دیتا ہوں۔ یہ عالیہ ہے، ہماری نئی غلام۔۔۔ آج سے یہ بھی ادھر ہی رہے گی۔ آپ اس کا بھی کوئی انتظام وغیرہ کر دیں۔“ میں نے عالیہ کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

”اوہ عالیہ! یہ افریقین نام تو نہیں ہے۔۔۔ یہ پہلے بھی کسی کی غلام رہ چکی ہے؟“ مائیکل نے عالیہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ سمجھا عالیہ کو ہم نے کسی اور مالک سے خریدا ہے۔

”نہیں مائیکل! یہ پہلی بار ہی غلام بن رہی ہے۔ ہندوستان سے ہے اور یہ مسلم ہندوستانی نام ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”ہندوستان میں نے بھی سنا ہوا ہے، بہت بڑا ملک ہے اور کافی امیر بھی ہے۔ کیا وہاں بھی سیاہ فام رہتے ہیں؟“ اس نے سوال کیا۔

”نہیں! ہندوستان کے لوگوں کے رنگ براون ہوتے ہیں۔ میں بہاولپور ریاست سے ہوں جو ریگستان پر مشتمل ہے۔ گرمی کی وجہ سے ہم کالے ہو جاتے ہیں۔ ویسے باقی ہندوستان سفید اور براون رنگ کا ہے۔“ اس بار عالیہ نے براہ راست جواب دیا۔

”اوہ! اگر تمہارا رنگ تھوڑا سا بھی سفید ہو جاتا تو تم غلام بننے سے بچ جاتی۔“ وہ بہت اداس سی نظر آنے لگی تھی۔

”اچھا اچھا! اب زیادہ باتیں مت کرو، وہ بے چاری ابھی ابھی بہت لمبا سفر کر کے آئی ہے۔ اسے آرام کرنے دو پھر ساری زندگی یہ ادھر ہی ہے۔ جتنی مرضی باتیں کر لینا۔“ میں نے جلدی سے بولتے ہوئے کہا۔

”مائیکل! تم دیکھ لو اسے کونسے کمرے میں سلانا ہے۔ کپڑے وغیرہ میں ابھی اپنی ماں سے لیکر آ جاتا ہوں۔ دو تین کپڑے ہو گئے تو بہترین ہو جائے گا۔ باقی تم اسے ہمارے گھر کا ماحول وغیرہ بھی سمجھا دینا۔ ابو اور بھائی کافی سخت طبیعت کے ہیں۔ باقی میں، اوکسانہ اور فلورین نارمل ہی ہیں اور گھر میں زیادہ تر ہم ہی ہوتے ہیں۔ ابو اور بھائی صبح ڈیرے پر چلے جاتے ہیں اور پھر شام کو ہی واپس آتے ہیں۔ کوشش کرنا اس کا سامنا کم ہی ہو۔“ میں نے مائیکل کو سمجھایا اور عالیہ کو اس کے پاس چھوڑ کر واپس آ گیا۔

گھر میں کافی رونق لگی ہوئی تھی۔ میری بہن اوکسانہ اوپر چھت پر تھی۔ میں اور فلورین دونوں چھت پر چلے گئے۔ اس زمانے میں زیادہ تر مکانات ایک منزل ہی ہوتے تھے۔ لوہا بہت مہنگا تھا اس لئے گھروں کی

چھتیں لکڑی کے شہتیروں اور بانسوں کی مدد سے بنائی جاتی تھیں۔ گارڈر کی جگہ لکڑی کے بڑے بڑے شہتیر اور ٹیر کی جگہ پر بانس ڈالے جاتے تھے اور پھر بڑے بڑے پتلے بلاک ڈال کر اوپر سے مٹی کا لپ کر دیا جاتا تھا۔ مکمل لکڑی کی چھت بھی بنائی جاتی تھی۔

”بھائی جی! ہماری یاد بھی آگئی ہے آپ کو؟“ اوکسانہ نے شکوہ کیا۔ وہ ہمیں دیکھ کر خوش ہو گئی تھی۔
 ”یار! نیچے تم سے بھی ملا تھا۔ اس کے بعد عالیہ کو کمرے میں لے گیا تھا۔ تم ہمارے ساتھ آئی ہی نہیں۔“
 میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے زیادہ رش میں اچھا نہیں لگتا ہے اس لئے آپ سے مل کر فوراً ہی اوپر آگئی تھی۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”اچھا! تمہیں عالیہ سے ضرور ملنا چاہیے، بہت پیاری لڑکی ہے۔“ فلورین نے تعریفی لہجے میں کہا۔
 اسے عالیہ کافی پسند آئی تھی۔

”اچھا؟ چلو دیکھ کر آتے ہیں۔“ اس نے فلورین کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔
 ”نہیں اوکسانہ! تم جاؤ میرا دل نہیں کر رہا ہے۔“ فلورین نے بہانا بنایا۔
 ”اچھا! تو ویسے ہی کہو نا! میں نیچے چلی جاتی ہوں۔“
 ”بڑے دنوں بعد ایللی آیا ہے، کچھ پیار محبت کی باتیں بھی کر لینے دونا!“ فلورین نے اوکسانہ کی بات درمیان سے کاٹی۔

”دو پیار کرنے والوں کے درمیان ہڈی نہیں بنتے۔“ فلورین نے شرارتی لہجے میں کہا تو اوکسانہ مسکراتے ہوئے نیچے چلی گئی۔

”کیوں جی! بڑے سخت مزاج ہو آپ۔۔۔ لوگوں کو اداس کروا کر آپ کو بڑا مزا آتا ہے۔“ اوکسانہ کے نیچے جاتے ہی وہ میرے گلے لگ گئی۔

”اچھا! ہمارے جانے کے بعد کتنے اداس ہوئے ہیں آپ؟“ میں نے اس کی زلفوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

”ایلی! میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں۔ تمہارے بغیر تو ایک پل بھی اکیلے نہیں گزرتا۔“ اس نے چہرا اوپر اٹھایا تو میں نے اپنے ہونٹ اس کے گالوں پر رکھ دیئے۔ اگلے کئی لمحوں تک ہم پیار بھری سرگوشیاں

کرتے رہے۔ نیچے کھانا تیار ہو گیا تو اوکسانہ اوپر بلانے کے لئے آگئی۔ ہم دونوں نیچے چلے گئے۔ فلورین کے والد اور والدہ بھی نیچے آئے ہوئے تھے۔ میں ان سے ملنے کے بعد وہیں ان کے ساتھ ہی بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ کھانے کے بعد میں نے ایک چکر عالیہ کی طرف لگایا، وہ سوئی ہوئی تھی۔ مائیکل اسے اٹھانے لگا لیکن میں نے منع کر دیا۔ میں اپنے ساتھ عالیہ کے لئے کھانا لیکر آیا تھا۔ میں نے وہ کھانا مائیکل کے حوالے کیا اور اسے تاکید کی وہ عالیہ کو جگا کر کھانا نہ کھلائے بلکہ اسے سونے دے۔ میں نے ایک نظر درمی پر سوئی ہوئی عالیہ پر ڈالی اور کمرے سے باہر آ گیا۔

اگلے دو مہینے ایسی ہی ہنگاموں سے بھر پور گزرتے رہے۔ عالیہ کو ہمارے ساتھ ایڈ جسٹ ہونے میں تھوڑی مشکل تو ضرور ہوئی لیکن وہ بحر حال ایڈ جسٹ ہو گئی تھی۔ اس نے غلامی کے ساتھ ہی جینا سیکھ لیا تھا۔ دکھ اور تکلیفیں خدا نے انسان کو اپنی طرف بلانے کے لئے بنائی ہیں۔ عالیہ بھی خدا کے نزدیک آچکی تھی۔ مجھے اسلام اور ہندوستان دونوں کے متعلق جاننے کا بہت شوق تھا۔ عالیہ نے مجھے بتانے کے ساتھ مائیکل اور اسکی بیوی اور بچوں کو بھی اسلام کی تربیت دینی شروع کر دی۔ میرے والد ایک کٹر عیسائی تھے۔ عالیہ کے اسلام کی متعلق تبلیغ آہستہ آہستہ گھر میں پھیلنے لگی اور بہت جلد ہی ابونتک پہنچ گئی۔

سیاہ فام غلاموں کا کوئی بھی مذہب نہیں ہوتا تھا۔ یہ لوگ سورج چاند ستاروں کی عبادت کرتے تھے اور ان کے اندر بہت سی توہمات ہوتی ہیں۔ ہم لوگ ان سیاہ فام غلاموں کو عیسائیت کی تبلیغ بھی کرتے تھے۔ مقامی چرچ کا پادری ہفتے میں ایک بار مختلف ڈیروں پر جا کر عیسائیت کی تعلیم دیتا تھا۔ پادری اتوار کو چرچ میں سفید فاموں کو تعلیم دیتا تھا جبکہ باقی ہفتے کے چھ دن وہ مختلف ڈیروں پر جا کر غلاموں کو عیسائیت کے بارے میں بتاتا تھا۔ مذہب انسان کو خدا کے نزدیک لاتا ہے۔ یہ انسان کو نیک عمل کرنے کا پابند بناتا ہے تاکہ وہ نیک اور صالح عمل کر کے جنت میں اپنا مقام حاصل کر سکے۔ مذہب کا بنیادی کام ایک انسان کو معاشرے میں اچھا انسان بنانا ہوتا ہے۔ یہ بنیادی بات ہے لیکن یہی مذہب ایک اور کام بھی کرتا ہے۔ مذہب انسانوں کو اکٹھا کرتا ہے اور یہ انسانوں کو محکوم بناتا ہے۔

”آپ مذہب کا سہارا لیکر انسانوں پر حکومت کر سکتے ہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”ارے باباجی! آپ کیا کہہ رہے ہو؟ کہیں آپ لا مذہب تو نہیں ہو؟“ امریکی سفیر کے ملازم نے مجھے درمیان سے ٹوکتے ہوئے کہا۔ میں کہانی کے بہتے فلو سے باہر آ گیا۔

”بچے! نام کیا ہے تمہارا؟“ میں نے مسکراتے ہوئے اس سے سوال کیا۔ وہ اب بھی میری طرف غصے سے دیکھ رہا تھا۔ ہمارے مسلمان معاشرے کی یہی بد نصیبی ہے۔ ہم غصہ اور کفر کا فتویٰ پہلے لگاتے ہیں اور تحقیق بعد میں کرتے ہیں۔

”نام کیا ہے بچے تمہارا؟“ میں نے دوبارہ اس سے نام پوچھا۔

دونوں ممالک کے سفیر اس کی طرف غصے سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے اچھی خاصی چلتی ہوئی کہانی کو بریک لگا دی تھی۔ وہ اس گھر کا ملازم تھا لیکن جب مذہب پر بات آتی ہے تو کٹر مذہبی لوگ کسی بھی بات کی پروا نہیں کرتے۔ وہ نوجوان بھی اپنی نوکری کی پروا کئے بغیر مجھے ٹوک بیٹھا تھا۔

”نذیر۔۔۔ میرا نام نذیر احمد ہے۔“ اس نے ترش لہجے میں کہا۔ اس کا غصہ ابھی تک مجھ پر قائم تھا۔ میں نے غلط کہا تھا کہ مذہب انسانوں کو محکوم بناتا ہے اور مذہب کا سہارا لیکر انسان لوگوں پر حکومت کرتا ہے۔ اس کے مطابق یہ غلط بات تھی اور اسی لئے وہ مجھے لامذہب یاد ہرے کا طعنہ دے رہا تھا۔

”بیٹا! تمہارا کوئی اور نام بھی ہے؟“ میں نے ایک اور سوال کیا۔

”نہیں! میرے ماں باپ نے میرا نام نذیر احمد ہی رکھا ہے اور یہی میرا نام ہے۔“ اس نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا! پیدائشی مسلمان بھی ہو؟“ میں نے پھر سوال کیا تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”اچھا! بچے نذیر احمد! میں پیدائشی مسلمان نہیں ہوں، میرا نام بھی عامر حسین نہیں تھا۔ میں عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا ہوں۔ میں نے اپنا بچپن اور نوجوانی عیسائیت میں رہ کر گزاری ہے لیکن اب پچھلے سو سال سے ایلن براؤن کی بجائے عامر حسین ہوں۔ میں پچھلے سو سال سے مسلمان ہوں۔ اپنے مذہب کو چھوڑ کر ایک نئے مذہب میں جاننا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ انسان کی پوری زندگی بدل جاتی ہے لیکن میں پھر بھی مسلمان ہوا ہوں۔ میں نے اپنے ماں باپ بہن بھائی اور ملک سب کچھ چھوڑا ہے۔ میں اب بھی پورے پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہوں۔ ایک سو بیس سال عمر ہے میری۔۔۔ کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتا لیکن پھر بھی مسجد میں جا کر بیٹھ کر نماز پڑھتا ہوں۔ انتہائی سردی میں ٹھنڈے پانی سے مجھے نمونیا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے (اس زمانے میں بجلی اور ہیٹریں گیزروغیرہ نہیں تھے)۔ بوڑھا ہوں، مجھے بھی مذہب اس چیز کی اجازت دیتا ہے کہ میں بغیر وضو کے ہی بستر میں نماز پڑھ سکتا ہوں لیکن پھر بھی وضو کر کے مسجد میں نماز پڑھتا ہوں۔ کیا تم بھی

یہ سب کچھ کرتے ہو؟ مجھے دہرایا لامذہب کا طعنہ دینے سے پہلے تم نے ایک بار بھی مجھے جاننے کی کوشش کی ہے؟ نہیں! تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ میں کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں اور میرا ماضی کیا ہے؟ بس ایک منٹ لگایا تم نے مجھے مسلمان سے کافر بنانے میں۔۔۔ جبکہ مجھے ایک عرصہ لگا تھا مسلمان بننے میں۔ یا را! اتنی جلدی اب کافر تو مت بناؤ!“ میں نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

”باباجی! آپ نے بات بھی تو غلط کی تھی نا؟“ اس نے واپسی شکوہ کیا۔

”اچھا! بچے سب سے پہلے بات تو یہ ہے کہ میں عیسائیت کی بات کر رہا ہوں۔ اس زمانے میں ہم لوگ غلاموں کو عیسائیت کی تعلیم دیتے تھے۔ مذہب ہمیشہ برداشت کرنا سکھاتا ہے۔ مذہب ہمیں ہر حالت میں خدا کا شکر ادا کرنے اور اچھے مستقبل کی امید دلاتا ہے۔ ہماری زندگی میں کوئی حادثہ ہو جاتا ہے، ہمارا کوئی عزیز مر جاتا ہے تو ہم خدا کی مرضی سمجھ کر صبر کرتے ہیں۔ ہم جنت کی آس میں اس دنیا کی ساری سختیاں برداشت کرتے ہیں۔ ہمارے لوگ اسی لئے غلاموں کو عیسائیت کی تعلیم دیتے تھے۔ پادری تو خدا کی رضا سمجھ کر خدا کا پیغام ان غلاموں تک پہنچاتے تھے لیکن ہمارا ان میں ایک اور فائدہ ہو جاتا تھا۔ جو بھی غلام عیسائیت سے متاثر ہو جاتا تھا پھر وہ ہمارا زیادہ وفادار بن جاتا تھا۔ ہم ان غلاموں کو بتاتے تھے کہ آقا کے کسی بھی حکم سے انکار کرنا گناہ ہوتا ہے۔ کسی انسان کو مارنا گناہ عظیم ہوتا ہے۔ اس سے وہ غلام احتجاج نہیں کرتے تھے۔ ہزار سختیوں کے باوجود وہ خدا کو یاد کرتے تھے اور عملی کوششوں کی بجائے دعائیں کرتے رہتے تھے۔

نذیر احمد! میرے بچے! صرف ہمارا اسلام ہی ایسا مذہب ہے جو مالک اور محکوم دونوں کے حقوق و فرائض کی مکمل تشریح کرتا ہے۔ اسلام میں مذہبی اور معاشرتی دونوں احکامات موجود ہیں جبکہ دوسرے مذاہب میں صرف مذہبی احکامات ہیں۔ اس زمانے میں اس چیز کا فائدہ ہم لوگ اٹھاتے ہیں۔ ہم مذہبی معاملات میں تو کوئی رد و بدل نہیں کرتے تھے لیکن معاشرتی معاملات ہم اپنی مرضی سے بناتے تھے۔ جن کی رو سے ہم اپنے غلاموں پر ہر قسم کا ظلم کر سکتے تھے اور ہم اپنے غلاموں کو مار بھی سکتے تھے۔ امریکی قانون بھی اس وقت ہمیں اس چیز کی اجازت دیتا تھا۔ امریکی معاشرت میں اس وقت سیاہ فاموں کے کوئی حقوق نہیں تھے۔ باغی اور سرکش غلاموں کو زنجیروں سے باندھ کر بھوکا پیاسا رکھا جاتا تھا۔ کوڑے مار مار کر ان کی چڑی ادھیڑی جاتی تھی۔ عورتوں اور مردوں کے مخصوص اعضا کاٹ دئے جاتے تھے۔ سلاخیں گرم کر کے ان کو داغا

جاتا تھا۔ گرمی اور دھوپ میں ان کو پتھروں پر گھسیٹا جاتا تھا اور الٹا لٹکا یا جاتا تھا۔ ان باغی غلاموں کو ٹرپا ترپا کر مار دیا جاتا تھا لیکن کوئی بھی قانون ہمیں اس لئے نہیں روکتا تھا۔ یہ سب امریکہ اور یورپی ممالک میں ہوتا تھا اور اسے کوئی بھی نہیں روکتا تھا۔ میں اس کا عینی شاہد ہوں۔ میں نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں نے اپنے معاشرے سے بغاوت کی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کتنا بڑا مسلمان ہوں لیکن ایک بات ضرور کہوں گا کہ میں بے دین نہیں ہوں۔ میں مسلمان ہوں اور خدا کے اس الہامی مذہب پر پورا یقین رکھتا ہوں۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”سوری باباجی! مجھ سے غلطی ہوگئی تھی، میں وقتی طور پر جذباتی ہو گیا تھا۔“ اس نے مجھ سے معافی مانگتے ہوئے کہا۔

”چلو کوئی بات نہیں! تم پھر چائے بنا لاؤ، مجھے چائے کی بہت طلب ہو رہی ہے۔“ میں نے امریکی سفیر کی طرف دیکھا۔

”ہاں ہاں نذیر! تم جلدی سے کچن میں جاؤ اور چائے بنا لاؤ، باباجی! آپ کہانی شروع کریں۔“ امریکی سفیر نے جلدی سے کہا۔

”سرجی! پانچ منٹ انتظار کر لیں، چائے آ جاتی ہے تو پھر شروع کر دوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔ ان کا نوکر نذیر بھی دلچسپی سے کہانی سن رہا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کچن میں ہمارے لئے چائے بناتا رہے اور میں کہانی سناتا رہوں۔۔۔ میں اس کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔ سفیر نے بھی میری بات سے اتفاق کیا اور وہ سب آپس میں باتیں کرنے لگے۔ سب کی گفتگو کا موضوع عالیہ ہی تھی۔ سب کی عالیہ کی کہانی سے دلچسپی بیدار ہوگئی تھی۔

”دادا! آپ بہت اچھے ہو۔۔۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ آپ کی زندگی اس قدر ہنگامہ خیز تھی۔“ عدنان میرے پیروں کے پاس آکر زمین پر بیٹھ گیا۔

نیچے فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اس لئے نیچے بیٹھنے میں مزا آتا تھا۔ کمروں میں قالین بچھنا اور زمین پر بیٹھنا اور سونا ایرانی تہذیب ہے جو اس وقت پوری دنیا میں رائج ہے۔ امریکی اور یورپی ممالک نے اس کو جدت دے دی ہے۔ وہ لوگ کمروں میں قالین بچھاتے ہیں اور پھر قالین پر صوفے اور بیڈ بھی لگا دیتے ہیں۔ اب صوفے اور بیڈ دونوں پر بیٹھا جاسکتا ہے۔ عدنان بھی میرے پیروں کے پاس آکر زمین پر ہی بیٹھ

گیا تھا۔ پانچ منٹ تک ہی سفیر کا ملازم چائے لیکر آ گیا۔ اس نے سبھی کو ایک ایک کپ پکڑایا اور کہانی پھر شروع ہو گئی۔

سفیر صاحب! عالیہ بہت خوبصورت تھی۔ اس کی باتیں، اس کے الفاظ اور ان الفاظ کو ادا کرنے کا انداز کسی کو بھی اپنی طرف کھینچ سکتا تھا۔ اس کا چہرہ تو ویسے ہی بہت خوبصورت تھا۔ ہلکا سا نولہ چہرہ، ہلکی سبزی مائل آنکھیں اور سیاہ ریشمی بال۔۔۔ اس کی آنکھیں فل سبز نہیں تھیں بلکہ اس میں ہلکا براؤن رنگ بھی تھا۔ ہندوستانی براؤن رنگ جو اسے ایک عجیب سا مردانہ ٹچ دیتا تھا۔ سر! وہ ہمارے پورے علاقے میں افریقی شہزادی کے نام سے مشہور تھی۔ لوگ بے اختیار اس کی جانب کھنچے چلے آتے تھے۔ مختصر سے عرصے میں ہی اس کی شہرت ہمارے گاؤں سے باہر نکل کر آسٹن شہر تک پہنچ چکی تھی۔ ہم اسے ایک ہزار ڈالر میں خرید کر لائے تھے لیکن وہ بہت جلد ایک ہزار سے تین ہزار ڈالر تک پہنچ چلی تھی۔ آسٹن شہر میں ایک بہت بڑا زمیندار رہتا تھا۔ اس کا پورا نام تو اب مجھے یاد نہیں ہے لیکن اسے سب لوگ جم کہتے تھے۔ ستر سال کا بوڑھا جم ہمارے علاقے کا بہت بڑا زمیندار تھا۔ عالیہ کے افریقی حسن کی شہرت اس تک پہنچی تو وہ خاص طور پر ہمارے گاؤں آیا تھا اور اس نے عالیہ کو ایک نظر میں ہی پسند کر لیا تھا۔ سفیر صاحب! وہ تین ہزار سے سیدھا پانچ ہزار ڈالر تک آ گیا تھا۔ اس نے عالیہ کے پانچ ہزار ڈالر لگا دیئے تھے۔ وہ عالیہ کو اپنے گھر میں رکھنا چاہتا تھا۔

”براؤن صاحب! کیا سوچ رہے ہو؟ میں پانچ ہزار ڈالر اس لڑکی کے دینے کے لئے تیار ہوں۔ آپ اس رقم سے بیس غلام خرید سکتے ہیں۔ سودا اتنا برا نہیں ہے؟“ جم نے میرے ابو کو آفر کی۔

اس کی نظر عالیہ کے سراپا پر جمی ہوئی تھی۔ وہ کسی گدھ کی طرح اس کے جسم پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ ابو نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے عالیہ کی طرف نظر گھمائی، وہ بالکل مطمئن کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی فکر مندی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ مجھے لگا وہ کچھ کہے گی، شاید ہماری منتیں کرے گی کیونکہ زیادہ تر غلام ایسا ہی کرتے تھے۔ وہ پہلے مالک کو چھوڑ کر دوسرے مالک کے پاس نہیں جانا چاہتے ہیں۔ وہ پہلے مالک کے ساتھ ایڈجسٹ ہو چکے ہوتے ہیں اور انہیں دوسرے مالک کے مزاج اور ماحول کا پتہ نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ آگے جانے سے گھبراتے ہیں۔ مجھے عالیہ سے بھی ایسی ہی امید تھی لیکن وہ اس کے برعکس نکلی۔ وہ اس سودے کو سن رہی تھی لیکن بالکل خاموش تھی۔ مجھے عالیہ کا ساتھ اچھا لگتا تھا اور وہ مجھے بہت

پسند تھی۔ میں محبت تو نہیں کرتا تھا اس سے لیکن پھر بھی ایک عجیب سی کشش ضرور محسوس کرنے لگا تھا۔ میرے والد اور بھائیوں کو اس چیز کا پتہ تھا اس لئے وہ عالیہ سے دور رہتے تھے۔ یہاں میں دور کا مطلب نہیں بتاؤں گا ورنہ آپ کے ملازم نذیر صاحب پھر غصہ کرنے لگیں گے کہ باباجی بہت گندہ بولتے ہیں۔“ میں نے ایک نظر نیچے قالین پر بیٹھے ہوئے نذیر احمد کی طرف دیکھا تو وہ بے اختیار شرمندہ ہو گیا۔

”سوری باباجی! غلطی ہو گئی تھی، مجھے آپ کو درمیان میں نہیں ٹوکنا چاہیے تھا۔“ اس نے فوراً معذرت کرتے ہوئے کہا۔

”باباجی! یہ ابھی بچہ ہے، آپ اسے معاف کر دیں اور کہانی سنائیں۔ اپنی مرضی سے سنائیں تھوڑے مہذب الفاظ ہوں تو زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ باقی آپ کی مرضی ہے بس کہانی کی خوبصورتی متاثر نہ ہو، الفاظ تھوڑے غیر مہذب بھی چلیں گے۔“ امریکی سفیر نے دوبارہ مجھے کہانی شروع کرنے کا کہا۔ میں نے چائے کی ایک چسکی لگائی اور دوبارہ کہانی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ بوڑھا جم عالیہ کو اپنے استعمال کے لئے لے کر جانا چاہتا تھا۔ اسے عالیہ بہت پسند آگئی تھی اس لئے وہ ایک عالیہ کے پانچ ہزار ڈالر لگا رہا تھا۔ یہ آج کے دور کے پانچ کروڑ سے بھی زیادہ روپے بنتے ہیں۔ مجھے لگا شاید عالیہ بھی منتیں کرے گی وہ ہمیں نہ بیچنے کا کہے گی لیکن وہ خاموش کھڑی تھی، بالکل خاموش۔۔۔ اسے اس پورے سودے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں کچھ دیر تک اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا لیکن وہ بالکل سپاٹ چہرہ لئے خاموش کھڑی رہی۔

”ابا! ہمیں عالیہ کو نہیں بیچنا ہے۔ کوئی اس کے پانچ ہزار ڈالر دے یا پانچ لاکھ ہم نہیں بیچیں گے۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”ایلن بیٹا! پانچ ہزار ڈالر بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ تم اس رقم سے درجن بھر لڑکیاں خرید سکتے ہو۔“ بوڑھے جم نے اس بار براہ راست مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں سر! ہم عالیہ کو بیچنا ہی نہیں چاہتے ہیں۔ یہ بہت اچھی اور وفادار غلام ہے۔ ایسی وفاداری کو پیسوں سے نہیں تولہ جاتا۔“ میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”براؤن صاحب! اس لڑکی کو بیچ دو، یہی آپ کے حق میں بہتر ہوگا۔ آپ کے لڑکے کے الفاظ اور ان کی شدت بہت خطرناک ہے۔ یہ لڑکی آپ کے لڑکے پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ یہ آقا اور غلام کے رشتے کو ختم

کرنے کی کوشش کر رہی ہے جو کہ غلط ہے۔ آپ کا بیٹا جوان ہے، اس کا خون گرم ہے اور یہ دنیا سے ٹکرانے کی کوشش کرے گا۔ اس لڑکی کا معصوم حسن تمہارے بیٹے پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ یہ معاشرے سے ٹکرانے کی کوشش کرے گا اور جان سے چلا جائے گا۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہمارا معاشرہ کبھی بھی ان سیاہ فاموں کو وہ مقام نہیں دے گا جس کی کوشش تمہارا یہ بیٹا جوانی کے جوش میں کرے گا۔ براؤن صاحب! آپ اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دینا، میری آفر اب بھی وہی ہے اور اگلے ہفتے تک بھی یہی رہے گی۔ مجھے امید ہے کہ آپ کاروباری کی طرح سوچیں گے۔ عالیہ کی اچھی قیمت مل رہی ہے اس لئے آپ اسے ضرور بیچیں گے۔“ بوڑھے جم نے ابو کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”سر! آپ میرے بیٹے پر الزام لگا رہے ہیں، یہ غلط ہے۔ یہ ویسے ہی نرم طبیعت کا مالک ہے۔ باقی مالک اپنے غلاموں کے ساتھ یہ سب کچھ کرتے رہے ہیں اور یہ نارمل بات ہے۔ میرا بیٹا جوان ہے، اگر وہ عالیہ کے ساتھ کچھ پل گزارتا ہے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ آپ بھی تو عالیہ کو اسی کام کے لئے لیکر جا رہے ہیں۔ آپ نے عالیہ سے کوئی کھیتی باڑی تو کروانی نہیں ہے۔“ ابو نے طنز کرتے ہوئے کہا۔ انہیں میرے اور عالیہ کے تعلقات پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

”ابو! آپ غلط کہہ رہے ہیں۔۔۔ میرا عالیہ کے ساتھ ایسا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے تو کبھی اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔“ میں نے جلدی سے اپنی صفائی دیتے ہوئے کہا۔ یہ حقیقت تھی کہ میں نے ابھی تک عالیہ کو اس نظر سے نہیں دیکھا۔ وہ مجھے اچھی ضرور لگتی تھی لیکن اس حد تک نہیں تھی کہ میں اس کے ساتھ کوئی تعلق رکھتا۔ میری منگیتر عالیہ سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ وہ میری طرح سفید فام اور اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ فلورین مجھ سے محبت کرتی تھی اور وہ میری ہر بات کا خیال رکھتی تھی۔ فلورین کے ہوتے ہوئے مجھے کسی اور کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں نے اس سے پہلے کبھی عالیہ کو اس نظر سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ آج پہلی بار بوڑھے جم نے بات کر کے میری توجہ اس طرف کی تھی۔ مجھے اپنے ابو کی بات پر بھی حیرانگی ہوئی تھی۔ وہ بھی مجھے اپنے باقی بیٹوں کی طرح سمجھتے تھے جو ڈیرے پر سب کچھ کرتے تھے۔

”دیکھ لیا براؤن صاحب؟ یہی تو اصل پرالیم ہے۔ جسمانی تعلق محبت کو ختم کرتا ہے۔ کتنے عرصے سے یہ لڑکی آپ کے بیٹے کی دسترس میں ہے اور موصوف نے ابھی تک اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔ یہ مانے یا نہ مانے لیکن حقیقت یہی ہے کہ آپ کا بیٹا اس سے محبت کرنے لگا ہے۔ اس لئے میرا مشورہ یہی ہے کہ اسے بچ

دو فائدے میں رہو گے، ورنہ ایک دن بیٹے سے بھی ہاتھ دھو گے اور یہ لڑکی بھی ماری جائے گی۔“ بوڑھے جم نے ابو کو کافی دیر تک منانے کی کوشش کی لیکن ابو نے صاف انکار کر دیا۔ انہیں معلوم تھا کہ عالیہ کو بیچنے کی صورت میں میں کوئی غلط قدم بھی اٹھا سکتا ہوں۔ انہیں میری شدت کا اندازہ بندرگاہ پر ہی ہو گیا تھا اسی لئے انہوں نے عالیہ کو مکمل طور پر میری دسترس میں دے دیا تھا۔ گھر کا کوئی بھی فرد عالیہ کو نہیں پوچھتا تھا۔ ابو کو لگا کہ میں چار دن عالیہ کے ساتھ رہوں گا اور پھر اس سے اکتا جاؤں گا لیکن یہاں تو بالکل ہی الٹ ہو رہا تھا۔ میں نے کبھی عالیہ کو اس نظر سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ ابو کو خطرہ محسوس ہو گیا۔ انھوں نے بوڑھے جم کو انکار کر دیا۔

”عالیہ! تیار کر لینا، اپنے کپڑے وغیرہ باندھ لینا میں کل صبح تمہیں ڈیرے پر چھوڑ آؤں گا۔ کل سے تم ڈیرے پر رہو گی اور کپاس کی چٹائی کرو گی۔“ ابو نے عالیہ سے کہا اور اندر گھر کی طرف چلے گئے۔

”ابو! یہ غلط ہے، عالیہ نے ہمارے پورے گھر کو سنبھالا ہوا ہے، وہ بہت اچھا کام کرتی ہے۔ پھر آپ اسے بغیر کسی وجہ کے ڈیرے پر نہیں بھیج سکتے؟“ میں نے ابو سے احتجاج کیا۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے گھرا گیا تھا۔

”یار! کپاس کی فصل تیار ہو گئی ہے اور ہمیں اس کی چٹائی کے لئے زیادہ سے زیادہ غلاموں کی ضرورت ہے۔ عالیہ دو تین مہینے وہاں رہ کر چٹائی کرے گی اور پھر کام ختم ہونے کے بعد واپس آ جائے گی۔“ ابو نے نارمل انداز میں کہا اور ایک کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔

”کیا ہوا ہے امی؟“ امی نے مجھے پریشان دیکھا تو پوچھنے لگے۔

”میں نے عالیہ کو کل صبح ڈیرے پر لے جانے کا ارادہ کیا ہے اور یہ اسی وجہ سے پریشان ہو گیا ہے۔“

ابو نے امی کو جواب دیا۔

”ارے! عالیہ تو بہت اچھا کام کر رہی ہے، اس کی وجہ سے ہمیں بہت آرام ہے۔ میں نے آج تک اتنی اچھی اور محنتی لڑکی نہیں دیکھی ہے۔ آپ اسے ڈیرے پر لے جا کر زیادتی کر رہے ہیں۔“ امی نے بھی احتجاج کیا۔ وہ بھی عالیہ کو یہاں سے لے جانے کے حق میں نہیں تھیں۔

”اس اچھی لڑکی سے تمہارا یہ بیٹا محبت کرنے لگا ہے۔ یہ کوئی نیا ہی رنگ چڑھانے والا ہے، اس لئے

میں عالیہ کو یہاں سے لیکر جا رہا ہوں۔“ ابو نے ایک بار پھر مجھ پر الزام لگایا۔

”ابو! یہ غلط ہے، میں نے کبھی عالیہ کو اس نظر سے دیکھا ہی نہیں ہے۔ وہ صرف ایک غلام ہے اور بس

اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔“ میں اپنی صفائی دینے لگا۔

”اچھا! تو پھر ٹھیک ہے، میں پانچ ہزار ڈالر میں بیچ دیتا ہوں۔۔۔ وہ صرف ایک غلام ہی تو ہے؟“ ابو نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا کہتے ہو بیچ دوں؟ ایک عالیہ کے بدلے میں دس اور لیکر آ جاؤں گا؟“ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔

”ابو! یہ بات نہیں ہے۔۔۔ وہ ایک اچھی اور پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ ہندی، اردو اور انگلش تین زبانوں میں لکھ سکتی ہے۔ جبکہ ہندو اور مسلمان دونوں مذاہب کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتی ہے۔ مجھے اس سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میں صرف اس وجہ سے اس کی عزت کرتا ہوں۔ باقی میں اپنی منگیتر فلورین سے محبت کرتا ہوں اور اس سے خوش بھی ہوں۔“ میں نے اس بار پوری تفصیل سے کہا۔

”ایلی! میرے بچے! میں باپ ہوں تمہارا اور مجھے تمہاری ایک ایک رگ کا علم ہے۔“ وہ اب بھی مجھ پر الزام لگا رہے تھے۔

”ابا! آپ زیادتی کر رہے ہیں۔۔۔ بلا وجہ اس بوڑھے جم کی باتوں میں آ کر آپ عالیہ کو ڈیرے پر بھیج رہے ہیں۔“ میں نے غصے سے کہا۔

”اچھا! ایک غلام عورت کے ساتھ بھی زیادتی ہوتی ہے؟ ایلی صاحب! وہ ہماری غلام ہے، میں اس کا مالک ہوں اور مجھے یہ حق ہے کہ میں جو مرضی کروں۔ عالیہ کو ڈیرے پر لے جانے کا فیصلہ ہو چکا ہے اس لئے یہی بہتر ہے کہ تم اس فیصلے کو قبول کرو۔ ورنہ میں اگر اپنے غصے میں آ گیا تو پھر تم بھی عالیہ کو دیکھ نہیں سکو گے۔“ ابو میرے غصے کو دیکھ کر خود بھی غصے میں آ گئے۔ ان کے اندر کاروائیتی زمیندار جاگ گیا تھا۔ میں نے مزید کچھ بولنا چاہا لیکن امی نے مجھے روک گیا۔ میں کافی دیر تک وہیں کھڑا رہا اور پھر گھر سے باہر نکل گیا۔

ہمارے گھر سے ڈیرہ کوئی دو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا جو کہ بہت زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ ہم لوگ آرام سے آدھے گھنٹے میں پیدل ہی ڈیرے پر چلے جاتے تھے۔ صرف فصل یا سامان وغیرہ کے لئے بیل گاڑی کا استعمال کیا جاتا تھا۔ باقی ہمارے دو اعلیٰ نسل کے گھوڑے بھی تھے۔ ابو کو گھڑسواری کا بہت شوق تھا اور وہی زیادہ تر گھوڑے استعمال کرتے تھے۔ میرے باقی دونوں بھائیوں کو بھی گھڑسواری کا شوق تھا لیکن وہ صرف ضرورتاً ہی سواری کرتے تھے۔ میں گھر سے باہر نکلا اور پیدل ہی چلتا ہوا ڈیرے پر آ گیا۔

”ارے ایل! تم آج کیسے ڈیرے پر آگئے ہو؟“ فیلکس نے مجھے ڈیرے پر دیکھا تو حیرانگی سے پوچھنے لگا۔

فیلکس میرا بڑا بھائی تھا۔ فیلکس اور جیکس اس وقت میرے دونوں بھائی ڈیرے پر تھے۔ کپاس کی فصل تیار ہو گئی تھی اور اب اس کی چنائی ہو رہی تھی۔ ابھی شام کا اندھیرا پھیلنے میں کافی وقت تھا۔ ہمارے غلام اور دوسرے مقامی ملازم کپاس کی چنائی کر رہے تھے جبکہ میرے دونوں بھائی ان کا خیال رکھ رہے تھے۔ شام کو سب غلاموں کی کپاس تول کر رکھی جاتی تھی۔ اس سے پتہ چل جاتا تھا کہ کون زیادہ چنائی کرتا ہے اور کون کم چنائی کرتا ہے۔ بھائی کم چنائی کرنے والوں کو سزا کے طور پر کھانا نہیں دیتے تھے اور رات کو شلٹر کی بجائے باہر ہی سلا یا جاتا تھا۔ ہمارے ڈیرے پر چار بڑے بڑے شلٹر تھے جہاں ان غلاموں کو رکھا جاتا تھا۔ وہ دن کو کھیتوں میں کام کرتے تھے اور رات کو ان شلٹرز میں سو جاتے تھے۔ ان شلٹرز کے ساتھ ایک بڑا سنووروم تھا جہاں زرعی آلات اور بیج وغیرہ رکھے جاتے تھے۔ اس سے آگے ایک کمرہ تھا جو دفتر کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ یہاں کمرے میں دو بیڈ بھی لگے ہوئے تھے۔ یہ کسی ایمر جنسی میں رات گزارنے یا دوپہر کو آرام کرنے لئے رکھے گئے تھے۔ ویسے ان کا زیادہ تر استعمال باپ اور بھائیوں کی عیاشیوں کے لئے ہوتا تھا۔

ہمارے پاس تیس کے قریب غلام عورتیں بھی تھیں۔ میرے بھائیوں کو جب خواہش ہوتی تھی وہ ان میں سے کسی کو لیکر آ جاتے تھے۔ سیاہ فام عورتیں خوبصورت نہیں ہوتی تھیں۔ ان میں کوئی بھی جنسی کشش نہیں ہوتی تھی۔ ان کے مقابلے میں ہماری سفید فام عورتیں کئی گنا زیادہ حسین اور پرکشش ہوتی تھیں جو اچھا لباس پہنتی تھیں۔ ان سے خوشبو آتی تھی جبکہ ان کے مقابلے میں سیاہ فام اپنے جسم کا بالکل خیال نہیں رکھتی تھیں۔ وہ کئی کئی دن تک نہاتی نہیں تھیں۔ سارا سارا دن مزدوری کر کے ان کے جسم بھی کھر درے ہو جاتے تھے اور ان سے بدبو بھی آتی تھی۔ خدا نے مرد کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے، یہ حد سے زیادہ نرم دل بھی ہوتا ہے اور ظالم بھی۔ اسے ظلم کرنے میں مزا آتا ہے۔ سفید فام عورتیں ان ی بیویاں ہوتی ہیں اور ان کو بھی برابر کے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ ان کے ساتھ نارمل زندگی گزارتے ہیں جبکہ اپنی غلام عورتوں کے ساتھ ظلم کر کے ان کو تکلیف پہنچا کر اپنی مردانگی کو تسکین دلاتے ہیں۔ میں ان مردوں سے مختلف تھا لیکن میرا باپ اور بھائی اسی معاشرے کا حصہ تھے۔ وہ گھر سے باہر اس عشرت کدے میں اپنی مردانگی دکھاتے تھے۔

اس عشرت کدے کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا سٹور تھا جو فصل کے لئے تھا۔ کپاس، گندم، مکئی یا دوسری تمام اجناس یہیں پر رکھی جاتی تھیں۔ بڑے سٹور روم کے بعد باڑے آ جاتے تھے۔ یہ بڑے بڑے باڑے تعداد میں چھ تھے۔ جن میں بھیڑ، بکریاں، گائے اور مرغیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ یہ سارے باڑے سٹورز اور شلٹرز ایک دائرے میں بنے ہوئے تھے جبکہ درمیان میں ایک چھوٹا تالاب تھا۔ پانی پچنان جھیل سے نکلنے والے دریا کولوراڈو سے ایک نالے کی مدد سے ہماری زمینوں کی طرف لایا جاتا تھا۔ اس نالے سے ہماری ساری زمینیں سیراب ہوتی تھیں۔ اسی نالے سے تالاب میں بھی پانی لایا جاتا تھا جہاں سے جانوروں کو پانی پلایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ تالاب کے سرے پر ایک بڑی حوضی بھی تھی۔ اس حوضی کا پانی ہمارے غلام استعمال کرتے تھے۔ یہ بہت بڑا ڈیرا تھا جو دس ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا۔

”آج کیسے ادھر کارخ کر لیا ہے؟“ فلیکس نے پوچھا۔

”بس ایسے ہی بھائی! گھر میں دل نہیں لگ رہا تھا اس لئے ڈیرے چلا آیا۔“ میں نے جواب دیا۔ میں کھیت کے کنارے پر آ کر رک گیا تھا۔

”ایلی! کیسے ہو؟“ چھوٹا بھائی جیکس بھی مجھ سے پوچھنے لگا۔ وہ فلیکس سے چھوٹا تھا اور مجھ سے بڑا تھا۔ میں فلیکس سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے اسے چھوٹا بھائی کہہ رہا تھا۔ باقی وہ مجھ سے اور ازبیل دونوں سے بڑا تھا۔

”جی بھائی! میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے بھائی سے ہاتھ ملایا اور وہیں کھیت کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ ”کیا بات ہے ایلی! تم کافی پریشان لگ رہے ہو؟“ فلیکس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ بڑا بھائی تھا اور بالکل ابو کی طرح ہم سبھی بہن بھائیوں کا خیال رکھتا تھا۔

”بس ایسے ہی بھائی! میں پریشان نہیں ہوں۔“ میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ”اچھا؟ تو پھر اس کیوں ہو؟“ وہ بھی میرے پاس ہی کھیت کے کنارے پر بیٹھ گئے۔ ”بھائی! وہ عالیہ کل ڈیرے پر آ رہی ہے۔۔۔ وہ اب ڈیرے پر کام کرے گی۔ ابو اسے صبح ڈیرے لیکر آ رہے ہیں۔“ میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”اچھا! تو اس میں کوئی پریشانی والی بات ہے؟ آج نہیں تو کل اسے آنا تو ڈیرے پر ہی تھا نا؟ تمہارا بھی جواب اس سے دل بھر گیا ہو گیا؟“ فلیکس نے بھی ابو کی طرح سوچتے ہوئے کہا۔

”بھائی! آپ بھی غلط سوچ رہے ہو۔۔ میں آپ لوگوں کی طرح نہیں ہوں۔ میں اپنی منگیتز فلورین سے خوش ہوں۔“ میں نے پھر احتجاج کیا۔

”ایلی! میرے بھائی! آقا اور غلام میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ہم ان سیاہ فاموں سے بہت اوپر ہیں۔ ان سے جتنا مرضی کھیلو لیکن کبھی بھی دل مت لگاؤ، دل لگانے کی کوشش کرو گے تو یہ معاشرہ تمہیں جینے نہیں دے گا۔“ وہ مجھے سمجھا رہے تھے لیکن ان کی کسی بھی بات کا مجھ پر اثر نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے ان کی کسی بھی بات کی سمجھ ہی نہیں آرہی تھی۔ کافی دیر تک وہ بیٹھے مجھے سمجھاتے رہے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو کپاس کی چٹائی ختم ہو گئی۔ غلام اب اپنی چنی ہوئی کپاس کو کھیت سے باہر لا کر اسے بڑے بڑے تھیلوں میں ڈال کر اٹھا کر رہے تھے۔ یہاں سے اب بیل گاڑی میں ڈال کر کپاس گودام میں لے جائی جاتی۔ دونوں بھائی اب اس طرف مصروف ہو گئے تو میں وہاں سے اٹھ کر واپس گھر آ گیا۔ میں کچن کی طرف گیا وہاں امی کھانا پکوا رہی تھیں۔ عالیہ وہاں نہیں تھی بلکہ وہ اپنے کمرے میں ہی تھی۔ میں کچن سے باہر نکلا اور صحن کو کراس کر کے سرونٹ کواٹرز میں آ گیا۔ عالیہ اپنے کمرے میں ہی لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے دروازے کو ہلکی سی دستک دی اور اندر آ گیا۔

”اوہ ایلی! آپ آئے ہیں۔“ وہ مجھے دیکھ کر جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ میرے بار بار کہنے کے بعد وہ اب مجھے مالک نہیں کہتی تھی۔ وہ بھی اب مجھے باقی سب لوگوں کی طرح ایلی ہی کہنے لگی تھی۔

”عالیہ! کیسی ہو؟“ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”ٹھیک ہوں۔۔ کیا اتنا جواب کافی ہے؟ مجھے لگاتم بہت کچھ کہنا چاہتی ہو؟“ میری نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”ایلی! ہم غلام ہیں اور غلاموں کو بولنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ہم تو مالک کے ہر حکم پر سر جھکانے والے ہوتے ہیں۔“ اس نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔

”عالیہ! تم بہت گہری ہو، انتہائی گہری۔۔ شاید سمندر بھی تمہارا مقابلہ نہ کر سکے۔“ میں نے ایک ہاتھ بڑھایا اور اس کے نرم گال پر رکھ دیا۔

پچھلے چھ مہینے سے میں عالیہ کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اس عرصہ میں پتہ نہیں کتنی بار ہم دونوں اکٹھے بیٹھے

تھے، اکٹھے کھیلے تھے اور میں نے درجنوں بار اسے چھوا تھا، پکڑا تھا، اس سے ریسلنگ تک کھیلی تھی۔۔۔ میں درجنوں بار اس کے گلے لگا تھا لیکن کبھی بھی میرے دل میں اس لئے کوئی غلط خیال نہیں آئے تھے کیونکہ میں اسے ایک غلام اور دوست سے آگے کبھی سمجھا ہی نہیں تھا۔ وہ ایک لڑکی تھی، یہ سوچ تو کبھی مجھے آئی ہی نہیں تھی۔ آج میرے والد اور بھائی کی باتوں نے مجھے احساس دلایا تھا کہ وہ ایک لڑکی ہے۔ آج پہلی بار احساس ہوا تھا کہ وہ ایک لڑکی ہے۔ آج پہلی بار ایک مرد کی حیثیت سے اس کی گالوں کو چھوا تو ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اس کے نرم ملائم گالوں کا نشہ پہلی بار میرے ہاتھ کو محسوس ہوا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔

”عالیہ! میں عیسائی ہوں، خدا پر یقین رکھتا ہوں اور خدا کی محبت پر بھی یقین رکھتا ہوں۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ تمہیں سیاہ فام نہیں ہونا چاہیے تھا۔“ میں اس کی سبزی مائل آنکھوں کے سحر میں کھویا ہوا تھا۔

”ایلی! سیاہ فام بھی تو انسان ہی ہوتے ہیں؟ خدا نے ان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ خدا تو ہر انسان کو آزاد پیدا کرتا ہے۔ یہ تو تم لوگ ہو جو غلام بناتے ہو۔“ اس کی زمین کی طرف سے نظریں اٹھیں اور وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

”ایلی صاحب! کسی سیاہ فام کے دل میں جھانک کر دیکھو، کبھی اس سیاہ فام کے درد کو اپنا درد سمجھ کر جینے کی کوشش کر کے دیکھو۔“ اس کی نظریں مسلسل میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ان نظروں کی تیش میں اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔ کافی دیر تک وہ مجھے ایسی ہی گھورتی رہی اور پھر اچانک اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ میں پر سکون ہو گیا۔

”عالیہ! تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔ میں جتنا تمہیں سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں اتنا ہی الجھ جاتا ہوں۔ تم ایسی باتیں نہ کیا کرو، مجھے وہی شرارتی سی عالیہ پسند ہے جو میرے ساتھ کھیلتی اور جھگڑتی رہتی ہے۔“ میں نے دوبارہ ہاتھ بڑھا کر اس کے گالوں پر رکھ دیا۔

”سوری ایلی! مجھے لگا تمہیں ہم سے ہمدردی ہے، تم ہمارے درد سے آشنا ہو لیکن تم بھی باقیوں کی طرح ہی نکلے۔“ وہ اپنے کپڑے اکٹھے کر کے ایک تھیلے میں ڈالنے لگی۔ مجھے اس کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو نظر آرہے تھے۔ میں کچھ پل کے لئے اسے دیکھتا رہا اور پھر واپس گھر جانے کے لئے کمرے سے باہر نکلنے

لگا۔

”ایلی صاحب۔۔۔!“ اس کی پیچھے سے آواز آئی تو میں رک گیا اور اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”ایلی صاحب! تم میں اور تمہارے بھائیوں میں ایک فرق ہے۔ وہ جسموں سے کھلتے ہیں اور تم جذباتوں سے۔۔۔ ان کے لگائے ہوئے زخم ہمارے جسموں پر نظر آتے ہیں لیکن تمہارے لگائے ہوئے زخم نظر تو نہیں آتے لیکن ان کی تڑاس بہت دیر تک رہتی ہے۔“ وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

”عالیہ۔۔۔! چاہتی کیا ہو؟“ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔

”ایلی صاحب! کچھ پل ہم غلاموں کی زندگی جی کر دیکھو تو تمہیں پتہ چل جائے گا۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تم بھی اس درد کو محسوس کرو جو ہم سب روز محسوس کرتے ہیں۔ کچھ پل کے لئے ہی سہی لیکن بحر حال محسوس تو کر کے دیکھو؟“ اس نے اپنا بازو چھڑوایا اور منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔

میں کچھ دیر وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ خاموشی سے دوسری طرف منہ کئے کھڑی رہی۔ کافی دیر تک ایسے ہی کھڑے رہنے کے بعد میں نے ہار مان لی اور گھر آ گیا۔ کھانا تیار ہو گیا تھا۔ بھائی بھی ڈیرے سے واپس آ چکے تھے۔ سارے گھر والے کچن میں بیٹھے کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ امی نے مجھے بھی آتے دیکھا تو جلدی سے اٹھ کر کھانا نکالنے لگی۔ انہوں نے ایک پلیٹ میں سالن نکالا اور دوسری پلیٹ میں چاول نکالنے لگی۔

”امی! میں چاول نہیں کھاؤں گا، صرف بریڈ کے ساتھ روٹی کھا لوں گا۔“ میں نے امی کو منع کیا اور سالن کی پلیٹ ان کے ہاتھ سے لیکر کھانے کی ٹیبل پر بیٹھ دیا۔

”بیٹا! تھوڑے چاول بھی کھا لیتے۔۔۔ بہت اچھے چاول بنے ہیں؟“ امی نے اصرار کیا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ وہ بھی میرے پاس ہی آ کر بیٹھ گئیں۔

یورپی اور امریکی معاشرے میں روٹی نہیں کھائی جاتی ہے۔ روٹی صرف پاکستان انڈیا اور دوسرے عرب ممالک میں ہی استعمال ہوتی ہے۔ جبکہ ترکی اور اس سے آگے یورپ اور امریکہ تک سب بریڈ ہی استعمال کرتے ہیں۔ میری بریڈ سے مراد ڈبل روٹی نہیں ہے۔ ڈبل روٹی میٹھی ہوتی ہے اور یہ بہت نرم ہوتی ہے جسے چائے یا دودھ کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ یورپین بریڈ پھیکا ہوتا ہے اور یہ تھوڑا سخت بھی ہوتا ہے۔ یہ

بھی آٹے سے ہی بنتا ہے اور تقریباً پانچ انچ موٹا اور ایک فٹ کے قریب لمبا ہوتا ہے۔ میں اس زمانے کی بریڈ کی بات کر رہا ہوں جبکہ آج کے دور میں بریڈ آٹے کا ہی بنتا ہے اور اس کے سائز مختلف ہو گئے ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان میں آٹے سے روٹی بنائی جاتی ہے اور اسے توے یا تندور پر پکایا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں بریڈ کے لئے براہ راست آٹا ہی اوون میں ڈال دیا جاتا تھا جو پانچ منٹ میں تیار ہو جاتا تھا۔ روٹی اور بریڈ (یورپ میں اس کے مختلف نام ہیں جن میں تومی، پانے اور بروٹ سے میں واقف ہوں) میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہوتا۔ بریڈ روٹی کے مقابلے میں کہیں آسانی سے اور تیزی سے تیار ہو جاتا ہے۔ بیس لوگوں کی روٹی تیار کرنے میں دو گھنٹے لگ جاتے ہیں جبکہ یہی بریڈ دس منٹ میں تیار ہو جاتے ہیں۔ میں نے بریڈ کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور اس کے ساتھ سالن لگا کر کھانے لگا۔

”بیٹا! پریشان نہیں ہوتے، تین مہینے کی فصل ہے جیسے ہی کپاس کی چٹائی ختم ہوگی وہ واپس آ جائے گی۔“ امی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ میں عالیہ کے جانے کی وجہ سے ڈسٹرب ہوں۔

”ابو! میں بھی غلاموں کے ساتھ کچھ دن لگانا چاہتا ہوں۔“ میں نے براہ راست ابو سے کہا۔ ”کیا کہہ رہے ہو؟ مجھے سمجھ نہیں آئی؟ غلاموں کے ساتھ تو تم بچپن سے ہی رہ رہے ہو؟“ ابو نے الجھتے ہوئے کہا۔ انہیں میری بات کی سمجھ نہیں آئی تھی۔

”ابو! میں ان کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں، ان کے ساتھ سونا چاہتا ہوں اور ان کے ساتھ مزدوری کرنا چاہتا ہوں۔ میں کچھ دن غلامی کی زندگی جی کر دیکھنا چاہتا ہوں۔“ میں نے اس بار مکمل وضاحت سے کہا۔ ”ڈیانا! دیکھ لو اپنے بیٹے کے کروتوت! یہ اب غلام بننا چاہتا ہے۔ ایک غلام لڑکی کے لئے اب یہ خود ہی غلام بن رہا ہے۔ ہمارے گھر میں یہ نیارومیو پیدا ہو رہا ہے۔“ ابانے غصے سے کہا۔

”ابا! آپ کیوں ہر بار مجھ پر الزام لگا دیتے ہیں؟ میں نے پچاس بار آپ سے کہا ہے کہ میں نے کبھی عالیہ کو اس نظر سے نہیں دیکھا ہے۔ میں اپنی منگیتز فلورین سے محبت کرتا ہوں اور وہ میری بچپن کی دوست ہے۔“ میں نے احتجاج کیا۔ غصے سے میری آواز کافی اونچی ہو گئی تھی۔

”دیکھو ایل! میں باپ ہوں تمہارا اور ہمیشہ بیٹے کا ہی سوچوں گا۔ بیٹا! تم یہ جو کچھ بھی کر رہے ہو یہ غلط ہے۔ ہمارا معاشرہ کبھی بھی ان غلاموں کو وہ مقام نہیں دے سکتا جو تم چاہتے ہو۔ خدا نے ان کو سیاہ فام بنایا

ہے۔ خدا نے اگر ان کو غلام بنایا ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ بیٹا! تمہیں عالیہ غلط سبق پڑھا رہی ہے۔ وہ تم سے کھیل رہی ہے۔“ ابا کی بات ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ وہ ہر بات کا قصور وار عالیہ کو سمجھ رہے تھے۔

”ابا! آپ کو معلوم ہے کہ میں نے اس سیزن کے فوراً بعد شادی کرنی ہے اور پھر واشنگٹن چلے جانا ہے؟ میرے پاس صرف چار مہینے ہیں، میں زیادہ نہیں صرف ایک ہفتہ ان غلاموں کے ساتھ رہ کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ عالیہ کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ میں اپنے لئے کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس درد کو محسوس کرنا چاہتا ہوں جو درد یہ غلام دن رات محسوس کرتے ہیں۔ بس اتنی سی خواہش ہے۔ میں کوئی رومیو نہیں ہوں بلکہ ایک انسان ہی ہوں جو غلاموں کی مشکلات کو سمجھنا چاہتا ہے۔ کل کو میں نے واشنگٹن جانا ہے، وائیٹ ہاؤس جانا ہے۔ میں ہر چیز کا علم رکھنا چاہتا ہوں۔ ابا! میں ایک بڑا آدمی بننا چاہتا ہوں، ایک ایسا بڑا آدمی جو سب کچھ جانتا ہو۔“ میرے لہجے میں حد درجہ سنجیدگی تھی۔ میرے چند جملوں نے ہی ابو کو قائل کر لیا تھا اور وہ مان گئے تھے۔

ایک پڑھے لکھے اور ان پڑھ میں یہی فرق ہوتا ہے۔ پڑھے لکھے آدمی کے پاس ایک ہزار دلائل ہوتے ہیں۔ وہ سامنے والے کو قائل کر لیتا ہے۔ میرا باپ برنٹ کا سب سے بڑا زمیندار ضرور تھا لیکن وہ ایک روایتی زمیندار تھے۔ انھوں نے ٹیکس سے باہر کی دنیا دیکھی ہی نہیں تھی اس لئے ان کو قائل کرنا اتنا مشکل نہیں تھا۔ وہ اسی بات پر خوش تھے کہ ان کا بیٹا واشنگٹن جا رہا تھا۔ اگلے دن صبح میں نے بھی اپنے کچھ پرانے کپڑے تھیلے میں ڈالے اور عالیہ کے کمرے میں آ گیا۔ وہ اپنے کپڑے پیک کر کے ابو کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔

”عالیہ تیار ہو؟ کپڑے وغیرہ سب دھیان سے اکٹھے کر لئے ہیں؟“ میں نے عالیہ سے سوال کیا۔

”جی! تم چل رہے ہو میرے ساتھ؟“ وہ خلاف معمول مجھے دیکھ کر حیران ہو گئی تھی۔

”جی! میں جا رہا ہوں اور صرف جا ہی نہیں رہا ہوں وہاں تم لوگوں کے ساتھ رہوں گا بھی۔“ میں نے

مسکراتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں! تم مذاق کر رہے ہو۔۔۔ تمہارے ابو کہاں اس بات کی اجازت دیں گے؟“ اس نے نفی

میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”عالیہ صاحبہ! آپ کو ابھی اس ایلی کی طاقت کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔“ میں

نے ایک ہاتھ کو فضا میں لہراتے ہوئے کہا۔

”اچھا! مجھے آزاد کروا سکتے ہو؟“ وہ اچانک میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔

سانولہ چہرہ، موٹی سبزی مائل براؤن آنکھیں اور پتلے پتلے سرخ ہونٹ۔۔۔ وہ سیدھی دل میں اتر رہی تھی۔ میں عالیہ سے محبت نہیں کرتا تھا۔ میں اس سے بہت مختلف تھا۔ وہ سیاہ فام تھی اور میں سفید فام تھا، وہ ہندوستانی تھی اور میں امریکی، وہ مسلمان تھی اور میں عیسائی، وہ غلام تھی اور میں آزاد۔۔۔ ہم دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن پھر بھی نجانے کیوں وہ مجھے اچھی لگتی تھی، اس کا ساتھ اچھا لگتا تھا۔ اس کی باتیں، اس کا انداز، اس کی معصومیت اور اس کی شرارتیں۔۔۔ شاید یہ محبت نہیں تھی، شاید یہ عشق نہیں تھا۔ اگر یہ محبت نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ میرے اندر بہت گہرائی سے ایک سوال اٹھا لیکن میں نے اسے فراموش کر دیا اور عالیہ کی طرف دیکھنے لگا۔

”ارے! مذاق کر رہی ہوں، یہاں سے آزاد ہو کر جاؤں گی کہاں؟ ہندوستان دنیا کے دوسرے کونے میں ہے۔“ اس نے تیزی سے کہا اور اپنا کپڑوں والا تھیلا اٹھالیا۔

”ارے چلو ایللی صاحب! کہیں ارادہ تو نہیں بدل لیا؟“ اس نے مجھے کندھے سے پکڑ کر بلایا اور باہر کی طرف اشارہ کیا۔ ہم دونوں گھر سے باہر نکلے اور ڈیرے کی طرف پیدل ہی چلنے لگے۔

”ایلی! تم تو بڑے تیز نکلے ہو؟ میں نے تو ویسے ہی کہا تھا اور تم تو سچ بچ ہی تیار ہو گئے ہو۔“ وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

”اچھا؟ ویسے ہی کہا تھا؟ ایللی صاحب! کچھ پل ہم غلاموں کی زندگی جی کر تو دیکھو! ہمارے درد کو محسوس کر کے تو دیکھو!“ میں نے منہ بناتے ہوئے اس کا جواب دیا اور جلدی سے آگے دوڑ لگا دی۔ وہ بھی میرے پیچھے پیچھے مجھے پکڑنے کے لئے بھاگنے لگی۔ میں اس سے تیز تھا اس لئے ایک پل میں ہی اس کی پہنچ سے دور ہو گیا۔ اس نے کچھ دیر تو میرا پیچھا کرنے کی کوشش کی لیکن پھر ہار مان کر رک گئی۔ میں نے اسے رکتے ہوئے دیکھا تو واپس آ گیا۔

”کیا ہوا؟ اتنی جلدی ہار مان گئی؟“ میں نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔

”یار! میں لڑکی ہوں، تمہارا مقابلہ تو نہیں کر سکتی نا؟ اوپر سے پھر تھیلہ بھی بہت بھاری ہے۔“ اس نے تھکاوٹ بھرے لہجے میں کہا۔

”اچھا؟ تھک گئی ہو تو تھیلا مجھے پکڑا دو!“ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا تھیلا بھی پکڑ لیا۔

”ارے! گاؤں کے کسی آدمی نے تمہیں تھیلا پکڑتے اور مجھے خالی ہاتھ چلتا ہوا دیکھ لیا تو قیامت آ جائے گی!“ اس نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

”کچھ نہیں ہوتا یار! تم بہت ڈر پوک ہو۔۔۔ ذرا ذرا سی بات پر ڈر جاتی ہو۔“ میں نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا تو اس کا تھیلے کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا۔ ایسے ہی ایک دوسرے سے ہنستے مسکراتے ہم ڈیرے پر آ گئے۔

یہاں سارے لوگ کپاس کی چٹائی کے لئے کھیت میں چلے گئے تھے۔ یہاں ڈیرے پر اب صرف دو ہی لوگ موجود تھے۔ یہ کھانا بناتے تھے اور ڈیرے کا خیال بھی رکھتے تھے۔ میں نے ان کا حال چال پوچھا اور عالیہ کو لیکر ایک شلٹر میں چلا گیا۔ یہاں عورتوں اور مردوں کا کوئی بھی الگ شلٹر نہیں تھا۔ سب اکٹھے ہی سوتے تھے۔ یہاں میاں بیوی کا بھی کوئی تصور نہیں تھا۔

”کیوں عالیہ! یہ شلٹر ٹھیک ہے یا دوسرا دیکھنا ہے؟“ میں نے عالیہ سے سوال کیا جو شلٹر کا اچھی طرح جائزہ لے رہی تھی۔ یہاں زمین پر کپڑے کی ترپال پورے کمرے میں بچھی ہوئی تھی۔ شلٹر کے دونوں دیواروں کے ساتھ ترتیب سے بستر لگے ہوئے تھے۔ چونکہ اس وقت ساری چھتیں لکڑی یا بانس سے بنائی جاتی تھیں اس لئے سارے ہال، شلٹر ز اور باڑے سب لمبائی میں بنائے جاتے تھے۔ ایک بانس جتنا لمبا ہوتا ہے بس اتنی ہی چوڑائی رکھی جاتی تھی تاکہ چھت آسانی سے ڈالی جاسکے۔ کمروں کی لمبائی کا کوئی حساب نہیں ہوتا تھا۔

”ٹھیک ہے ایلی! مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ پہلی بار غلاموں میں رہنے کے لئے آئے ہو تو اس لئے اپنی مرضی سے دیکھ لو۔“ عالیہ نے مجھ سے الٹا سوال کر دیا۔

”میرے خیال میں یہی ٹھیک رہے گا۔ ویسے بھی ادھر ہی ہیں نا اگر پسند نہ آیا تو پھر تبدیل کر لیں گے۔ ہمیں کونسا اس کے لئے کسی کی اجازت لین پڑے گی۔“ میں نے منہ بناتے ہوئے کہا اور کمرے کے ایک کونے چلا گیا۔ میں نے بستروں کو تھوڑا تھوڑا سرکا کر جگہ بنائی اور کمرے کے کونے میں دونوں بستر لگا دیے۔ بستر لگانے کے بعد ہم کمرے سے باہر آ گئے۔ ہمارے دونوں ملازم کمرے کے باہر ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

”آپ ادھر کیوں کھڑے ہو؟“ میں نے ان سے پوچھا۔

”وہ ایلی بابا! ہمیں لگا آپ کو شاید کسی چیز کی ضرورت ہوگی، ہم اسی لئے باہر کھڑے تھے۔“ لمبے قد والے نے جلدی سے جواب دیا۔ وہ دوسرے آدمی سے تھوڑا قد میں بھی بڑا تھا۔

”ارے نہیں یار! ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں، آپ اپنا کام کریں۔ شکریہ!“ میں نے مسکراتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا۔ عالیہ میری طرف تعریفی نظروں سے دیکھنے لگی۔ میں اپنے غلاموں کے ساتھ نا صرف عزت سے پیش آ رہا تھا بلکہ ان کا شکریہ بھی ادا کر رہا تھا۔

”ایلی! تم بہت گہرے ہو، کبھی کبھی مجھے تمہارے الفاظ اور لمبے کی سمجھ ہی نہیں آتی۔“ عالیہ نے مجھے بازو سے پکڑتے ہوئے کہا۔

”چلو اچھا ہے، کسی چیز کی سمجھ تو نہیں آئی ہے۔ ورنہ میں پڑھا لکھا ہو کر بھی اتنا نہیں جانتا جتنا تم ان پڑھ ہو کر جانتی ہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ بہاد پور کے نواب ہاؤس رہی تھی، وہ لاہور کے گورنر ہاؤس رہی تھی۔ انگریز گورنر اور اس کی بیوی نے اسے اتنا کچھ سکھایا تھا جو شاید میں ساری زندگی بھی نہیں سیکھ سکا تھا۔

برطانیہ سپر پاور تھا اور اس کے گورنر جو ہندوستان میں تعینات ہوئے تھے وہ دنیا کے ذہین ترین اور قابل ترین لوگوں میں سے ایک ہوتے تھے۔ لاہور کا گورنر ہاؤس انگریز افسروں، انجینئرز اور اساتذہ سے بھرا ہوتا تھا۔ عالیہ ان کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی تھی۔

”چلیں ایلی! کھیتوں کی طرف چلتے ہیں۔۔۔ آپ کے والد اور بھائی انتظار کر رہے ہوں گے۔“ اس نے مجھے کھیتوں کی طرف چلنے کا کہا تو ہم دونوں نے کپاس کی چنائی والے تھیلے لئے اور کھیتوں کی طرف چل پڑے۔

ہمارا مطلوبہ کھیت جہاں آج چنائی ہو رہی تھی وہ ڈیرے سے کافی ہٹ کر تھا۔ ابو پہلے دور دور والے کھیتوں کی چنائی کر رہے تھے۔ گھر کے نزدیک والے کھیت ابھی تک شروع نہیں کئے تھے۔ آدھے گھنٹے میں ہم کھیتوں میں پہنچ گئے۔ ابو اور دونوں بھائی وہیں کھیتوں میں ہی کھڑے غلاموں کو کھیتوں کی چنائی کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ میں نے ابو کو سلام کیا اور عالیہ کے ساتھ کھیت میں داخل ہو گیا۔

”ایلی! کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم دن کو تو ان غلاموں کے ساتھ چنائی کر لیا کرو اور رات کو گھر آ جایا کرو؟“ ابو نے میرے پیچھے آتے ہوئے کہا۔

”نہیں ابو! مجھے چار دن انہی کے ساتھ ہی رہنا اور سونا ہوگا۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا اور چنائی والے کپڑے درست کرنے لگا۔

”ایلی کو میں بتاتا ہوں کہ کپڑے کو کیسے اپنے کندھے پر ڈالنا ہے۔“ بڑے فلیکس بھی ابو کے پیچھے پیچھے آگئے تھے۔ انھوں نے مجھے کپڑے کو پیچھے کندھے کی طرف ٹکانے میں مدد کی۔

”بیٹا! اگر ان غلاموں کے ساتھ ہی سونا ہے تو پھر کم از کم چنائی تو مت کرونا! تم ہماری طرح پیچھے کھڑے ہو کر نگرانی کر سکتے ہو۔“ ابو کی ابھی بھی جان نکل رہی تھی۔ وہ مجھے یوں کھیتوں میں کھڑا نہیں دیکھ سکتے تھے۔

”ابا! آپ بھی نا۔۔۔ میں اب بڑا ہو گیا ہوں اور اپنا خیال خود بھی رکھ سکتا ہوں۔ آپ زیادہ پریشان مت ہوا کریں۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”اچھا بیٹا! جیسے تمہاری مرضی ہے۔ میں باپ ہوں نا اس لئے تمہاری فکر رہتی ہے۔“ وہ واپس کھیت سے باہر نکل گئے۔ بھائی نے عالیہ کا تھیلہ بھی ٹھیک کر کے اسے کندھے پر رکھوایا اور اسے کپاس کی چنائی کا بتانے لگا۔

”مجھے معلوم ہے سر! میں نے بہاؤ پور میں یہ کام کیا ہے۔“ عالیہ نے فلیکس سے مخاطب ہو کر کہا۔
 ”اوہ اچھا! پھر تو زبردست ہو گیا۔۔۔ تمہیں زیادہ پر اہم نہیں ہوگی۔“ بھائی نے خوش ہو کر کہا۔ ہم دونوں کپاس کی چنائی کرنے لگے۔

فلیکس کافی دیر تک ہمارے پیچھے کھڑا ہمیں دیکھتا رہا اور پھر مطمئن ہو کر واپس کنارے پر چلا گیا۔ عالیہ نے یہ کام بچپن میں ہی کیا تھا۔ وہ شروع شروع میں تو آہستہ سے چنائی کرتی رہی اور پھر اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ ہم دونوں پانچ پانچ پودوں کی قطاریں لیکر آگے بڑھ رہے تھے۔ عالیہ نے پہلے چھ قطاریں لیں اور پھر سات کر دیں اب وہ سات قطاریں لیکر جبکہ میں صرف تین ہی لے کر آگے جا رہا تھا۔ وہ میری بھی دو قطاریں آگے لے جا رہی تھی لیکن پھر بھی میں اس سے پیچھے رہ رہا تھا۔

”عالیہ! تھوڑا آہستہ چلو یا! میں بہت پیچھے رہ جاتا ہوں۔“ میں نے اسے تیز تیز چنائی کرتے دیکھا تو اسے ٹوکنے لگا۔

ہمیں صرف چالیس منٹ ہی ہوئے تھے اور اتنے وقت میں ہی میں تھک گیا تھا۔ میں نے زندگی میں کبھی سخت کام نہیں کیا تھا۔ میں نے اپنی ساری توجہ پڑھائی پر دی تھی۔ میں نے کبھی مزدوری نہیں کی تھی لیکن

آج پہلی بار عالیہ کے کہنے پر مزدوری کر رہا تھا اور تھوڑا تھوڑا بچتا بھی رہا تھا کہ ایسی ہی فضول میں پنگالے لیا۔

”ایلی صاحب! آہستہ کریں گے تو رات کو کھلے آسمان تلے بغیر کھانے کے رہنا پڑے گا۔ تمہارے بھائی بہت سخت ہیں، وہ کبھی معاف نہیں کرتے۔“ عالیہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
واقعی میرے بھائی اس معاملے میں بہت سخت تھے اور وہ کبھی بھی معاف نہیں کرتے تھے۔ وہ روزانہ غلاموں کی چنی ہوئی کپاس کا وزن کرتے تھے اور اس کا حساب لکھتے تھے۔ ایک غلام ایک دن میں اگر 80 کلو چنائی کرتا اور اگلے دن وہ ستر کلو سے نیچے آتا تو فلیکس بھائی اسے کھانا بھی نہیں دیتے تھے اور تالاب کے کنارے پر لگے ہوئے ایک درخت کے تنے کے ساتھ زنجیر سے باندھ بھی دیتے تھے۔ وہ پوری رات درخت کے تنے کے ساتھ ہی بندھا رہتا تھا اور صبح اسے کھول کر دوبارہ کھیتوں میں لے جایا جاتا تھا۔
”اچھا! ٹھیک ہے، میں کوشش کرتا ہوں۔“ میں نے کمزوری آواز میں کہا اور دوبارہ چنائی میں مصروف ہو گیا۔

دوپہر کے ایک بجے تک ہم مسلسل چنائی کرتے رہے۔ عالیہ تو مسلسل چنائی کرتی رہی، اس کا تھیلا بھر جاتا تھا تو وہ اسے ایک جگہ پر ڈھیر کرتی جاتی تھی۔ میں نے صرف ایک تھیلا بھر کر خالی کیا تھا اور دوسرے کو بھر رہا تھا۔ بھائی اب دوسرے کھیتوں کی طرف چلے گئے تھے جبکہ یہاں پر دو مسلح اہلکار گھوڑوں پر نگرانی کر رہے تھے۔ انہوں نے چھوٹی بندوقیں رکھی ہوئی تھیں جو لوڈ ڈھیں جبکہ ہاتھ میں کوڑے پکڑے ہوئے تھے۔ وہ رکنے والے یا آہستہ کام کرنے والے کو بلا دروغ کوڑے مارتے تھے۔ فضا ہر دس پندرہ منٹ بعد کوڑے کی شراب کی آواز سے گونجتی رہتی تھی۔ مسلح پہرے دار بلا ضرورت اور بغیر مقصد کے بھی مارتے رہتے تھے۔ انہیں اسی کام کے پیسے ملتے تھے۔ ابونے پانچ مسلح اہلکار ملازم رکھے ہوئے تھے۔ ہمارے پاس ایک سودس کے قریب غلام تھے جو ڈیرے پر کام کرتے تھے۔ ان غلاموں کو سنبھالنے کے لئے ہمیں مسلح پہریداروں کی ضرورت ہوتی تھی۔ سیاہ فام غلام وحشی افریقی ہوتے تھے اور ان کو قابو کرنے کے لئے ایسے پہریداروں کی ضرورت ہوتی تھی۔ ایک بجے کی قریب ایک پہریدار نے اونچی آواز میں سیٹی بجائی اور آدھا گھنٹہ آرام کرنے کا کہا۔

”آ جاؤ عالیہ! آدھے گھنٹے کی بریک ہو گئی ہے۔“ میں نے جلدی سے اپنا تھیلا اتار کر ادھر ہی زمین پر

رکھا اور عالیہ کی مدد کرنے لگا۔

”ارے ایلی! آپ رہنے دو، میں خود ہی اتار لیتی ہوں۔۔۔ یہ کونسا مشکل کام ہے۔“ عالیہ نے منع کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں عالیہ! یہ اچھی عادت ہوتی ہے، عورت کو ہمیشہ عزت دینی چاہیے۔ اس کو اپنی جگہ دو، اس کے لئے آگے بڑھ کر دروازہ کھولو، اس کی مدد کے لئے ہاتھ بڑھاؤ۔۔۔ یہ سب کچھ میری ماں نے مجھے سکھایا ہے۔ ہمارا معاشرہ ہمیشہ عورت کو عزت دیتا ہے۔“ میں نے فخریہ انداز سے کہا اور اس کا تھیلانچہ اتارنے میں مدد کرنے لگا۔

”اچھا؟ کیا غلام بھی مرد اور عورت ہوتے ہیں؟ مجھے لگا غلام صرف اور صرف غلام ہوتے ہیں، بالکل جانوروں کی طرح۔“ اس نے طنزیہ انداز سے کہا اور دوسرے غلاموں کی طرف چلی گئی۔

وہ سارے کھیت کے اندر ہی ایک نسبتاً کھلی جگہ پر بیٹھ گئے تھے۔ مٹی کے دو بڑے بڑے گھڑوں میں پانی آگیا تھا اور وہ سب پانی پی رہے تھے۔ کھانا صرف دو وقت کا ہی ملتا تھا۔ کام ختم ہونے کے بعد رات کو وہ سب اکٹھا ہی کھانا کھاتے تھے جبکہ صبح کے لئے ایک ایک بریڈ اور اس کے ساتھ ایک انڈا اور گڑ کی ایک ٹکڑی وہ ساتھ باندھ کر لے آتے تھے جو صبح نو دس بجے کے قریب کھا لیتے تھے۔ گڑ کاسن کر شاید آپ لوگ حیران ہو رہے ہوں گے کہ یہ تو دیسی آٹم ہے۔ گڑ تو صرف انڈیا اور پاکستان میں ہی ہوتا ہے۔ اگر آپ یہ سوچ رہے ہیں تو آپ غلط ہیں۔ اٹھارویں صدی میں گڑ امریکہ اور یورپ دونوں علاقوں میں موجود تھا۔ یہ لوگ گنے کے رس کو ابال کر گڑ تیار کر لیتے تھے۔

گڑ بنانا کوئی بہت بڑی سائنس نہیں ہے۔ جیسے جیسے دنیا نے ترقی کی ایسے ہی نئی نئی مشینیں بننے لگیں۔ گڑ کی جگہ پر چینی آگئی جو ذائقے اور مٹھاس میں گڑ سے کہیں بہتر تھی۔ اس لئے آج یورپ میں صرف چینی ہی استعمال ہوتی ہے۔ روایتی دیسی طریقے یہاں سے ختم ہو گئے ہیں جبکہ انڈیا اور پاکستان کے دیہاتی علاقوں میں آج بھی گڑ تیار کیا جاتا ہے۔ سارے غلام روٹی تو نو دس بجے کے قریب ہی کھا لیتے تھے جبکہ اس وقت جو آدھے گھنٹے کی بریک ملتی تھی اس میں پانی پی لیتے اور کچھ وقت کے لئے سستا لیتے تھے۔ یہاں اس کھیت میں ہم چالیس کے قریب غلام چنائی کر رہے تھے جبکہ اتنے ہی غلام دوسرے کھیت میں بھی لگے ہوئے تھے۔ کچھ غلام کیپاس کے خالی ہونے والے پودوں کو کاٹ رہے تھے تاکہ وہاں ہل چکا کرنی فصل لگائی جاسکے۔

”ایلی بابا! آپ نے کھانا کھانا ہے تو میں گھر سے لے آتا ہوں؟“ ایک گھڑسوار نے مجھے غلاموں کے ساتھ بیٹھتے ہوئے دیکھا تو جلدی سے گھوڑے سے نیچے اتر کر میرے پاس آ گیا اور مجھ سے کھانے کا پوچھنے لگا۔

”آپ کو بھوک لگی ہوگی؟ میں دس منٹ میں ہی کھانا لیکر آ جاؤں گا؟“ وہ مجھ سے پوچھنے لگا۔ وہ ہمارے ملازم تھے اور مالک کو نیچے زمین پر بیٹھتے دیکھ کر پوچھنے لگے تھے۔ مجھے بھوک تو بہت لگی ہوئی تھی، تھکاوٹ بھی حد سے زیادہ ہو گئی تھی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار اتنی مزدوری کی تھی۔ ایک پل کے لئے میرے ذہن میں کھانے کا خیال آیا لیکن پھر میں نے مسترد کر دیا۔ میں غلاموں کے ساتھ غلام بن کر رہنے آیا تھا اور اتنی جلدی ہار نہیں مان سکتا تھا۔

”نہیں! مجھے بھوک نہیں ہے، آپ لوگ پریشان مت ہوں اور پلیز! مجھے بھی ان غلاموں جیسا ہی سمجھیں اور اپنا کام ویسے ہی کریں جیسے پہلے کرتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ابوکبات کرنے کا موقع ملے کہ میری وجہ سے چنائی کا کام متاثر ہو رہا ہے۔“ میں نے اسے پوری وضاحت سے کہا تو وہ واپس چلا گیا۔

”ایلی! پانی تو پی لیتے؟ تمہارے پاس تو کوئی چھاگل وغیرہ بھی نہیں ہے۔“ عالیہ نے کہا۔
”مسلم! پہریداروں کے پاس اپنی پانی کی چھاگلیں تھیں اور وہ ان سے ہی پانی پیتے تھے جبکہ باقی تمام سیاہ فام غلام مٹی کے پیالے سے پانی پیتے تھے۔ یہ گھڑوں کے پاس ہی پڑے ہوتے تھے۔“

”عالیہ! ادھر سے ہی پلا دو، میں کوئی جانور تھوڑی ہوں جو آپ میرے منہ سے لگے ہوئے پیالے سے پانی نہیں پیو گے؟“ میں نے عالیہ کے ہاتھ سے پیالا پکڑ لیا۔ وہ آدھے کے قریب اس میں سے پانی پی چکی تھی۔ میں نے پیالے کو منہ لگایا اور باقی پانی ایک ہی گھونٹ میں پی گیا۔ تمام غلام اور گھوڑے پر بیٹھے ہوئے پہریدار سب میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے میں نے کوئی عجیب و غریب کام کر دیا ہو یا پھر میرے سر پر سینگ اگ آئے ہوں۔ میں نے سیاہ فاموں کے پیالے سے پانی پیا تھا۔ ہم سفید فام اپنے آپ کو دنیا کی عظیم ترین قوم سمجھتے تھے جبکہ سیاہ فام ہمارے غلام تھے جو انتہائی کم تر مخلوق تھے۔ ہم لوگ تو ان کے ہاتھ کا پانی نہیں پیتے تھے جبکہ یہاں میں نے ان کا جوٹھا پانی بھی پی لیا تھا۔ یہ واقعی بہت بڑی بات تھی جو میں کر چکا تھا۔ وہ سب حیرانگی سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

”عالیہ! ایک پیالہ اور پلا دو، قسم سے بہت پیاس لگی ہوئی ہے۔“ میں نے پیالہ عالیہ کی طرف بڑھاتے

ہوئے کہا۔

”ایلی! تم اس دنیا کے انسان ہو ہی نہیں، تم کسی اور دنیا سے آئے ہو۔“ عالیہ نے پیالہ پکڑا اور گھڑے سے پانی ڈالنے لگی۔ اس نے پیالہ بھرا اور مجھے پکڑا دیا جسے میں نے آرام سے پی لیا۔ آدھے گھنٹے کی بریک ختم ہوئی تو ایک بار پھر چنائی شروع ہو گئی۔

اگلے تین گھنٹے تک تو چنائی آرام سے چلتی رہی اور پھر غلام تھکنا شروع ہو گئے۔ مسلح پہریداروں کے کوڑے بھی تیز ہو گئے۔ وہ بلا دربلغ اور ہر کسی کو کوڑے مار رہے تھے۔ چڑے کا بنا ہوا کوڑا جدھر پڑ جاتا تھا وہاں سے کھال ادھیڑ کر رکھ دیتا تھا۔ میں تو بالکل گرنے کے قریب ہو چکا تھا۔ عالیہ پانچ قطاروں کی بجائے نو قطاریں لیکر جا رہی تھی اور مجھ سے ایک قطار بھی پوری نہیں ہو رہی تھی۔ مسلح پہریدار اس طرف نہیں آئے تھے۔ انہوں نے مجھے اور عالیہ کو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ مجھے تو وہ ویسے بھی نہیں مار سکتے تھے۔ میری وجہ سے عالیہ بھی بچی ہوئی تھی۔ دونوں پہریدار عالیہ کو لپٹاتی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے۔ یہاں ان کے لئے سیاہ فام عورتوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ کوئی بھی غلام ان کے آگے سراٹھانے کی جرات نہیں کرتا تھا۔ عالیہ ان سب غلاموں سے منفرد تھی۔ اس کا رنگ سیاہ کی بجائے سانولہ تھا اور اس کے بال بھی سلکی تھی۔ میں نے پہلے کبھی عالیہ کو ایسی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ ابو اور بھائیوں نے الزام لگانا شروع کیا تو پھر میں نے عالیہ کو دیکھا وہ واقعی خوبصورت تھی اور محبت کرنے کے قابل بھی تھی۔ لیکن میں اپنی منگیتر سے بہت خوش تھا وہ میرے بچپن کی دوست تھی۔ میری طرح ایک بڑے گھر کی لڑکی تھی۔ اس کے والد گاؤں کے میئر تھے جبکہ آسٹن شہر کے میئر بھی ان کے رشتہ دار تھے۔

میری منگیتر فلورین کے والد کی پہنچ اوپر واشنگٹن تک تھی۔ میں انہی کی وجہ سے واشنگٹن جا رہا تھا۔ شام کو چھ بجے کے قریب میری حالت بالکل غیر ہو گئی تھی۔ میں عالیہ کے ساتھ صبح آٹھ بجے کے قریب آکر کام پر لگا تھا۔ باقی غلام تو صبح چھ ساڑھے چھ بجے کے قریب آ جاتے تھے۔ ہمیں پہلا دن تھا اس لئے دیر سے آئے تھے۔ مجھے کپاس کی چنائی کرتے ہوئے دس گھنٹے ہو گئے تھے۔ ابھی ہمیں مزید ایک گھنٹہ اور چنائی کرنی تھی۔ میرے کندھے اب بوجھ اٹھا اٹھا کر درد کرنے لگے تھے۔ ٹانگیں بھی درد کر رہی تھیں لیکن میں پھر بھی ہمت کر کے لگا ہوا تھا۔ عالیہ مجھے کافی بار آرام کرنے کا کہہ چکی تھی لیکن میں ضد پر اڑا ہوا تھا۔ میں پہلے دن ہی ہار نہیں ماننا چاہتا تھا۔ فلورین کو میرے ڈیرے پر غلاموں کے ساتھ رہنے کا پتہ چلا تو وہ بھی ڈیرے پر آ گئی۔ وہاں

سے ایک آدمی اسے کھیتوں تک لیکر آ گیا۔ وہ میری حالت دیکھ کر ہی پاگل ہو گئی۔ میرا سرمہ مٹی سے اٹ گیا تھا اور جسم تھکاوٹ سے چور ہو چکا تھا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ کپاس کے پھول کی نوکیں بڑی تیز ہوتی ہیں۔ روئی نکالتے ہوئے یہ چھتی ہیں اور ہاتھوں کو زخمی کرتی ہیں۔ میرے ہاتھ ایک دن کی محنت سے ہی کھر درے ہو گئے تھے۔ ان پر جاجا خراشیں لگ چکی تھیں۔

”ایلی! یہ کیا بے وقوفی کر رہے ہو؟ اپنی حالت دیکھی ہے تم نے؟“ وہ مجھے سمجھانے لگی۔

”کوئی بات نہیں ہے فیلی! چار دن کا کام ہے، اس کے بعد پھر وہی گھراور پڑھائی ہوگی۔“ میں فلورین کو لے کر کھیت میں ہی بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا کپاس والا تھیلیا خالی کر لیا تھا اور اسی پر فلورین کو لیکر بیٹھ گیا۔ عالیہ آگے چنائی کر رہی تھی۔

”ایلی! یہ بے وقوفی ہے، تم زمیندار نہیں ہو بلکہ ایک پڑھے لکھے نوجوان ہو اور یہ تمہارا کام نہیں ہے۔“ وہ میرے ہاتھ کی خراشیں دیکھ رہی تھی۔

”ایلی! تمہارے ہاتھ کتنے پیارے ہوتے تھے، دیکھو! اب ان کی کیا حالت ہو گئی ہے؟“ اس نے اپنے ہونٹ میرے ہاتھوں سے لگا دیئے۔

”فیلی! میں لڑکا ہوں یا ر! ایک مرد ہوں اور مردوں کے ہاتھ کھردوالے ہی اچھے ہوتے ہیں۔“ میں نے مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا! اب یہ سب کچھ چھوڑ دو اور چلو میرے ساتھ، میں تمہیں گھر لے جانے کے لئے آئی ہوں۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”نہیں فیلی! میں کچھ دن یہیں رہوں گا۔“ میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا! تو پھر ٹھیک ہے، میں بھی تمہارے ساتھ ہی یہاں رہوں گی۔ میں بھی کچھ دن غلام بن کر دیکھنا چاہتی ہوں۔“ اس نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔

”ارے نہیں یا ر! تم تو لڑکی ہو، انتہائی نازک سی، معصوم سی۔۔۔ تم کیسے یہ کام کر سکتی ہو؟“ میں بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اگر تم کر سکتے ہو تو مجھے کیا ہے؟ میں بھی یہ سب کچھ کر سکتی ہوں اور میں کوئی نازک نہیں ہوں۔“ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

”فیلی! خوبصورت لڑکیاں صرف گھر میں بیٹھتی ہیں اور اپنے شوہر کے لئے سبقتی سنورتی ہیں، وہ کام نہیں کرتیں۔ اگر تم ادھر کام کرو گی تو تمہارا رنگ کالا ہو جائے گا۔ تمہاری جلد بھی کھردری سی ہو جائے گی اور مجھے تو گوری چٹی اور نرم ملائم سی بیوی چاہیے۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”اچھا! تو پھر کل کو جب میں بوڑھی ہو جاؤں گی تو پھر مجھے چھوڑ دو گے؟“ اس نے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہی تھی۔

”ارے نہیں یار! میں تو مذاق کر رہا ہوں۔ تم مجھے کسی بھی حالت میں قبول ہو۔ محبت کبھی صورت دیکھ کر تو نہیں ہوتی ہے اور مجھے تو تم سے محبت ہے۔“ میں نے جلدی سے اپنی بات بدلتے ہوئے کہا۔

”اچھا! اب چھوڑ دو اور بتاؤ گھر کب آؤ گے؟“ وہ میرے کچھ الفاظ سے ہی موم ہو گئی تھی۔

عورتیں شاید ساری ایسی ہی ہوتی ہیں۔ جتنی بھی ناراضگی ہو مرد کے پیار بھرے چند الفاظ سے ہی گھل جاتی ہیں۔ یہی عورت کی سب سے بڑی خامی ہے جس کا مرد ہمیشہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میں اسے لیکر دوبارہ تھیلے پر بیٹھ گیا اور وہیں بیٹھ کر ہم دونوں باتیں کرنے لگے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے سے کچھ دیر پہلے پہریداروں نے سیٹی بجائی اور سب کو واپس اپنی اپنی کپاس اکٹھی کرنے کا کہا۔ عالیہ نے چنائی ختم کی اور تھیلا خالی کرنے آگئی۔ ہم دونوں اس کی کپاس کی ڈھیری کے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک نظر ہم دونوں پر ڈالی اور خاموشی سے تھیلا خالی کرنے لگی۔

”عالیہ! کیسی ہو؟“ فیلی نے اس سے حال پوچھا۔

”ٹھیک ہوں، آپ کیسی ہیں؟“ عالیہ نے مسکرا کر اسے جواب دیا اور کپاس کو اکٹھا کر کے ایک بڑے تھیلے میں ڈالنے لگی۔

”اچھا فیلی! تم اب جاؤ اور مجھے بھی ابھی کپاس اکٹھی کرنی ہے۔“ میں نے فیلی سے کہا۔

”کوئی بات نہیں ہے اہلی صاحب! میں آپ کی کپاس بھی اکٹھی کر لیتی ہوں۔“ عالیہ نے اپنی کپاس اکٹھی کی اور میری ڈھیری کی طرف بڑھ گئی۔

”نہیں! میں خود ہی کر لیتا ہوں۔ تم صبح سے کام کر رہی ہو، ابھی اپنا کام بھی تم سے کرنا ہے، مجھے اچھا نہیں لگے گا۔“ میں جلدی سے آگے بڑھا اور کپاس کو تھیلے میں ڈالنے لگا۔

”میں بھی تمہاری مدد کرتی ہوں۔“ فلورین بھی میرے ساتھ ملکر کپاس کو تھیلے میں ڈالنے لگی۔

میں نے تھیلا پکڑا اور وہ تھوڑی تھوڑی کر کے کپاس ڈالنے لگی۔ عالیہ نے ہم دونوں کو کام کرتے دیکھا تو وہ اپنے تھیلے کے ساتھ پشت لگا کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر تک بیل گاڑی بھی آگئی تو ہم نے ان تھیلوں کو بیل گاڑی میں لوڈ کیا اور ان کے پیچھے پیچھے ہی ڈیرے کی طرف جانے لگے۔ سٹور روم میں ابو اور بھائی پہلے ہی کھڑے تھے۔ جیسے ہی بیل گاڑیاں پہنچیں۔ غلاموں نے جلدی جلدی کپاس کے تھیلے نیچے اتارے اور ان کے وزن کرنے لگے۔ فلکس بھائی نے کاپی پنسل پکڑی تھی اور کپاس کا وزن لکھ رہا تھا جبکہ جیکسن بھائی کنڈے پر کھڑے ہو کر وزن کر رہے تھے۔ ہر غلام ایک ایک کر کے اپنے تھیلے اٹھا کر کنڈے تک لے جاتے تھے، وزن کرواتے تھے اور پھر انہیں اندر کمرے میں خالی کر کے تھیلے واپس لے جاتے تھے۔ کپاس کو ہمیشہ کھلی اور ہوادار جگہ پر رکھا جاتا تھا۔

میری اور عالیہ کی باری سب سے آخر میں آئی۔ عالیہ کی کپاس ایک سو چالیس کے قریب نکلی جبکہ اس کے مقابلے میں میں صرف بیس کلو کپاس ہی اکٹھی کر سکا تھا۔ یہاں اوسط چنانی سو ایک سو دس کلو کے قریب ہوتی تھی۔ اس زمانے میں کپاس کے پودے لمبے اور کم گھنے ہوتے تھے۔ ان کے درمیان سے آسانی سے گزرا جاسکتا تھا اور چنانی بھی آسان ہوتی تھی۔ پھول کے اندر بیجوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی اس لئے وزن زیادہ ہو جاتا تھا۔ آج کی جدید کپاس میں بیج کم ہو گئے ہیں اور کپاس کا پودہ بھی گھنا اور چوڑا ہو گیا ہے۔ آج کپاس کی فی ایکڑ اوسط زیادہ ہو گئی ہے لیکن چنانی مشکل ہو گئی ہے۔ آج کے دور میں ایک نارمل عورت 80 کلو کے قریب چنانی کر لیتی ہے جبکہ فل تیز رفتاری سے چنانی کرنے والی عورت اوسطاً ایک سو دس تک چلی جاتی ہے۔

اس دور میں کم سے کم چنانی 80 کلو کے قریب ہوتی تھی جبکہ زیادہ سے زیادہ ایک سو ستر تک بھی لوگ چنانی کر لیتے تھے۔ ہمارے ڈیرے کی سب سے تیز رفتار عورت ایک سو ساٹھ کلو کے قریب چنانی کرتی تھی۔ آج عالیہ نے پہلے دن ہی ایک سو چالیس کلو کی چنانی کر کے سب کو حیران کر دیا تھا۔ 140 کلو۔۔۔ جیسے ہی جیکسن بھائی کی آواز آئی ابو اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ عالیہ دو گھنٹے لیٹ آئی تھی لیکن پھر بھی اس نے پہلے دن 140 کلو کی چنانی کر کے حیران کر دیا تھا۔ میں بھی وزن دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ وہ انتہائی تیز رفتاری سے چنانی کرتی تھی۔

”عالیہ! تم تو بہت تیز ہو، میرے پاس آج تک جتنے بھی غلام یا لونڈیاں آتی ہیں ان میں سے کسی نے

بھی آج تک پہلے دن پچاس کلو سے زیادہ چنائی نہیں کی ہے۔ یہ لوگ چالیس پچاس سے شروعات کرتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ سو سے اوپر تک چلے جاتے ہیں اور تم نے تو پہلے دن ہی ایک سو چالیس کلو چنائی کی ہے۔ آنے والے دن تو مزید اوپر تک جاؤ گی۔“ ابو نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ پکے زمیندار تھے۔ اگر ایک غلام دو دو غلاموں جتنی چنائی کر رہا ہو تو انہیں خوشی ہوتی تھی۔ عالیہ کے بعد آخری باری میری تھی اور میری کپاس صرف بیس کلو ہی نکلی۔

”ایلی صاحب! آپ تو پورا کھیت ہی ختم کر کے آگئے ہو۔“ جیکسن بھائی میرا وزن دیکھ کر مسکرا کر لگے۔ انھوں نے میرے تھیلے کو کنڈے پر ہی لٹکنا رہنے دیا۔ ابو اور فیلکس بھائی بھی آکر وزن دیکھنے لگے۔

”ایلی! جو تمہارا کام ہے وہی کرو، یہ تمہارا کام نہیں ہے۔“ ابو مجھے سمجھانے لگے۔

”نہیں بھائی! مجھے یہ کام کر کے دیکھنا ہے۔ میں ایک بار ان غلاموں کی نفسیات سمجھنا چاہتا ہوں۔ آپ میرے لئے پریشان مت ہوں۔“ میں نے بھائی کو جواب دیا اور باقی غلاموں کے ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا۔

ابو کافی دیر تک مجھے غلاموں کے ساتھ کھڑا دیکھتے رہے، شاید وہ کچھ سوچ رہے تھے۔ میں خاموشی سے زمین پر نظریں جھکائے کھڑا ہوا تھا۔ ابو روزانہ سب سے کم چنائی کرنے والے تین لوگوں کو کھانا نہیں دیتے تھے۔ انہیں ساری رات باہر درخت کے نیچے زنجیر سے باندھ دیا جاتا تھا۔ وہ غلام ساری رات وہاں بھوکے پیاسے بندھے رہتے تھے اور صبح ہی ان کو پھر وہاں سے آزاد کر کے کھیتوں میں لے جایا جاتا تھا۔ یہاں ایک سو دس غلام ڈیرے پر کام کر رہے تھے۔ 110 غلاموں میں سے 80 غلام چنائی کا کام کر رہے تھے جبکہ باقی دوسرے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ روزانہ تین غلام ادھر سے سزا کے لئے نکلتے تھے جبکہ ایک آدھ غلام دوسری طرف سے بھی آجاتا تھا۔ روزانہ چار پانچ غلاموں کو سزا دی جاتی تھی۔ اچھا اور بہترین کام کرنے والوں کو انڈے اور دودھ بھی دیا جاتا تھا۔ ہمارے ڈیرے پر بھیڑ، بکریاں، گائے اور مرغیاں بہت زیادہ تھیں۔

اس زمانے میں دودھ اور انڈوں کا زیادہ کاروبار نہیں ہوتا تھا۔ 80 فیصد سے زیادہ لوگ زراعت سے کسی نہ کسی طور پر وابستہ تھے۔ فیکٹریاں یا کارخانے سارے بڑے شہروں میں ہوتے تھے، جہاں مزدور کام کرتے تھے یا پھر سرکاری ملازم بھی شہروں میں ہوتے ہیں۔ شہر کے مضافات میں ڈیری فارم یا پولٹری فارم ان کی ضروریات پوری کر دیتے تھے جبکہ دور دراز کے گاؤں یا دیہات والے سواری نہ ہونے کی وجہ سے

وہاں دودھ نہیں لے جاسکتے تھے۔ اس زمانے میں کوئی سٹورنگ سسٹم نہیں ہوتا تھا۔ دودھ ایک دن میں ہی خراب ہو جاتا تھا۔ جبکہ ہمارا نزدیک ترین آسٹن شہر بھی تین دن کے فاصلے پر تھا۔ پنجاب کے دیہاتی معاشرے میں آپ کو آج بھی ایسی کہاوٹیں سننے کو ملیں گی کہ دودھ خدا کا نور ہوتا ہے اور اسے بیچنا خدا کے نور کو بیچنے کے برابر ہے۔ ایسی ہی مثال انڈیا میں سکھوں میں بھی ہے اور ہندو بھی اسے عزت کا درجہ دیتے ہیں اور بہت سے جٹ زمیندار اسے نہیں بیچتے تھے۔ یہ اصل میں مارکیٹ کے نہ ہونے کی وجہ سے ہوتا تھا۔

پرانے زمانے میں گاؤں دیہات میں تقریباً 90 فیصد لوگوں کے پاس گائے یا بھینس ہوتی تھی۔ سب کے گھر میں دودھ ہو تو خریدے گا کون؟ ہمارے والد نے سارے جانور اور مرغیاں گوشت کے لئے رکھے ہوئے تھے۔ وہ ہر مہینے جانور آسٹن شہر لیکر جاتے تھے جہاں ان جانوروں کی کافی اچھی قیمت مل جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ارد گرد کے دیہاتوں سے بھی مقامی قصائی ابو سے جانور خرید کر لے جاتے تھے۔ ان جانوروں سے حاصل ہونے والا دودھ وافر مقدار میں ہوتا تھا۔ ہماری اپنی فیملی بھی کافی بڑی تھی۔ فلوریٹن کے گھر میں بھی دودھ ہمارے ہاں سے ہی جاتا تھا۔ ہمارے گھر میں کافی دودھ لگتا تھا لیکن پھر بھی بہت زیادہ بیچ جاتا تھا۔ ابو اس دودھ کو جو غلام اچھا کام کرتے تھے انھیں دے دیتے تھے۔ گرم دودھ انڈوں کے ساتھ بہت بڑی عیاشی تھی جو ہمارے غلاموں کو ملتی تھی۔ ابو 100 کلو سے اوپر چنائی کرنے والے ہر غلام کو دودھ دینے کا حکم دے دیتے تھے۔ ہمارے غلام صرف ایک پیالہ دودھ پینے کے لئے سارا دن محنت کرتے تھے۔ اس وقت بھی سب کی کپاس کا وزن ہو چکا تھا۔ سب غلام ایک سائیڈ پر کھڑے ابو کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سب سے کم چنائی والے تین غلام رحم دلانہ نظروں سے ابو کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ ابو کبھی بھی نرم دل نہیں ہوتے تھے۔ وہ ایک سخت گیر زمیندار تھے جو کبھی بھی اپنے غلاموں پر رحم نہیں کرتے تھے۔ انھیں معلوم تھا لیکن پھر بھی وہ ایک امید بھری نظر سے دیکھ رہے تھے۔

”فیلیکس! آج کس کس نے کم چنائی کی ہے؟“ ابو نے فیلیکس سے پوچھا تو بھائی نے تین غلاموں کے نام لئے۔

وہ تینوں دو قدم آگے آ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک مسلح پہریدار نے اپنے کوڑے کو زور سے فضا میں لہرایا اور وہ بھی آگے آ گیا۔ درخت کے نیچے باندھنے سے پہلے ان غلاموں کی اچھی خاصی دھلائی کی جاتی تھی۔ جسم پر پڑنے والے کوڑے کھال ادھیڑ کر رکھ دیتے تھے۔ مسلح پہریدار پہلے سزا پانے والے غلاموں کو کوڑے

مارتے تھے اور پھر انہیں باہر باندھ دیتے تھے۔ زخموں سے اٹھنے والی ٹیسس ان غلاموں کو پوری رات آرام نہیں کرنے دیتی تھیں۔ سردی، بھوک، درد سب چیزیں مل کر اسے پوری رات جگائے رکھتی تھی۔ صبح تک وہ بالکل ادھمرا سا ہو جاتا تھا اور پھر اگلے پورا دن پھر کام کرنا ہوتا تھا۔ وہ تھک کر نیچے گرتا تھا تو اوپر سے پہریدار مزید مارتے تھے۔ یہ روزانہ کام ہوتا تھا۔ آج کے سزا یافتہ تینوں غلام کھڑے کانپ رہے تھے۔ ایک پہریدار کوڑا لینے ابو کے حکم کا منتظر تھا۔ اگلے کچھ ہی لمحوں میں سزا شروع ہونے والی تھی۔

”آج میرے بیٹے ایل کی خوشی میں تم سب کی سزا معاف ہے۔ آج تم سب کو دودھ بھی ملے گا اور انڈے بھی۔۔۔ آج سب کی پارٹی ہے۔“ ابو نے اونچی آواز میں کہا تو سارے غلام خوشی سے چلانے لگے۔ وہ سارے میرے نام کے نعرے لگا رہے تھے۔ آج کا کام مکمل ہو گیا تو ابواور بھائی گھر چلے گئے جبکہ میں دوسرے غلاموں کے ساتھ باہر صحن میں آ گیا۔

رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ سامنے ہی صحن میں ایک بڑی دیگ رکھی ہوئی تھی جس میں سالن تھا۔ ایک اور دیگ چولھے پر چڑھی ہوئی تھی جس میں دودھ ابل رہا تھا۔ نیچے آگ جل رہی تھی اور اس کی روشنی سے پورا صحن روشن ہو رہا تھا۔ کھانا تیار ہو گیا تھا۔ ہم سب اپنے اپنے شلٹروں میں گئے اور اپنے پیالے لیکر آ گئے۔ میں اور عالیہ آج پہلی بار آئے تھے۔ ہمیں بھی دودھ پیالے دے دیئے گئے۔ ایک پیالہ سالن کے لئے تھا جبکہ دوسرا پیالہ دودھ یا پانی پینے کے لئے تھا۔ میں نے اپنے حصے کا سالن اور بریڈ لیا اور عالیہ کے ساتھ صحن میں ہی بیٹھ کر کھا لیا۔ ایک بریڈ اور سالن سے میری بھوک ختم نہیں ہوئی تھی۔ کھانا تقسیم کرنے والا مجھے مزید کھانا دینا چاہتا تھا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ سب کو ایک ایک بریڈ مل رہی تھی تو میں نے بھی ایک ہی بریڈ لی۔ میں کوئی بھی اضافی مراعات نہیں لینا چاہتا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم اپنے شلٹر میں آ گئے۔ ہم نے بستر سیدھے کئے اور لیٹ گئے۔

شلٹر کے اندر ایک لائین جل رہی تھی جس کی مدد ہم روشنی پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ عالیہ کمرے کے کونے میں تھی، اس کے ساتھ میرا بستر تھا جبکہ میرے ساتھ ایک بیس سال کی نوجوان لڑکی لیٹی ہوئی تھی۔ یہ لڑکی بھی ادھر ہی پیدا ہوئی تھی۔ ساندرا بہت پیاری لڑکی تھی، وہ تقریباً میری ہم عمر ہی تھی۔ بچپن میں وہ اپنی ماں کے ساتھ ہمارے ہی گھر میں رہتی تھی۔ بعد میں دس سال کی عمر میں وہ ڈیرے پر آ گئی تھی۔ اس کی والدہ پچھلے سال ہی فوت ہو گئی تھی۔ اسے ہمارے ایک پہریدار نے گولی مار دی تھی کیونکہ وہ بے چاری

اپنی بیٹی کی عزت بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ساندہ کی والدہ کے مرنے کا سب سے زیادہ افسوس مجھے ہی ہوا تھا۔ مجھے وہ لڑکی بہت اچھی اور معصوم لگتی تھی۔ ساندہ بہت معصوم لڑکی تھی۔ اس دن وہ بڑی تھکی ہوئی اور بیمار تھی جس دن پہریدار نے اس سے زیادتی کی تھی۔ وہ پیدائشی غلام تھی اور اس نے اسی معاشرے میں آنکھ کھولی تھی۔ وہ کبھی بھی مزاحمت نہیں کرتی تھی۔ بس اس بیماری اور تھکی ہونے کی وجہ سے وہ مزاحمت کر رہی تھی۔ اس کی تکلیف اور چیخیں پورے کھیت میں گونج رہی تھیں۔

مرد کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے کہ عورت جتنی چیختی اور چلاتی ہے مرد اتنا ہی وحشی بن جاتا ہے۔ اس دن وہ پہریدار وحشی بنا ہوا تھا۔ ساندہ کی ماں سے اپنی بیٹی کی تکلیف دیکھی نہ گئی اور وہ مسلح پہریدار سے لڑ پڑی اور بدلے میں ماری گئی۔ پہریدار نے اسے ایک گولی ماری تھی جو سیدھی اس کے دل میں لگی اور وہ بے چاری بیٹی بچانے کے چکر میں خود ماری گئی۔ میں اس پہریدار پر مقدمہ کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اس پر بہت غصہ تھا لیکن ابو نے اسے معاف کر کے کام سے نکال دیا۔ وہ اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ سیاہ فام کو مارنے کی کوئی سزا نہیں تھی۔ صرف مارنے والے سے مالک اپنے غلام کی پوری قیمت وصول کر سکتا تھا۔ یہ بہت بڑی رقم ہوتی ہے جسے ادا کرنا اس پہریدار کے بس سے باہر تھا۔ میں جرمانے کے حق میں تھا لیکن ابو کو معلوم تھا کہ اگر انھوں نے جرمانے کی قیمت وصول کرنے کی کوشش کی تو اس کے ڈیرے پر کام کرنے والے باقی پہریدار کام چھوڑ دیں گے۔ ایک پہریدار کو سزا دلوانے کے بعد پھر کوئی بھی پہریدار ہمارے ساتھ کام نہیں کرتا۔ ابو ایک جہاں دیدہ زمیندار تھے۔ انھیں اپنے ایک غلام کے مرنے کا دکھ ضرور ہوا تھا کیونکہ ان کے تین ساڑھے تین سو ڈالر کا نقصان ہوا تھا لیکن وہ اس نقصان کو برداشت کر گئے تھے۔ ساندہ چار دن اپنی ماں کے دکھ میں مبتلا رہی اس کے بعد اسے یہ سب کچھ بھول کر دوبارہ کام پر آنا پڑا۔ وہ غلام تھی اور اسے زیادہ دنوں تک اداس رہنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ کمرے کے ایک کونے میں لالٹین چل رہی تھی جس کی ہلکی ہلکی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

”ایلی! زیادہ تھک تو نہیں گئے ہیں؟“ ایک سیاہ فام لڑکا میرے بستر کے پاس کھڑا مجھے پوچھ رہا تھا۔ وہ پیٹر تھا جس کی عمر پچیس سال کے قریب تھی۔ وہ پچھلے پانچ سال سے ہمارے ڈیرے پر کام کر رہا تھا۔ ابو اسے آسٹن سے خرید کر لائے تھے۔ پیٹر بہت اچھا لڑکا تھا۔

”نہیں یار! میں ٹھیک ہوں، شکریہ! تم ٹھیک ہونا؟“ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

”جی! میں تو ٹھیک ہوں، آپ پہلی بار آئے ہیں اس لئے پوچھ رہا ہوں۔ آپ نے پہلے کبھی مزدوری نہیں کی ہے اس لئے آپ کا جسم ٹوٹ رہا ہوگا؟“ اس نے کہا۔ میری حالت واقعی اس وقت بہت خراب ہو رہی تھی۔ میرے جسم کا انگ انگ اس وقت درد کر رہا تھا لیکن میں پھر بھی انکار کر رہا تھا۔ میں ان لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو کمزور ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”ایلی صاحب! زیادہ بہادر بننا بھی خطرناک ہوتا ہے۔ یہ دس منٹ آپ کو دبا دے گا تو آپ کی تھکاوٹ ختم ہو جائے گی۔“ ساندہ نے معصوم سے لہجے میں کہا تو بے اختیار میری ہنسی نکل گئی۔

”ایلی سر! میں بہت اچھا دبا تا ہوں، آپ کی تھکاوٹ ختم ہو جائے گی۔“ پیٹر نے ساندہ کی بات سن کر کہا۔

”ایلی! کچھ دیر کے لئے ٹانگیں اور جسم دباؤ تو ٹھیک ہو جاؤ گے ورنہ صبح تک اٹھنے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔“ عالیہ نے بھی اس بار مجھے پیٹر سے جسم دبانے کا کہا تو میں نے حامی بھر لی۔

پیٹر نے مجھے سینے کے بل لٹایا اور آہستہ آہستہ پہلے ایک پیر سے میری پشت اور ٹانگوں پر وزن ڈال کر دبا تا رہا اور پھر وہ پورے کا پورا ہی میرے اوپر کھڑا ہو گیا۔ میری ٹانگوں میں گلٹ بن گئے تھے اس لئے پیٹر کے دبانے سے مجھے بہت تکلیف ہو رہی تھی لیکن میں پھر بھی برداشت کر کے لیٹا رہا۔ وہ کوئی آدھے گھنٹے تک مسلسل دبا تا رہا اور میں بالکل ہشاش بشاش ہو گیا۔

”شکریہ پیٹر یار! تم بہت اچھے ہو۔“ میں نے پر خلوص انداز سے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ واپس اپنے بستر پر چلا گیا۔

”ایلی صاحب! ہم سیاہ فام جتنے بھی اچھے ہو جائیں رہیں گے تو پھر بھی غلام ہی نا؟ ہم لوگ کبھی اس غلامی سے باہر نہیں آ سکتے۔“ عالیہ نے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ کافی دیر تک میرے چہرے کی طرف دیکھتی رہی اور پھر پہلو بدل کر لیٹ گئی۔ وہ مجھ سے منہ پھیر کر دیوار کی طرف منہ کر کے لیٹ گئی تھی۔

”عالیہ! رات جتنی بھی کالی ہو وہ دن کو ہمیشہ ختم ہو جاتی ہے۔ ہر رات کے بعد دن ضرور آتا ہے۔“ میں نے ایک ہاتھ اس کی کمر پر رکھا اور اسے خود سے قریب کر لیا۔

”ایلی صاحب! غلامی کی سیاہ رات کبھی دن میں نہیں بدلتی۔ ہمیں صرف موت ہی اس غلامی سے آزاد کر

سکتی ہے۔“ اس کے الفاظ سیدھے میرے دل پر لگ رہے تھے۔ الٹیں بھج چکی تھی، کمرے میں اندھیرا ہو چکا تھا۔ عالیہ کی پشت میری طرف تھی۔ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی لیکن پھر بھی نجانے کیوں مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ میری طرف ہی دیکھ رہی ہے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے گھور رہی ہو۔

دوسرے دن صبح صبح ہم نے ایک ایک بریڈ کپڑے میں باندھا اور کھیتوں میں چلے آئے۔ آج بھی وہی روٹین تھی۔ صبح پہلے دو گھنٹے تو میں آرام سے چنائی کرتا رہا اس کے بعد تھوٹ ہونا شروع ہو گئی۔ دوپہر تک میری ٹانگیں فل درد کرنا شروع ہو گئی تھیں۔ پانی کے وقفے کے بعد میں دوبارہ چنائی کرنے لگا۔ عالیہ مجھے مسلسل منع کرتی رہی لیکن میں ہر بار انکار کرتا رہا۔ میں پڑھا لکھا اور نازک مزاج لڑکا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی بھی کام نہیں کیا تھا لیکن پھر بھی میں اپنی ضد کا پکا تھا۔ میں نے کبھی زندگی میں ہار نہیں مانی تھی۔ میں آخری حد تک جدوجہد کرنے والا انسان تھا اس لئے انتہائی تھکاوٹ کے باوجود بھی اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ جیسے تیسے کر کے دن کا اختتام ہوا اور ہم اپنی کپاس بیل گاڑی پر لوڈ کر کے سٹور روم آ گئے۔ میری چنائی آج بیس سے بڑھ کر پچیس ہو گئی تھی جبکہ عالیہ کی کپاس آج ایک سو ستر تک چلی گئی تھی۔

”کیا بات ہے عالیہ! تم تو کوئین ہو۔۔۔ کوئین آف امریکہ، کوئین آف کاٹن۔“ ابو نے عالیہ کے کندھے پر تھپکی دے کر اسے شاباش دی۔

”تم واقعی کوئین ہو عالیہ! ہر کام میں بالکل پرفیکٹ اور بہترین، تم نے آج تک جو بھی کام کیا ہے وہ بہترین ہوتا ہے۔ تم گھر کے کاموں میں بھی ماہر ہو اور کھیتوں کا کام بھی تم سے بہتر کوئی نہیں کرتا ہے۔ دودھ اور انڈے تمہارے لئے کھلے ہیں۔ کوئی مقدار نہیں ہے، پیٹ بھر کے کھاؤ اور پیو آج رات تم پر کوئی حد نہیں ہے۔“ ابو نے اگلا حکم دیا اور میرے تھیلے کی طرف دیکھنے لگے۔

”کوئی بات نہیں ایل! ہر کام کوئی نہیں کر سکتا، تم زمینداری نہیں کر سکتے اور ہم تمہارے جتنا پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ خدا انسان کو ایک ہی بڑی صلاحیت دیتا ہے اور باقی نارمل ہوتی ہیں۔“ ابو مجھے تسلی دے رہے تھے جبکہ میں عالیہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے جتنا پڑھی لکھی تو نہیں تھی لیکن پھر بھی اس کی ذہانت نظر آتی تھی۔ وہ ذہین بھی تھی اور محنتی بھی۔۔۔ خدا نے اسکو ہر صلاحیت دے رکھی تھی۔

”ایلی صاحب! ہر صلاحیت نہیں ہے میرے پاس، میں اپنی مرضی سے کہیں جا نہیں سکتی ہوں، میری زندگی پر میرا اختیار نہیں ہے۔ یہ غلامی دنیا کی ہر صلاحیت کو کھا جاتی ہے۔ خدا کی دی ہوئی ہر صلاحیت اس

غلامی کے آگے حقیر ہو جاتی ہے۔“ میں عالیہ اور ساندراہ احاطے میں کھڑے ہوئے تھے۔

ہم ان پانچوں غلاموں کو سسکتے ہوئے دیکھ رہے تھے جن کو آج سزا کے طور پر باہر زنجیروں سے باندھا گیا تھا۔ ان میں پیٹر بھی شامل تھا۔ وہی پیٹر جس نے رات کو مجھے دبایا تھا۔ وہ آج خالی کپاس کے پودوں کی کٹائی کرنے گیا تھا۔ پہریدار کو اس کی کوئی بات پسند نہیں آئی تھی اور اس نے اسے بھی سزا کے لئے منتخب کر دیا تھا۔ باہر احاطے میں زنجیروں سے باندھنے سے پہلے انہیں کوڑے مارے گئے تھے۔ وہ سب ان کوڑوں سے زخمی ہوئے تھے اور اسی وجہ سے سسک رہے تھے۔

”عالیہ! اس میں قصور بھی تو تمہیں لوگوں کا ہے نا۔۔۔ خدا نے کسی کو بھی غلام پیدا نہیں کیا ہے۔ تم لوگ مزاہمت ہی نہیں کرتے ہو۔“ میں نے اسکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایلی صاحب! آپ اپنے ہی والد اور بھائیوں کے خلاف ہمیں بغاوت کرنے پر اکسار رہے ہو؟ اپنی ہی نسل کے سفید فاموں کے خلاف؟“ وہ عجیب سے انداز سے بولی۔ میں کافی دیر تک اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔

”عالیہ! میں کسی کو بغاوت کے لئے نہیں اکسار باہوں بلکہ میں بس اس سسٹم کے خلاف ہوں۔ مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا۔“ میں نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

”ایلی صاحب! خالی باتوں سے کچھ نہیں ہوتا، کچھ عملی قدم بھی اٹھانا پڑتا ہے۔“ کھانا شروع ہو گیا تھا اور وہ کھانا لینے کے لئے آگے بڑھ گئی۔

”عالیہ! میں کیا کر سکتا ہوں؟ یہ غلامی پورے امریکہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ میں پورے امریکہ سے تو نہیں لڑ سکتا ہوں؟“ میں نے پیچھے سے عالیہ کا کندھا پکڑ لیا۔

”ایلی! جہاں جا رہے ہوں وہاں امریکہ کا بادشاہ بیٹھتا ہے؟ تم کچھ نہیں کر سکتے لیکن وہ تو کر سکتا ہے نا؟ میری رسائی وہاں تک نہیں ہے لیکن تم تو پہنچ سکتے ہو نا؟ ہمارے دکھ، درد اور ہمارے جذبات ہمارے احساسات کی ترجمانی تو کر سکتے ہو نا؟“ وہ مڑ کر میرے مقابل کھڑی ہو گئی۔

”عالیہ! یہاں کا بادشاہ بھی تو ان میں سے ایک ہوگا؟ وہ بھی تو سفید فام امریکی ہوگا؟ اسے ہمارے دکھ درد سے کیا لینا؟“ اس بار ساندراہ بولی۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی کھڑی تھی۔

”یہ صحیح کہہ رہی ہے۔۔۔ امریکی صدر کو آپ کے جذبات اور احساسات سے کیا غرض ہوگی؟ میری

بات اس پر کوئی اثر نہیں کرے گی۔“ میں نے ساندہ کی بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

”ایلی صاحب! جب تالاب میں پتھر پھینکتے ہو تو وقتی طور پر اس کی لہروں میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور پھر تالاب پر سکون ہو جاتا ہے۔ وہ چھوٹا سا پتھر وقتی ارتعاش بھی پیدا کرتا ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس تالاب کے پینڈے میں بھی رہتا ہے۔ وہ چھوٹا سا پتھر ہمیشہ اس تالاب کو احساس دلاتا رہتا ہے کہ اس نے کچھ پل کے لئے ہی سہی مزاہمت ضرور کی تھی۔ ایلی صاحب! بارش کے پہلے قطرے تو بنو، تالاب میں گرنے والے پہلے پتھر تو بنو، تمہارے پیچھے اور پتھر بھی آئیں گے جو اس تالاب کو بھر دیں گے۔“ وہ اندر کمرے میں گئی اور اپنے پیالے اٹھا کر لے آئی۔

ہم نے لائین میں لگ کر اپنا کھانا لیا، وہیں ایک کونے میں بیٹھ کر کھالیا اور پھر اپنے اپنے بستروں میں جا کر لیٹ گئے۔ رات کے پچھلے پہر میں خاموشی سے اٹھا اور کچن میں چلا گیا۔ وہاں رات کا بچا ہوا کھانا پڑا تھا۔ اس وقت پچاس سال کا قدرے ادھیڑ عمر سیاہ فام وہاں بیٹھا ہوا تھا۔

”ایلی سر! آپ کیسے ادھر آئے ہیں؟“ وہ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”مجھے بریڈ چاہئیں۔“ میں نے اس سے بریڈ مانگے تو اس نے جلدی سے بریڈ والی ٹوکری میرے آگے کر دی۔ میں نے ایک تھیلے میں کافی سارے بریڈ ڈالے اور واپس مڑ گیا۔

”بابا! جانتے ہو نا یہ بات باہر کسی سے بھی نہیں کرنی ہے؟“ میں نے تیز سہراتی ہوئی آواز میں کہا تو اس نے سر ہلا دیا۔ مجھے معلوم تھا وہ کبھی بھی یہ بات کسی سے نہیں کہے گا۔ میں تھیلہ لیکر باہر آیا اور سیدھے پیٹر اور اس کے ساتھ بندھے ہوئے دوسرے قیدیوں کے پاس پہنچ گیا۔

”ایلی سر! آپ کیسے اتنی رات کو جاگ رہے ہیں؟“ یہاں رات کو ایک مسلح پہریدار ہوتا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر قریب آ گیا۔

”مجھے جانتے ہونا؟“ میں نے الٹا اس سے سوال کیا۔

”جی جی ایلی سر! آپ مالک کے بیٹے ہو، آپ کو تو میں پہچانتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”پہریدار صاحب! اگر مجھے پہچانتے ہو تو اتنا تو جانتے ہی ہو گے کہ چھوٹے بیٹے ہمیشہ طاقت ور ہوتے ہیں اور وہ اپنے باپ اور بھائیوں کے تمام فیصلوں پر اثر انداز ہو سکتے ہیں؟“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔

”سر! آپ کی بات مجھے سمجھ نہیں آئی۔“ وہ میری بات سمجھ نہیں سکا تھا۔

”جناب! سیدھی سی بات ہے، کبھی مجھے ہلکا مت سمجھنا ورنہ نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ اپنی آنکھیں اور زبان بند رکھو تو فائدے میں رہو گے ورنہ میں شکل سے جتنا شریف اور نفیس دکھتا ہوں اتنا ہوں نہیں۔“ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ٹھوس لہجے میں کہا۔

”سر! آپ کو میری طرف سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ ہم نوکر لوگ آپ مالکوں کے معاملے میں نہیں پڑتے ہیں۔“ اس نے جلدی سے کہا اور دوسری طرف چلا گیا۔ میں نے اپنے تھیلے سے بریڈ نکالے اور بندھے ہوئے غلاموں کو پکڑ ادیئے۔

”ایلی صاحب! آپ بہت اچھے ہو، خدا نے آپ کا دل سونے کا بنایا ہے۔“ پیٹر نے کانپتے ہاتھوں سے بریڈ پکڑا اور شکر گزار نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

”یار! ایسا مت کہو، میں بھی آپ کی طرح ہی انسان ہوں صرف رنگ کا ہی تو فرق ہے۔ وہ بھی خدا کا بنایا ہوا ہے۔“ میں نے دو پیالیوں میں پانی لیا اور باری باری سب کو پانی پلا کر واپس کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔

”ایلی صاحب! آپ اتنے بھی برے نہیں ہو۔“ مجھے عالیہ کی سرگوشی سنائی دی، وہ جاگ رہی تھی۔

”اچھا؟ یعنی آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ میں برا تو ہوں لیکن زیادہ برا نہیں ہوں؟“ میں نے بھی سرگوشی سے جواب دیا۔ میرے لہجے میں تھوڑی سی شکایت جھلک رہی تھی۔

”ارے نہیں یار! تم تو بہت اچھے ہو، میں تو مذاق کر رہی تھی۔“ اس نے میری طرف رخ بدلتے ہوئے کہا۔ نیم اندھیرے میں مجھے اس کی آنکھیں چمکتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ میں نے اسے کمرے سے پکڑا اور خود سے نزدیک کر لیا۔ وہ تھوڑا کسمسائی اور پھر میرے گلے لگ گئی۔ میں نے اپنا سر اس کے سینے پر رکھا اور سو گیا۔

میرے آنکھ اس کے بعد صبح ہی کھلی۔ سارے لوگ اٹھ چکے تھے اور کھیتوں میں جانے کی تیاری کر رہے تھے جبکہ میں عالیہ کے سینے پر سر رکھے سو رہا تھا۔

”ایلی! کھیتوں میں جانے کا ارادہ ہے یا پھر چھٹی کرنی ہے؟“ مجھے آنکھیں کھولتے ہوئے اس نے دیکھا تو سوال کر دیا۔

”اوہ سوری یار! مجھے خیال نہیں رہا، میں نے ساری رات تمہیں بھی ڈسٹرب کیا ہوگا؟“ میں جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کھیتوں میں جانے کی تیاری کرنے لگا۔ پانچ منٹ میں ہی میں نے اٹھ کر کپڑے تبدیل کر

لئے اور ہم سب کھیتوں کی طرف جانے لگے۔ صبح کی ہلکی ہلکی روشنی ابھر رہی تھی، ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔
 ”سوری عالیہ! میری وجہ سے تم رات بھر سوئی نہیں ہو گی؟“ میں نے کھیت میں پہنچتے ہی ایک بار پھر
 معذرت کی۔

”ارے نہیں یار! پہلی بار تو سکون کی نیند آئی تھی۔ امریکہ کی یہ پہلی رات تھی جب میں پرسکون ہو کر
 گہری نیند سوئی ہوں۔ ایللی! تم واقعی بہت اچھے انسان ہو۔“ عالیہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور چنائی کرنے
 لگی۔ ہم دونوں دس قطاریں ہی لیتے تھے جن میں سے آٹھ قطاریں وہ چننی تھی جبکہ میں صرف دو قطاریں ہی
 لے کر جا سکتا تھا۔ دوپہر کو ابو گھوڑے پر آئے تو ان کے گھوڑے کے ساتھ تقریباً گھسٹتا ہوا وہی رات والا
 بوڑھا غلام بھی تھا۔ اس کی پشت کوڑوں سے چھلنی ہو چکی تھی۔ اس نے شلوار کے اوپر کوئی قمیض نہیں پہنی ہوئی
 تھی۔ اس کی پشت لہو لہان تھی۔ خون اس کی شلوار اور نیچے چڑے کے جوتوں تک کو بھگور ہا تھا۔ اس کی حالت
 نازک تھی اور وہ گرتا پڑتا گھوڑے کے ساتھ ساتھ بھاگتا ہوا آیا تھا۔

”چلو کھیتوں میں کام کرو! آج کے بعد تم یہیں رہو گے اور اگر تمہاری کپاس کم ہوئی تو رات کو وہیں
 بندھے ہوئے ہو گے جہاں کے غلاموں کو تم نے کھانا دیا ہے۔“ ابو نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے ہی اسے لات
 مار دی تو وہ زمین پر منہ کے بل گر گیا۔

”اوائے پہریدار! اس کا خیال رکھنا، اگر یہ ایک لمحے کی بھی غفلت کرے تو بے شک اسے ادھیڑ کر رکھ
 دینا مجھے کوئی رحم نہیں چاہیے۔۔۔ یہ لوگ مجھے بہکا رہے ہیں۔“ ابو نے گرجدار آواز میں ایک پہریدار کو کہا تو
 وہ جلدی سے آگے آ کر اس بوڑھے کے ہاتھ کھولنے لگا۔ ہاتھ کھولنے کے بعد اس نے اسے دو تین کوڑے
 مارے اور اسے باقی غلاموں کے ساتھ لگا کر چنائی کرنے پر لگوا دیا۔ ابو کو میرے رات والے واقعے کا علم ہو
 گیا تھا۔ انہیں کہیں سے اطلاع مل گئی تھی کہ میں نے رات کو بچن سے کھانا لیا ہے اور باہر بندھے ہوئے
 غلاموں کو کھانا کھلایا ہے۔

”ابو! یہ زیادتی ہے، آپ میری وجہ سے کسی کو سزا نہیں دے سکتے۔“ میں احتجاج کرنے لگا۔ وہ بوڑھا
 غلام میری وجہ سے ہی زیرِ عتاب آیا تھا۔

”ایللی! میں نے تمہیں یہاں بھیجنے سے پہلے ہی کہا تھا کہ ڈیرے کے کسی بھی معاملے میں ٹانگ مت
 اڑانا، تم کام کرتے ہو یا نہیں کرتے ہو، تھوڑا کرتے ہو یا زیادہ کرتے ہو مجھے اس سے کوئی اعتراض نہیں

ہے۔ تم اپنے کام سے کام رکھو اور ڈیرے کے کسی بھی معاملے میں ٹانگ مت اڑاؤ۔ میں تمہاری وجہ سے اپنے ڈیرے کا ماحول خراب نہیں کر سکتا۔“ ابو نے سختی سے میری بات کا جواب دیا۔

”لیکن ابو! میری غلطی کی سزا آپ اسے کیوں دے رہے ہیں؟ کھانا میں نے ان غلاموں کو کھلایا تھا اس لئے آپ سزا بھی مجھے دیں، وہ بے قصور ہے۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔

”نہیں ایلی! قصور اسی کا ہے۔ وہ تمہیں روکنے کا اختیار نہیں رکھتا تھا لیکن مجھے بتانا اس کا فرض تھا۔ یہ بات اس نے مجھ سے چھپا کر غلطی کی ہے اور اسے اس کی سزا بھی ملے گی۔“ ابو نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”سر! میں آپ کو بتانے ہی والا تھا، مجھے آپ صبح ملے ہی نہیں تھے۔“ رات والے مسلح پہریدار نے جلدی سے صفائی دیتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں! آئندہ خیال رکھنا اور ان پانچوں غلاموں کو لیکر ڈیرے پر پہنچو جو رات کو بندھے ہوئے تھے۔ جنھوں نے رات کو میری اجازت کے بغیر کھانا کھایا ہے۔“ ابو نے پہریدار سے کہا۔ رات والا مسلح پہریدار سفید فام ملازم تھا۔ ابو اسے دوسرے سیاہ فام غلاموں کی طرح سزا نہیں دے سکتے تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اسے کام سے نکال سکتے تھے اور بس، اس سے زیادہ وہ اس کے ساتھ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارا سارا زور سیاہ فام غلاموں پر چلتا تھا اور ابو انہی پر اپنا غصہ دکھا رہے تھے۔ ابو نے اپنا گھوڑا واپس ڈیرے کی طرف موڑا اور واپس جانے لگے۔ میں جلدی سے ان کے آگے گیا۔

”ابا! آپ غلط کر رہے ہو۔۔۔ یہ ظلم ہے۔ آپ میری غلطی کی سزا نہیں دے رہے ہیں۔“ میں ان کو روکنے لگا۔

”ایلی! یہ تمہاری غلطی نہیں ہے بلکہ یہ ان کی غلطی ہے۔ ان کی جرات کیسے ہوئی میرے حکم کے بغیر کھانا کھانے کی؟“ ابو کا غصہ ابھی تک برقرار تھا۔

”ابا! خدا نے اگر آپ کو با اختیار بنایا ہے تو ظلم مت کرو، آپ خدا بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ میں انھیں سمجھانے لگا۔

”ایلی! تم ابھی بہت چھوٹے ہو تم نے ابھی دنیا نہیں دیکھی ہے اسی لئے ایسی باتیں کر رہے ہو۔ یہ ظلم کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہم لوگ یہ سب کچھ نہیں کریں تو پھر کام کون کرے گا؟ یہ سیاہ فام دوسرے دن ہی ہمارے گلے کو پکڑ لیں گے۔“ اس بار ابو نے سخت لہجے میں کہا۔

”ابا! یہ سب کچھ پیار سے بھی ہو سکتا ہے۔ جو کام محبت سے ہو جائے اس کے لئے سختی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“ میں ان کی طرف دیکھنے لگا۔

”اچھا؟ وہی محبت جو تم کر رہے ہو؟ پوری پوری رات ایک دوسرے سے چمٹ چمٹ کر ایللی براؤن کب تک تمہارا دل بھرے گا اس عالیہ سے؟“ انہوں نے طنز کیا اور گھوڑا آگے بڑھالے گئے۔ میں خاموشی سے واپس آ کر کپاس کی چنائی کرنے لگا۔

”مسٹر ایللی براؤن کیا ہوا؟ بڑی جلدی ہار مان گئے ہو؟“ ساندرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”نہیں یار! مجھے بس ابو کی باتیں اچھی نہیں لگتی ہیں، وہ کبھی کبھی بہت غلط بات کر دیتے ہیں۔“ میں نے اپنے دوسری طرف عالیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے دھیان میں کپاس کی چنائی کر رہی تھی۔ وہ بالکل اس معاملے میں لا تعلق سی نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس نے ابو کی بات بھی سنی تھی اور اسے سمجھا بھی تھا لیکن وہ بے چاری تو احتجاج بھی نہیں کر سکتی تھی۔

”ایللی! ویسے عالیہ بڑی خوش قسمت ہے جو آپ جیسے خوبصورت اور سلجھے ہوئے نوجوان لڑکے کی منظور نظر بنی ہے۔ ورنہ ہماری قسمت میں تو ہمیشہ گندے بوڑھے اور جاہل ہی ہیں۔“ ساندرا نے ایک سرد آہ بھری تو میں غصے سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”ساندرا! تم بکواس کر رہی ہو۔ میں تو تمہیں بہت اچھی لڑکی سمجھتا تھا لیکن تم بھی باقیوں کی طرح ہی ہو جو ہمیشہ غلط ہی سوچتے ہیں۔ تم سب لوگ میرے کردار پر شک کر رہے ہو۔ کیا ایک مرد کا ایک عورت کے ساتھ صرف یہی ایک رشتہ ہوتا ہے؟ عورت ماں بہن ہوگی یا پھر بیوی معشوق۔۔۔ کیا اس کے علاوہ اور کوئی رشتہ نہیں ہوتا؟ میں عالیہ کے ساتھ رہتا ہوں تو اس کا یہ مطلب کہاں ہوتا ہے کہ میں غلط نظر سے اسے دیکھتا ہوں؟“ میں نے کپاس چھوڑی اور پیچھے جا کر بیٹھ گیا۔

عالیہ اور ساندرا دونوں نے مجھے واپس بلانے کے لئے آوازیں دیں لیکن میں نے ان سنی کر دیں اور پیچھے اپنے کپاس کے ڈھیر کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں پیچھے مجھے منانے کے لئے آنا چاہتی تھیں لیکن گھوڑے پر بیٹھے مسلح پہریدار نے انہیں روک دیا۔ وہ کپاس کی چنائی میں وقفہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں کوئی آدھے گھنٹے تک ادھر ہی بیٹھا رہا اور پھر اٹھنے کا ارادہ کیا۔ میں نے اپنا تھیلہ اسیدھا کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں واپس چنائی کے لئے جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ مجھے کھیت کے کنارے پر فلورین نظر آ گئی۔ وہ روزانہ ہی

اس وقت میرے پیچھے آ جاتی تھی۔ میں نے اسے دیکھ کر ہاتھ بلایا اور وہیں کھڑے ہو کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے بھی واپسی مسکرا کر مجھے جواب دیا اور میرے پاس آ گئی۔ میں اسے لیکر وہیں بیٹھ گیا۔

”کیا ہوا ایلی! کچھ اداس اداس سے لگ رہے ہو؟“ وہ منگیتر تھی میری، ہم دونوں بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے آئے تھے۔ فلورین میری ہلکی سے ہلکی بات بھی نوٹ کر لیتی تھی۔

”نہیں فلورین! ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں ویسے ہی ذرا تھک گیا تھا اس لئے ادھر آ کر بیٹھ گیا ہوں۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے پیار سے سہلانے لگا۔

”ایلی یار! اگر تھک گئے ہو تو مت کرونا! تم غلام تو نہیں ہو اور نہ ہی کوئی غریب لڑکے ہو۔ تم اس گاؤں بلکہ اس پورے علاقے کے سب سے بڑے زمیندار کے بیٹے ہو۔ تمہیں کیا ضرورت ہے ان فضول کے پنگلوں میں پڑنے کی؟ چلو گھر چلتے ہیں۔“ وہ مجھے گھر جانے کا کہنے لگی۔

”نہیں فلورین! میں اب یہاں آیا ہوں تو کچھ عرصہ لگا کر ہی جاؤں گا۔ مجھے ان سیاہ فام غلاموں کی نفسیات سمجھنی ہے۔“ میں نے انکار کر دیا۔

”چلو ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی ہے، ہم تو آپ سے محبت کرتے ہیں آپ کے غلام ہیں۔“ اس نے میرے کندھے پر اپنا سر ٹکا دیا۔

”فلورین! کیا تم بھی سمجھتی ہو کہ میں غلط لڑکا ہوں اور میرا ان غلام لڑکیوں کے ساتھ کوئی غلط چکر ہے؟“ میں نے سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں دانستہ عالیہ کا نام نہیں لینا چاہتا تھا اس لئے گھما پھرا کر بات کر رہا تھا۔

”ایلی! مجھے معلوم ہے کہ تم عالیہ کی بات کر رہے ہو۔ تمہاری اور عالیہ کی داستان پیچھے پورا گاؤں جانتا ہے۔ سب لوگ باتیں کرتے ہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ سچ نہیں ہے۔ عورت اپنے مرد کی آنکھ پہچان لیتی ہے اور میں تو تم سے محبت بھی کرتی ہوں اور تمہیں بچپن سے جانتی بھی ہوں۔ مجھے معلوم ہے میرا ایلی ایسا نہیں ہے۔“ میں نے اپنا سر اس کی گود میں رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

”ایلی! ساری دنیا جھوٹ بولتی ہے، میری محبت اتنی کمزور نہیں ہے۔“ وہ پیار سے میرے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ مجھے بہت سکون مل رہا تھا۔

خدا نے عورت کو شاید بنایا ہی اسی لئے ہے۔ مرد کو دنیا کے ہزاروں غم اور پریشانیاں ہوتی ہیں لیکن

عورت کی زلفوں کی چھاؤں ملتے ہی وہ اپنے سارے غم بھلا دیتا ہے۔ مجھے آرام کے لئے فیلی کی زلفوں کی چھاؤں ملی تو میں اپنی تھکاوٹ بھول گیا تھا۔ مجھے ہلکی ہلکی نیند آنے لگی تھی۔ نجانے کتنی دیر تک وہ ایسے ہی میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔ میری آنکھ پھر عالیہ کے آنے کی آہٹ سے کھلی۔ اس کی کپاس بھی میرے ساتھ ہی پڑی ہوئی تھی۔ اس کا تھیلا بھر گیا تھا اور وہ تھیلا خالی کرنے کے لئے آئی تھی۔ کپاس کے خشک پتوں پر اس کے پیر پڑے تو اس کی چڑچڑاہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے نیم کھلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ وہ خاموشی سے اپنا تھیلا خالی کرنے لگی۔

”عالیہ! ٹھیک ہونا؟“ میں نے ہلکی آواز میں کہا تو اس کے چلتے ہوئے ہاتھ رکھ گئے۔ وہ کچھ پل کے لئے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

”عالیہ! میں نے سوال کیا ہے؟“ میں نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

”جی! میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”اچھا! واقعی ٹھیک ہو؟ تم نے میری منگیت کو سلام بھی نہیں کیا ہے؟“ میں نے نارمل لہجے میں کہا۔

”اوہ! میں آپ کے آرام کی وجہ سے نہیں بول رہی تھی۔ فیلی میم! آپ کیسی ہیں؟“ اس نے فلورین

سے اس کا حال پوچھا۔

وہ بھی میری طرح فلورین کو فیلی ہی کہتی تھی۔ فلورین بھی میری طرح نرم دل اور پیار کرنے والی لڑکی تھی۔ وہ کبھی بھی کسی بھی غلام سے سخت لہجے میں بات نہیں کرتی تھی۔ اسے میری طبیعت اور نیچر کا پیہ تھا اور وہ بالکل میری طرح ہی بنتی تھی۔ وہ کوئی بھی ایسا کام نہیں کرتی تھی جو مجھے پسند نہ ہو۔ محبت اسی کو کہتے ہیں۔ عورت کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ وہ اپنے محبوب کے لئے مکمل طور پر بھی بدلنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ خدا نے عورت کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے۔ عالیہ فلورین سے اس کا حال پوچھنے لگی اور پھر اجازت لیکر واپس کام پر چلی گئی۔ ہم دونوں کچھ دیر تک ایسے ہی بیٹھے رہے۔ اس کے بعد میں نے فیلی کو واپس جانے کا کہا اور خود واپس کام پر آ گیا۔

”سوری ایلی! مجھ سے غلطی ہو گئی تھی، میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔“ ساندہ نے مجھے واپس آتے

دیکھا تو فوراً معافی مانگنے لگی۔ اس نے میرے اور عالیہ کے بارے میں غلط بات کی تھی اور میں اسی وجہ سے ناراض ہو کر واپس چلا گیا تھا۔

”کوئی بات نہیں ہے ساندراہ! تم بہت اچھی لڑکی ہو۔“ میرا غصہ ختم ہو چکا تھا اس لئے میں نے صاف دل سے اسے معاف کرتے ہوئے کہا۔

”ویسے ساندراہ! تم بہت معصوم اور شرارتی لڑکی ہو۔ ایسے منہ بنا کر کام کرتے ہوئے بہت بری لگ رہی ہو۔ خوش رہا کرو اچھی لگتی ہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”اچھا! آپ کی نظر بڑی گہری ہے، کہاں تک دیکھ لیتے ہو؟“ اس نے واپس میری طرف دیکھا۔
 ”ویسے ہی کہہ رہا ہوں یار! تم مسکراتے ہوئے اچھی لگتی ہو اس لئے مسکراتی رہا کرو۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔

”واہ! اس کا مطلب ہے کہ آپ کا کسی کے ساتھ کوئی چکر نہیں ہے اور ہمارا چانس بن سکتا ہے؟“ اس نے شرارت سے ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا۔ میری دوسری طرف کھڑی عالیہ بھی اس کی بات سن کر مسکرانے لگی۔ وہ ساندراہ کی بات سمجھ گئی تھی۔

”اچھا! ویسے کوشش کر کے دیکھ لینا، ناکام ہی رہو گی۔ یہ ایلی اپنی مٹگیتر سے بڑی محبت کرتا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا اور چٹائی کرنے لگا۔

شام کو واپسی ڈیرے پر آیا تو مجھے سامنے ہی تالاب کے کنارے رات والے پانچوں غلام درخت کے ساتھ الٹے لٹکتے ہوئے نظر آ گئے۔ وہ تین مرد اور دو عورتیں تھیں۔ سبھی نے سرف ایک انڈر ویئر پہنا ہوا تھا جبکہ ان کا اوپری جسم نکا تھا۔ ان کی پشت کوڑوں سے چھلنی ہو چکی تھی اور خون رس رس کر نیچے زمین پر پھیلا ہوا تھا۔ وہ دوپہر سے ایسے ہی الٹے لٹکے ہوئے تھے۔ خون رسا بند ہو چکا تھا لیکن وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھے۔ میں نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا اور سٹور روم کی طرف بڑھ گیا۔ کپاس کا وزن مکمل ہوا تو ابانے کم وزن والے غلام الگ کر لئے۔ میں بھی خاموشی سے ان غلاموں کے ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا۔

”ایلی! یہ کیا بات ہے تم وہاں کیوں کھڑے ہو رہے ہو؟“ انھوں نے غصے سے کہا۔
 ”ابا! میری کپاس ان سب سے کم ہے اس لئے میں بھی آج ان کے ساتھ سزاولوں گا۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”ایلی! یہاں ڈیرے پر درجنوں سفید فام ملازم بھی کام کرتے ہیں۔ وہ بھی چٹائی کرتے ہیں اور میں انہیں چٹائی کے حساب سے پیسے دیتا ہوں۔ جتنا وزن اتنے پیسے، تم فری میں کام کر رہے ہو۔ ہم لوگ کسی بھی

سفید فام کوسز انہیں دے سکتے اور تم غلام بھی نہیں ہو۔“ ابو نے قدرے دھیمے لہجے میں کہا۔

”ابا! میں ان غلاموں کے ساتھ غلام بن کر رہنا چاہتا ہوں۔ میں بھی ان کا درد محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ جب ان کو کم چنائی پر سزا ملے گی تو پھر میں بھی اس سزا کا حق دار ہوں۔“ ابو کا قدرے دھیمہ لہجہ مجھے ہمت دے رہا تھا۔

”ایلی! تم اب میرے کام میں دخل اندازی کر رہے ہو۔ میں نے تمہیں ان غلاموں کے ساتھ کام کرنے کی اجازت دی تھی اس لئے خاموشی سے اپنا کام کرو اور ہمیں بھی اپنا کام کرنے دو۔ ورنہ تم میرے غصے کو بہت اچھی طرح جانتے ہو۔ میں سب سے پہلی گولی اس عالیہ کے سر میں ماروں گا اور دوسری گولی تمہاری ٹانگ میں۔۔۔ اس کے بعد تم سے پوچھوں گا۔ میرے پاس سینکڑوں ایکڑ زمینیں اور غلام ہیں۔ ہم ایک لنگڑے بیٹے کو ساری زندگی بستر پر بٹھا کر کھلا سکتے ہیں۔“ ابو کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ وہ اس بار بھی دھیمے لہجے میں بولے تھے لیکن ان کا ٹھوس لہجہ مجھے بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔ میں نیچے زمین کی طرف دیکھنے لگا، میں اپنی جگہ سے ہلا نہیں تھا۔ میں ان سے مزید کچھ سننا چاہتا تھا۔ آخر میں بھی انہی کا بیٹا تھا، اتنی جلدی ہار ماننے والا کہاں تھا۔ وہ کافی دیر تک میری طرف غصے سے دیکھتے رہے۔

”ٹھیک ہے، صرف آج کی رات تمہیں بغیر کھائے پئے باہر زنجیر سے باندھ کر رکھا جائے گا۔ اس کے بعد پھر تم ضد نہیں کرو گے اور ایک اور بات، کوئی کوڑے نہیں ہوں گے۔ کوڑے کا زخم تو تین چار دن تک ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کا داغ ساری زندگی نہیں جاتا۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارا جسم ساری زندگی ان داغوں سے بھرا رہے۔“ ابو نے فیصلہ کن انداز سے کہا اور سٹور روم سے باہر نکل گئے۔

وہ باہر جا کر ایک پہریدار سے بات کرنے لگے۔ اس پہریدار نے رات کو ڈیوٹی کرنی تھی۔ سٹور روم سے فارغ ہونے کے بعد عالیہ، ساندہ اور باقی غلام تو کپڑے وغیرہ تبدیل کرنے کے لئے کمروں میں چلے گئے جبکہ میں اور میرے ساتھ باقی سزا یافتہ غلام باہر صحن میں آ گئے۔ پہریداروں نے پانچوں رات والے غلاموں کو نیچے اتارا اور زنجیروں سے ہمیں باندھ دیا گیا۔ ہم سب کو الگ الگ کر کے باندھا گیا تھا۔ ہمیں صبح والے غلاموں کی طرح الٹا نہیں لٹکایا گیا تھا بلکہ صرف درختوں کے ساتھ زنجیروں سے باندھا گیا تھا۔ رات کو کافی سردی ہو جاتی تھی۔ اندر کمروں میں تو بستر بھی موجود تھے اور ان کو زیادہ لوگوں کی وجہ سے سردی محسوس بھی نہیں ہوتی تھی۔ جبکہ یہاں بہت سردی تھی اور ہمیں اوڑھنے کے لئے کچھ بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ یہ سزا تھی جو

روزانہ دی جاتی تھی۔ آج میں بھی ان میں شامل ہو گیا تھا۔

رات کے بارہ بجے تک تو وقت جیسے تیسے کر کے گزر گیا، اس کے بعد سردی کا نزول شروع ہو گیا۔ میں نے کبھی بھی اتنی سردی برداشت نہیں کی تھی۔ آج پہلی بار سردی لگی تو میں کپکپانے لگا۔ ذرا سی دیر میں ہی سردی میری ہڈیوں میں اتر چکی تھی۔ نیند کب کی ختم ہو چکی تھی۔ اس قدر سردی میں نیند تو آ ہی نہیں سکتی تھی۔ میں نے اپنی ٹانگیں سمیٹ لی تھیں اور اکٹھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ میں سردی کے احساس کو ختم کرنا چاہتا تھا لیکن سردی مسلسل محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے پچھلی رات یاد آ گئی جب میں عالیہ کے ساتھ لیٹ کر سویا ہوا تھا۔ میں اس کے سینے پر سر رکھ کر سویا تھا۔ مجھے آج پہلی بار فلورین کی بجائے عالیہ یاد آ رہی تھی۔ مجھے عالیہ کے جسم کی خوشبو یاد آ رہی تھی اور میں اسی خوشبو کے سہارے اپنے آپ کو سردی سے بچا رہا تھا۔

”ایلی سر! آپ کے والد نے ہمیں بستر کا کہا تھا۔ آپ کو سردی لگ رہی ہے اس لئے لے لیجئے۔“
پہریدار نے میری طرف ایک کمبل بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ اس کی آواز سن کر میں نے آنکھیں کھولیں اور اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کمبل کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے بہت سردی لگ رہی تھی۔ میں سردی سے کپکپا رہا تھا لیکن پھر بھی میں اس کمبل کو نہیں لے سکتا تھا۔ میں باقی غلاموں کی طرح رہنا چاہتا تھا۔

”نہیں بھائی! آپ کمبل لے جاؤ، مجھے نہیں چاہیے۔“ میں نے انکار کر دیا۔

”ٹھیک ہے سر! آپ کی مرضی ہے۔ آپ کے والد نے ہمیں دینے کے لئے کہا تھا اس لئے آپ کے پاس ہی رکھ رہے ہیں۔ جب سردی لگے تو لے لیجئے گا۔“ اس نے ادھر ہی کمبل رکھ دیا اور واپس چلا گیا۔

”آپ کمبل لے لو، آپ کو بھی سردی لگ رہی ہوگی۔“ میں نے دوسری طرف بندھے ہوئے ایک ادھیڑ عمر غلام سے کہا لیکن اس نے فوراً انکار کر دیا۔ انہیں دن والے واقعہ کا علم تھا۔ ابو نے صرف ایک بریڈ کھانے کے جرم میں رات والے غلاموں کو پورا دن الٹا لٹکا یا تھا اور مار مار کر ان کی چڑی بھی ادھیڑ کر رکھ دی تھی۔ وہ کبھی بھی مجھ سے وہ کمبل نہیں لے سکتے تھے۔ انہیں میرے والد کے غصے کا پتہ تھا۔ میں نے دوسرے غلام سے پوچھا تو اس نے بھی انکار کر دیا۔ میں نے کمبل کو ایک سائیڈ پر کیا اور دوبارہ سکڑ کر بیٹھ گیا۔ رات ایسے ہی سکڑتے سہمتے اور سردی سے ٹھہرتے ہوئے گزاردی۔ صبح تک مجھے بخار ہو چکا تھا۔ جب پہریدار صبح مجھے کھولنے آئے تو مجھ سے اپنی پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ انہوں نے مجھے اٹھا کر اندر کمرے میں

بستر میں ڈالا اور مجھے کھبل اوڑھا دیا۔

”کیا ہوا بلی! بخار ہو گیا ہے؟“ عالیہ نے مجھے بے سدھ پڑے دیکھا تو میرے ماتھے پر ہاتھ لگا کر پوچھنے لگی۔

”ہاں یار! سردی لگ گئی ہے۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”اوہ واقعی! تمہارا ماتھا تو بخار سے تب رہا ہے۔“ اس نے تشویش ناک انداز میں کہا۔

”کوئی بات نہیں! تھوڑی دیر آرام کر لوں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔“ میں نے جواب دیا۔ مجھے اس کا اپنے لئے فکر مند ہونا اچھا لگ رہا تھا۔

”اچھا! میں کچن میں دودھ اور انڈوں کا کھہہ دیتی ہوں، تم وہ پی لینا ٹھیک ہو جاؤ گے۔ اور پلیز! کام پر مت آنا، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور اتنے بخار میں تم کام بھی نہیں کر سکو گے۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ واپس مڑنے لگی لیکن میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”کچھ چاہیے اب؟“ اس نے سوال کیا۔

”آج مت جاؤ عالیہ! مجھے تمہاری ضرورت ہے۔“ میں نے کمزور آواز میں کہا۔

”یار! مجھے تو کام پر جانا ہوگا، ویسے ایک پہریدار تمہارے گھر چلا گیا ہے۔ تھوڑی دیر تک تمہارے بہن یا بھائیوں میں سے کوئی آجائے گا اور پھر فیملی بھی آجائے گی۔ میری یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ عالیہ نے تفصیلاً بتایا۔ وہ اب بھی میری طرف سے فکر مند تھی۔ وہ یہاں میرے پاس رکنا چاہتی تھی لیکن وہ چاہ کر بھی رک نہیں سکتی تھی۔

”پھر بھی عالیہ! تم رک جاؤ۔۔۔ از بیلا کے آنے تک تم ادھر ہی میرے پاس ہی رہو، مجھے حوصلہ رہے گا۔ ان کے آنے کے بعد بے شک تم چلی جانا۔“ میں نے اسے رکنے کا کہا تو وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی اور پھر حامی بھر لی۔

”ٹھیک ہے، میں رک جاتی ہوں۔ تمہاری بہن از بیلا آجائے گی تو پھر میں چلی جاؤں گی۔“

”میرے باپ سے تو نہیں ڈر رہی ہو؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ میں نے پرسوں رات کچھ غلاموں سے ہمدردی دکھائی تھی تو ابونے ان کو انتہائی ظالمانہ سزا دی تھی۔ ابو ایسے ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر انتہائی سخت سزائیں دیتے تھے۔ وہ ابو کی اجازت کی بغیر یہاں رکتی تو ابو اسے بھی سزا دے

سکتے تھے۔

”ایلی سرجی! آپ نے ابھی تک عالیہ کو پہچانا ہی نہیں ہے۔ میری رگوں میں ہندوستانی خون ہے۔ کبھی موقع ملے تو آپ کو اس خون کا جوش بھی دکھاؤں گی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور باہر کی طرف جانے لگی۔

”اب کہاں جا رہی ہو؟“ میں نے اسے پیچھے سے آواز دی۔

”کچن میں جا رہی ہوں، تمہارے لئے دودھ اور انڈے لے کر آتی ہوں۔“ اس نے پیچھے مڑے بغیر کہا اور باہر نکل گئی۔ آدھے گھنٹے تک وہ دودھ کے ایک بڑے پیالے اور کچھ انڈوں کے ساتھ آگئی۔ اس نے انڈے چھیلے ہوئے تھے۔ میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے انڈوں والی پلیٹ بستر پر میرے سامنے رکھی اور مجھے انڈے پکڑانے لگی۔ میں نے دو انڈے بھی پورے نہیں کھائے اور میری بس ہو گئی۔ میں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

”ایلی! دو تین انڈے اور کھالو، تمہیں سردی لگی ہے۔“ اس نے ایک انڈا پکڑ کر میرے منہ کی طرف بڑھایا تو نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اسے کھالیا اور کے بعد ہاتھ کھڑے کر دیئے۔

”بس عالیہ! مجھ سے اور نہیں کھایا جائے گا۔“ وہ چوتھا انڈا اٹھا رہی تھی لیکن میں نے منع کر دیا۔

”ایک اور کھا لیتے؟“ اس نے میری طرف دیکھا لیکن میں نے انکار کر دیا۔

”ٹھیک ہے، پھر دودھ پی لو اور اس کے بعد دو انڈے مزید کھالینا! شام تک ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ اس نے پلیٹ نیچے رکھی اور دودھ کا پیالہ پکڑ کر میرے منہ سے لگا دیا۔

”ارے! میں ٹھیک ہوں، میں خود ہی پی لوں گا۔“ میں نے اس کے ہاتھ سے پکڑ کر پیالہ لے لیا۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے میرے ہاتھوں کے نیچے اپنے ہاتھ رکھے ہوئے تھے جس سے پیالے کا ارتعاش تھوڑا کم ہو گیا تھا۔

”ایلی! آپ دودھ نیچے بستر پر گرا دو گے۔“ اس نے میرے ہاتھ سے پیالہ لے لیا اور اسے میرے ہونٹوں سے لگانے لگی۔

”یار! میں کوشش کرتا ہوں۔“ میں نے پھر ہاتھ آگے بڑھائے۔

”نہیں ایلی! دودھ گر گیا تو بستر گندہ ہو جائے گا اور پھر آنے والی ساری سردیاں اسی گندے بستر کے

ساتھ گزارنی پڑیں گی۔ ہمارے پاس کوئی دوسرا فالتو بستر بھی نہیں ہوتا۔“ اس نے طنز کرتے ہوئے کہا۔
ابو سارے سیاہ فام غلاموں کو ایک ایک بستر ہی دیتے تھے جنہیں وہ گرمیوں میں ایک بار دھو لیتے تھے اور پھر آگے پوری سردیاں وہی بستر ملتا تھا۔ سردیوں میں کمبل ایک ایک ہفتے تک بھی خشک نہیں ہوتا تھا۔
دودھ والا کمبل ہمارے حصے میں نہ آتا لیکن کسی نہ کسی غلام کے حصے میں تو ضرور آتا تھا۔ عالیہ اسی غلام کے بارے میں فکر مند ہو کر مجھے دودھ پکڑنے سے منع کر رہی تھی۔ تاکہ میں اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ سے کہیں دودھ نہ گرا دوں۔ میں خاموشی سے اس کے ہاتھ سے دودھ پینے لگا۔ تھوڑی دیر تک ازبیلہ بھی آگئی۔ ازبیلہ اکیلی نہیں آئی تھی بلکہ اس کے ساتھ امی، دونوں بھابیاں اور فیلی بھی آگئی تھی۔ میرے بخار کی خبر گھر پہنچی تو پورا گھر ہی ڈیرے پر آ گیا تھا۔

”ایلی کیا ہوا ہے میرے بچے؟“ امی نے جلدی سے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ عالیہ ان کو دیکھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے ابھی دودھ ختم نہیں کیا تھا۔ وہ بیالہ لیکر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔
”امی! میں ٹھیک ہوں، بس تھوڑا سا بخار ہو گیا تھا۔“ میں نے ان کو تسلی دی۔
”اچھا! یہ تھوڑا سا بخار ہے؟ تمہارا تو پورا جسم ہی بخار سے تپ رہا ہے؟“ ازبیلہ بھی امی کے ساتھ ہی نیچے بیٹھ گئی تھی۔ وہ بھی میرے ماتھے اور چہرے پر ہاتھ لگا کر چیک کر رہی تھی۔
”ایلی! چلو اٹھو، تمہارے ابو آنے والے ہیں۔ وہ بیل گاڑی تیار کر لیں گے اور تمہیں اس میں ڈال کر لے چلتے ہیں۔“ امی نے مجھے اٹھنے کا کہا۔

”جی بھائی! اب بس کرو، بہت دیکھ لیا تم نے غلامی کا رہن سہن۔۔۔ بس اب گھر چلو!“ میری بہن ازبیلہ بھی زور لگانے لگی۔

”نہیں امی! میں گھر نہیں جاؤں گا، مجھے کچھ اور دن یہاں رہنا ہے۔“ میں نے ان کو انکار کر دیا۔
”کیا ہوا ہمارے ایلی کو؟“ مجھے ابو کی آواز آئی۔ وہ بھی گھر والوں کے پیچھے پیچھے آگئے تھے۔
”کچھ نہیں ابا! بس ویسے ہی تھوڑی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔“ میں ان کو دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

”چلو کوئی بات نہیں، اب گھر چلو! ایک دو دن آرام کرو گے تو ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ابا! میں گھر نہیں جانا چاہتا، مجھے ابھی مزید یہاں رہنا ہے۔“ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”کیا۔۔؟ کیا کہہ رہے ہو؟ تم بیمار ہو اور تمہیں بخار ہے۔ یہاں رہو گے تو طبیعت مزید خراب ہو جائے گی۔“ ابا کے بولنے سے پہلے ہی امی مجھے سمجھانے لگی۔

”امی! میں بچہ نہیں ہوں، بڑا ہو گیا ہوں اور یہ چھوٹا موٹا بخار مجھے کچھ نہیں کہے گا۔“ میں نے جواب

دیا۔

”یار! تم کس مٹی کے بنے ہو؟ تمہارے باقی بھائی بھی تو ہیں۔۔۔ دیکھ لو وہ کس قدر اچھے ہیں، بالکل مجھ پر گئے ہیں۔۔۔ تم پتہ نہیں کس پر چلے گئے ہو؟“ ابا کو ایک بار پھر غصہ آنے لگا تھا۔

”ابا! میں بھی آپ پر ہی گیا ہوں۔ غصہ مجھے بھی آتا ہے بس ایک فرق ہے کہ آپ کو غصہ ہمیشہ اپنے سے کمزور غلاموں پر آتا ہے جبکہ میں کبھی کمزور پر غصہ نہیں نکالتا۔ ابا! بہادر وہ ہوتا ہے جو اپنے سے بڑے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرے۔ کمزوروں پر ظلم کرنے والا بہادر نہیں بزدل ہوتا ہے اور میں بزدل نہیں ہوں۔“ میں نے ان کو وہیں کمرے میں چھوڑا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

عالیہ باہر کھڑی کھیتوں میں جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ میں نے اسے دو منٹ انتظار کرنے کا کہا اور خود بھی تیار ہو کر اس کے ساتھ کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ میرا بخار اترا نہیں تھا۔ میں کوئی گھنٹا بھر چنائی کرتا رہا اور پھر بخار کی شدت تیز ہوئی تو وہیں کھیتوں میں ہی لیٹ گیا۔ شام تک بخار کی شدت بہت تیز ہو گئی تھی۔ میں نیل گاڑی میں لیٹ کر واپس ڈیرے پر آیا اور کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ ابو اور بھائی پتہ کرنے آئے، وہ مجھے گھر جانے کا کہتے رہے لیکن میں انکار کرتا رہا۔ انہوں نے مجھے دوسرے دن کام پر نہ جانے کا کہا اور عالیہ کو میرے پاس بھیج دیا۔ انہوں نے عالیہ کو بھی کام پر جانے کی بجائے میری تیمارداری کے لئے ڈیرے پر ہی رکنے کا کہہ دیا تھا۔ دودھ اور انڈے اس وقت گرم کئے جاتے تھے۔ عالیہ دودھ، انڈے اور روٹی لیکر آ گئی۔ میرا کانا کھانے کو بالکل دل نہیں کر رہا تھا لیکن اس نے زبردستی ضد کر کے مجھے ایک بریڈ اور انڈے کھلائے اور بعد میں دو پیالے دودھ بھی پلا دیا۔

”بہت شکریہ عالیہ! میں ٹھیک ہوں۔۔۔ تم بھی کچھ کھا لو، صبح سے کام کر رہی ہو۔“ گرم دودھ پینے سے میری طبیعت کچھ ٹھیک ہوئی تھی اس لئے میں نے عالیہ کو کانا کھانے کا کہا۔ وہ میرا سر دبا رہی تھی۔

”کوئی بات نہیں ایل! مجھے ابھی بھوک نہیں لگی ہوئی ہے۔ تم سونے کی کوشش کرو میں دس پندرہ منٹ

تک تمہارا سر دباؤں گی اور پھر باقی لوگ بھی آجائیں تو پھر کھانا بھی کھالوں گی۔“ عالیہ بدستور میرا سر دباتی رہی۔

مجھے اس کے نرم ہاتھوں کا لمس بہت سکون دے رہا تھا اس لئے میں نے بھی زیادہ زور نہیں دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ سکون کا دوسرا نام نیند ہوتی ہے۔ جیسے ہی انسان کو سکون محسوس ہوتا ہے اس کی آنکھیں خود بخود ہی بند ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اگلے دس منٹ تک میں عالیہ کی گود میں سر رکھے سوچا تھا۔ عالیہ نے آہستگی سے میرا سر نیچے تکیے پر رکھا اور باہر چلی گئی۔ وہ باہر سے کھانا کھا کر ایک بار پھر میرے سر ہانے کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ میں ان سب چیزوں سے بے خبر سو رہا تھا۔ ابو اور بھائی گھر جانے سے پہلے ایک بار کمرے میں آئے لیکن مجھے سوتا ہوا دیکھ کر وہ مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔ ابو نے عالیہ کو دوسرے دن چھٹی کرنے کا کہہ دیا تھا۔ انھوں نے ایک بار پھر عالیہ کو تاکید کی وہ مجھے کل کام پر نہ جانے دے اور اس کے بعد گاؤں چلے گئے۔

رات کے پچھلے پہر مجھے شدید پیاس محسوس ہوئی تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ عالیہ میرے قریب ہی سو رہی تھی۔ چاند کی ہلکی ہلکی روشنی اندر کمرے میں آرہی تھی۔ اندر کمرے میں کوئی پچاس سے زائد غلام سو رہے تھے اس لئے باہر سردی ہونے کے باوجود اندر کافی گرم ماحول تھا۔ عالیہ بالکل سیدھی چھت کی طرف منہ کر کے سو رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ سینے پر تھا جبکہ دوسرا نیچے پہلو کے ساتھ تھا۔ اس کا معصوم سا چہرہ چاند کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ سنہری بالوں کی ایک لٹ اس کے چہرے کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن ناکام ہو رہی تھی۔ میری نظر اس کے چہرے پر پڑی تو پھر میں اپنی نظر کو ہٹانا ہی بھول گیا۔ رات کے پچھلے پہر عالیہ کا حسن ایک سحر کی طرح سیدھا میرے دل میں اتر رہا تھا۔ میں پیاس کی شدت سے اٹھا تھا لیکن اب مجھے پیاس کا احساس تک نہیں تھا۔ میں جیسے جیسے اس کی طرف دیکھ رہا تھا ویسے ویسے اس کے سحر میں کھوتا جا رہا تھا۔ پیہ نہیں کتنی دیر تک میں ایسے ہی مدہوش اسے دیکھتا رہا۔ میری نظروں کی تپش نے بہت جلد ہی عالیہ کو جگا دیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور مجھے اپنی طرف دیکھتا ہوا پا کر مسکرانے لگی۔

”ایلی! کیا ہو گیا ہے، نیند نہیں آرہی ہے؟“ اس نے سوال کیا۔

”عالیہ! تم بہت خوبصورت ہو۔۔۔ بہت زیادہ خوبصورت۔“ میری نظریں اس کے چہرے پر جمی

ہوئی تھیں۔

”اچھا! اب بناؤ مت، مجھے پتہ ہے کہ میں کتنی خوبصورت ہوں۔ سو جاؤ! رات کافی ہو گئی ہے۔“ اس نے تھوڑا کھسک کر جگہ بنائی اور میں اس کے ساتھ ہی لیٹ گیا۔

میں نے اپنا سر اس کے سینے پر رکھا تو وہ نرمی سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ مجھے ایک بار پھر نیند آنے لگی۔ وہ واقعی بالکل کسی ساحرہ کی طرح تھی۔ اس قربت میں ایک عجیب سا نشہ تھا جو مدہوش کر دیتا تھا۔ میں اس بار سو یا تو پھر دوبارہ میری آنکھ صبح ہی کھلی۔ صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔ سب لوگ کام پر جا چکے تھے اور اس وقت صرف میں اور عالیہ ہی لیٹے ہوئے تھے۔ عالیہ جاگ رہی تھی، اس نے اٹھنے کے لئے میرا اپنے سینے سے ہٹایا تو میری آنکھ بھی کھل گئی تھی۔

”ایلی! اٹھ جاؤ، صبح ہو گئی ہے۔ میں تمہارے لئے انڈے اور دودھ گرم کر کے لاتی ہوں۔“ اس نے مجھے آنکھ کھولتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگی۔

”نہیں عالیہ! مجھے بالکل بھوک نہیں ہے، میں ابھی اور سونا چاہتا ہوں۔“ میں نے سردوبارہ اس کے سینے پر رکھ لیا۔

”ایلی! دن کافی اوپر آ گیا ہے اور اس وقت سونا اچھی بات نہیں ہے۔“ وہ پھر میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

”کچھ نہیں ہوتا عالیہ! صرف کچھ دیر اور لیٹی رہو، آج کونسا کام پر جانا ہے؟“ میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

”ایلی! تمہارے والد اور بھائی آتے ہی ہوں گے۔۔۔ انہیں اچھا نہیں لگے گا۔“ اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ مجھے اس کی بات کی سمجھ آ گئی تھی۔ ابو اور بھائی پہلے ہی مجھے عالیہ کے ساتھ منسوب کرتے رہتے تھے۔ وہ اگر مجھے ایسے لیٹے ہوئے دیکھتے تو پھر غلط سمجھ سکتے تھے۔ میں نے پہلو بدلے اور اپنے بستر پر آ گیا۔

”عالیہ! تمہارے ساتھ واقعی زیادتی ہو رہی ہے۔ یہ غلامی کی زندگی ہے عالیہ! یہ تمہاری زندگی نہیں ہے۔ تم تو شہزادی ہو، ہندوستان کی شہزادی۔۔۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی تو میں نے اس کی کلائی پکڑ لی اور خود بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”ایلی صاحب! شہزادیاں کبھی غلام نہیں ہوتیں اور میں تو ہندوستان میں بھی غلام تھی اور اب یہاں

امریکہ میں بھی غلام ہوں۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔
 ”عالیہ! خوبصورتی صرف گورے رنگ میں ہی نہیں ہوتی، یہ سانولے رنگ میں بھی ہوتی ہے اور تمہیں
 خدا نے بہت خوبصورت بنایا ہے۔“ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کے چہرے کو چھوتے ہوئے کہا۔

میرے ہاتھ کی انگلیاں اس کے نرم و ملائم گالوں میں جیسے پیوست ہو رہی تھیں۔ وہ میرے سامنے
 بالکل ساکت کھڑی تھی۔ میں نے اس کی کلائی کو چھوڑا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے سے نزدیک
 کر لیا۔ اس کی نظریں جھک گئیں تھیں اور وہ نیچے زمین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے آہستگی سے اس کا چہرہ
 اوپر اٹھایا اور اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ میں اس کے ہونٹوں کی مٹھاس کو اپنے اندر اتارنے
 لگا۔ میں امریکہ کے آزاد معاشرے میں پیدا ہوا تھا لیکن پھر بھی میں اپنی منگیتر فلورین سے محبت کرتا تھا اور
 میں نے فلورین کے علاوہ اور کسی بھی لڑکی کو اس نظر سے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں
 ہزاروں بار فلورین کو کس کیا تھا۔ میں صرف اپنی منگیتر فلورین کے ہونٹوں کی لذت سے آشنا تھا۔ عالیہ دوسری
 لڑکی تھی جس نے مجھے اس حد تک متاثر کر دیا تھا۔ عالیہ کے ہونٹوں کی مٹھاس فلورین کے ہونٹوں سے زیادہ
 تھی۔ ان میں زیادہ نشہ تھا اور میں اس نشے میں مدھوش ہونے لگا تھا۔

”ایلی! اگر آپ کو کچھ کرنا ہے تو سنو روم چلے جاتے ہیں؟ یہاں کوئی آجائے گا۔“ میں اس کے ہونٹوں
 کو چھوڑ کر نیچے گردن تک آ گیا تھا جب مجھے اس کی لرزت ہوئی آواز آئی۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ میں
 نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں دکھ اور درد کی پرچھائیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں
 سے بھری ہوئی تھیں۔

”کیا؟ کیا کہہ رہی ہو تم؟“ میں ایک جھٹکے سے اس سے الگ ہو گیا۔ وہ میرے سامنے کھڑی خاموش
 کانپ رہی تھی۔

”عالیہ! تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ میں نے غصے سے قدرے اونچی آواز میں کہا۔
 ”معلوم ہے اور ٹھیک کہہ رہی ہوں۔۔۔ آج نہیں تو کل ہونا تو یہی ہے نا؟ تو پھر آج ہی سہی، کیا فرق
 پڑتا ہے؟“ عالیہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”کیا بکواس کر رہی ہو؟ تمہیں معلوم ہے کہ میں ایسا لڑکا نہیں ہوں؟“ مجھے اس کی بات سن کر غصہ آ

گیا۔

”ایلی صاحب! میں ایک سیاہ فام لونڈی ہوں۔ تم نے مجھے پیسے دے کر خریدا ہے اور یہ قیمت آج نہیں توکل میں نے اپنے جسم سے پوری کرنی ہے۔ ایلی صاحب! مجھے میری حیثیت کا پتہ ہے۔“ وہ ایک بار بولنا شروع ہوئی تو مسلسل بولتی ہی چلی گئی۔

”عالیہ! میں ایسا نہیں ہوں، تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔ میں کسی کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتا۔“ میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ میری آواز میں ابھی تک غصہ موجود تھا۔

”کیا فرق پڑتا ہے؟ غرض تو سب کو جسم سے ہے نا؟ کوئی غصے اور مار سے وصول کرتا ہے اور کوئی دوستی اور محبت دکھا کر۔۔۔ چلو آپ بھی کچھ پل کا مزالو اور گھر جاؤ! عالیہ جیسی لڑکیاں تو اب آپ کی زندگی میں آتی جاتی رہیں گی۔“ اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور باہر کی طرف جھٹکا دیا۔ میں نے اپنا بازو اس سے چھڑوایا اور ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا۔

”عالیہ! میں تمہیں ایک شریف اور اچھی لڑکی سمجھ رہا تھا لیکن تم سے زیادہ بے غیرت اور گھٹیا لڑکی میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی۔“ میرے تھپڑ کے زور سے وہ دیوار کے ساتھ جا کر لگی تھی۔

”واہ! کیا بات ہے میرے شہزادے کی۔۔۔ آج پتہ لگا ہے کہ تم میرا ہی خون ہو۔“ میرے والد اسی وقت کمرے میں داخل ہوئے تھے اور انہوں نے مجھے تھپڑ مارتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

”ایلسن براؤن! آج تم نے براؤن فیملی کا خون دکھایا ہے۔“ انہوں نے مجھے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

”ابا! کیا ایک عورت اور مرد کے درمیان لازمی کوئی نہ کوئی رشتہ ہونا چاہیے؟ عورت ماں، بہن اور بیوی نہ ہو تو کیا لازمی ہے کہ اس کے ساتھ اب غلط تعلق ہی ہوگا؟ کیا وہ دوست نہیں ہو سکتی؟“ میں نے اپنے والد سے سوال کیا۔

”بیٹا! مرد اور عورت اچھے دوست ہو سکتے ہیں لیکن آقا اور غلام کبھی دوست نہیں ہوتے۔ تم مالک ہو اور اس لڑکی پر تمہارا پورا اختیار ہے۔“ وہ مجھے سمجھانے لگے۔

”ابا! مجھے مالک نہیں دوست بننا تھا، میں صرف دوست بننا چاہتا ہوں اور بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔“ میں نے ٹھنڈے لہجے میں کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر نکل کر میں رکا نہیں اور سیدھا کھیتوں میں چلا گیا اور کپاس کی چنائی کرنے لگا۔ میرے جانے کے آدھے گھنٹے بعد ہی عالیہ بھی آگئی اور خاموشی سے

وہ بھی چنائی کرنے لگی۔

”ایلی! لگتا ہے آپ مجھ سے ناراض ہیں؟“ عالیہ کافی دیر تک مجھے بلانے کی کوشش کرتی رہی لیکن میں نے کوئی بھی جواب نہ دیا۔

”ایلی سوری یار! مجھ سے غلطی ہو گئی تھی، میں معافی مانگتی ہوں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان پکڑتے ہوئے کہا۔ میں نے سارا دن اس سے ناراضگی میں گزارا تھا۔ عالیہ کے ساتھ ساتھ ساندراہ بھی منانے کی کوشش کرتی رہی لیکن میں چپ ہو کر چنائی کرتا رہا۔

شام کو خلاف معمول میری کپاس 70 کلو سے زائد نکلی تھی۔ میں نے کبھی تیس کلو سے اوپر چنائی نہیں کی تھی لیکن آج 70 کلو سے زائد چنائی کر گیا تھا۔ یہ سارا غصہ تھا جو میں نے کپاس پر نکالا تھا۔ ابو نے خوش ہو کر مجھے گلے لگا لیا تھا۔ وہ باقاعدہ جشن منا رہے تھے کہ آج ان کا بیٹا صحیح معنوں میں ایک زمیندار بن گیا تھا۔ میں نے ابو سے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کیا اور کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ میرے پیچھے پیچھے عالیہ بھی کمرے میں آ گئی۔

”ایلی! آج کھانا نہیں کھاؤ گے؟“ اس نے مجھے بستر پر لیٹتے ہوئے دیکھا تو کھانے کا پوچھنے لگی۔

”مجھے بھوک نہیں ہے، تم جاؤ یہاں سے!“ میں نے غصے سے کہا اور منہ پھیر کر لیٹ گیا۔ وہ کافی دیر تک وہیں کھڑی مجھے دیکھتی رہی اور پھر خاموشی سے واپس چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد کمرے میں باقی غلام بھی ایک ایک کر کے آنے لگے۔ اگلے آدھے گھنٹے تک ہی کمرے میں ایک رونق سی لگ گئی تھی۔ سب لوگوں نے کھانا لے لیا تھا اور کچھ اندر کمرے میں کھانا کھا رہے تھے جبکہ کچھ باہر ہی بیٹھ کر کھانے لگے۔ دو تین لوگوں نے مجھے آواز دے کر کھانے کا پوچھا لیکن میں خاموشی سے لیٹا رہا۔ میں نے کسی کو بھی جواب نہیں دیا۔

”ایلی! اٹھ جاؤ اور کھانا کھا لو، میں آپ کے لئے کھانا لیکر آئی ہوں۔“ مجھے ساندراہ کی آواز سنائی دی۔ وہ کھانا لیکر آئی تھی۔

”ایلی! اب اٹھ جاؤ یار! کھانا تو کھا لو، اس کے بعد بے شک سوتے رہنا۔“ اس نے مجھے کندھے سے پکڑ کر ہلایا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے ساندراہ کے ساتھ عالیہ بھی کھڑی نظر آ گئی۔ وہ اس کے پیچھے ہی کھڑی تھی۔

”کھانا کھا لوالی! کھانے کو نہ نہیں کرتے۔۔ گناہ ہوتا ہے۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا۔
 ”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ میں نے پھر انکار کیا لیکن اس بار یہ انکار بہت ہلکا تھا۔ اس نے ساندراہ کے ہاتھ سے کھانا لیا اور میرے پاس ہی بستر پر بیٹھ گئی۔

”ایلی! انسان ساری زندگی اسی روٹی کے لئے محنت کرتا ہے۔ اس لئے روٹی کو کبھی بھی منع نہیں کرتے۔“
 اس نے بریڈ کا ایک ٹکڑا توڑ کر اسے سالن میں بھگوایا اور میرے منہ کی طرف بڑھایا۔

پاکستان میں روٹی کے نوالے کو سالن میں بھگو کر یا اس سے سالن اٹھا کر کھائی جاتی ہے جبکہ یورپ اور امریکہ میں سالن الگ کھایا جاتا ہے چچ کے ساتھ اور بریڈ الگ کھائی جاتی ہے۔ وہ لوگ سوکھا سالن چچ کے ساتھ کھاتے ہیں اور بہت تھوڑی بریڈ الگ سے کھاتے ہیں۔ پاکستانی اور انڈین لوگ کبھی بھی سوکھا سالن یا سوکھی روٹی نہیں کھاتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ اس سے بالکل برعکس ہے۔ چونکہ عالیہ ہندوستانی تھی اس لئے وہ ہمیشہ بریڈ کو سالن میں بھگو کر کھاتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے بھی اب عادت ہو گئی تھی۔ میں بھی بریڈ کو سالن کے ساتھ کھانے لگ گیا تھا۔ عالیہ نے بریڈ کا ایک نوالہ میرے منہ کی طرف بڑھایا تو میں کافی دیر تک اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔

”کھا لوالی! دیکھ صبح سے بے چاری تمہاری منٹیں کر رہی ہے اور تم ہو کہ ناراضگی ہی ختم نہیں کر رہے؟
 تمہاری وجہ سے اس بے چاری نے بھی کھانا نہیں کھایا ہے۔“ ساندراہ نے ہمارے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔
 ”تم نے کھانا نہیں کھایا؟“ میں نے عالیہ سے سوال کیا۔

”نہیں! تم کھاؤ گے تو پھر میں بھی کھا لوں گی۔“ اس نے پھینکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ اس کا کھانے والا ہاتھ ابھی تک میری طرف بڑھا ہوا تھا۔ وہ مسلسل میری طرف دیکھ رہی تھی۔
 ”کیوں؟ تم نے کیوں نہیں کھایا؟“ میں نے پھر سوال کر دیا۔

”میرا دل نہیں ہے۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔
 ”کھا لوالی! زیادہ دیر ناراضگی اچھی نہیں ہوتی۔“ میں نے کوئی رسپانس نہیں دیا تو وہ دوبارہ بولی۔
 ”عالیہ! تم نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔“ میں نے اسکی سبز آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”اس لئے تو صبح سے معافی مانگ رہی ہوں۔“ اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ میں نے آہستگی سے منہ کھولا تو اس نے بریڈ کا نوالہ میرے منہ میں ڈال دیا۔

”تم بھی کھا لو عالیہ! تمہیں بھی بھوک لگی ہوگی۔“ میں نے ایک نوالہ بنا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ارے میں کوئی معشوق تھوڑی ہوں تمہاری جو تم اپنے ہاتھوں سے مجھے کھلا رہے ہو؟“ اس نے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یار! ایک دوست کی حیثیت سے کھلا رہا ہوں۔۔۔ دوست تو ہونا میری؟“ میں نے نوالہ آگے بڑھایا تو اس نے ہاتھ سے پکڑ کر منہ میں ڈال لیا۔

”ایلی صاحب! دوستی ہمیشہ برابر کے لوگوں میں ہوتی ہے، غلام اور آقا کہاں دوست ہو سکتے ہیں؟“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا تو میں تڑپ اٹھا۔ وہ ایسے ہی طنزیہ بات کرتی تھی جو سیدھی میرے دل پر آ کر لگتی تھی۔ میرے پاس اس کے کسی بھی سوال کا جواب نہیں تھا اس لئے میں خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ خالی برتن اٹھا کر باہر لے گئی اور میں وہیں لیٹ گیا۔ وہ برتن رکھ کر واپس گئی تو میں نے تھوڑا کھسک کر اس کے لئے جگہ بنائی اور وہ وہیں میرے ساتھ ہی لیٹ گئی۔

”ایلی! پتہ ہے اس دنیا میں سب سے زیادہ درد کس چیز میں ہوتا ہے؟“ وہ میرے سینے پر سر رکھ کر لیٹی ہوئی تھی۔ میں آہستگی سے اس کے سر میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔

”ایلی! پتہ ہے درد کی آخری حد کیا ہوتی ہے؟“ اس نے نرم لہجے میں کہا۔

”غلامی سے بڑا دکھ شاید اور کوئی نہیں ہے۔“ میں نے اس کی نرم گالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

”ایلی! ایک درد اس غلامی سے بھی بڑا ہوتا ہے۔ اتنا بڑا کہ یہ غلامی اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہوتی۔“ اس کی آواز میں درد بھرا ہوا تھا۔

”غلامی سے بڑا درد کیا ہوتا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”ایلی! عشق سے بڑا درد اور کوئی نہیں ہوتا، یہ عشق وہ دیمک ہے جو ہر ایک چیز کو کھا جاتا ہے۔ یہ عشق ہی ہوتا ہے جو بڑے بڑے بادشاہوں کو غلام بننے پر مجبور کر دیتا ہے۔“ اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

”ارے! عشق اور محبت تو نصیب کی بات ہوتی ہے یہ تو کسی کسی کے نصیب میں آتا ہے۔ یہ درد کہاں سے ہوتا ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔

”ایلی صاحب! ابھی آپ کو عشق ہوا نہیں ہے۔ جب کبھی اس عشق کے چکروں میں پڑو گے تو پھر آپ کو

پتہ چلے گا۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”اچھا عالیہ صاحبہ! آپ نے ایلی کو ابھی جانا ہی کہاں ہے۔ میں تو بچپن سے ہی عشق کرتا چلا آ رہا ہوں۔ مجھے فلورین سے محبت ہے اور ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اس محبت میں درد کہاں سے ہوتا ہے؟ شاید تمہارے ہندوستان میں درد ہوتا ہوگا؟“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”ایلی! وہ عشق نہیں ہے، عشق اتنا آسان کہاں ہوتا ہے۔ یہ تو جسم کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ ایلی! تم بہت پیارے اور نرم دل سے نوجوان ہو یا! کبھی عشق مت کرنا۔“ اس نے میرے سینے سے سر اٹھایا اور دوسری طرف کروٹ بدل کر سو گئی۔

مجھے اس کی بات سمجھ نہیں آئی تھی۔ میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اس کی طرف منہ کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

میں گھر سے ایک ہفتے کا کہہ کر ڈیرے پر آیا تھا لیکن مجھے یہاں تین مہینے سے زیادہ ہو گئے تھے۔ ابو اور دوسرے گھر والے مجھے گھر جانے کا کہہ کہہ کر تھک گئے تھے لیکن میں ان میں سے کسی کی بات بھی نہیں مان رہا تھا۔ فلورین نے بھی اپنا زور لگا لیا تھا لیکن میں کسی کی بات بھی نہیں مان رہا تھا۔ وہ بے چاری میری محبت میں پاگل ہو چکی تھی۔ وہ میرے بدلتے ہوئے رویے کو دیکھتی تھی لیکن مجبور تھی۔ وہ ہر ممکن طریقے سے میرے دل کو جیتنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن میرا دل کہیں اور اٹک چکا تھا۔ میں عالیہ کی زلفوں کا اسیر ہو چکا تھا۔ مجھے عالیہ سے محبت ہو گئی تھی۔ یہ پہلی نظر کی محبت نہیں تھی۔

عالیہ کو ہمارے پاس آئے ہوئے ایک سال کے قریب ہو چکا تھا اور اس ایک سال میں وہ قطرہ قطرہ کر کے میرے دل میں اتری تھی۔ وہ پسند تو مجھے پہلے دن سے ہی آگئی تھی اور اسی لئے میں نے ابو سے لڑ کر اسے چار گنا زیادہ قیمت دے کر خریدا تھا۔ اس کی صورت، سیرت اور انداز گفتگو نے تو پہلے دن سے ہی مجھے متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ مجھے پہلی نظر میں ہی پسند آگئی تھی لیکن مجھے فلورین سے بچپن سے محبت تھی۔ میں اپنی منگیتز فیلی سی محبت کرتا تھا۔ میں عالیہ کو ایک دوست کی حیثیت سے پسند کرتا تھا لیکن آہستہ آہستہ وہ دوست سے محبوب بن گئی تھی۔ اس نے فلورین کی جگہ لے لی تھی۔ عالیہ صحیح کہتی تھی کہ اس دنیا کی سب سے دردناک چیز عشق ہوتا ہے اور یہ عشق صرف ایک بار ایک ہی شخص سے ہوتا ہے۔ ہم محبت کو ہی عشق سمجھنے لگتے ہیں جبکہ محبت ایک بار نہیں کئی بار ہوتی ہے۔ دنیا کا ہر شخص ہی محبت کرتا ہے، ایک سے محبت ختم ہوتی ہے تو دوسرے

سے شروع ہو جاتی ہے۔ مجھے بھی اپنی بچپن کی دوست فلورین سے محبت تھی جو عالیہ کے آنے سے ختم ہو چکی تھی۔ مجھے عالیہ سے عشق ہو چکا تھا اور اس عشق میں درد بھی محسوس ہونا شروع ہو گیا تھا۔

عشق کی اصل پہچان ہی درد ہوتا ہے۔ وہ درد جو سیدھا دل میں محسوس ہوتا ہے، جو مستقل ہوتا ہے اور جس کے ہونے کی کبھی سمجھ نہیں آتی ہے۔ محبوب پاس ہوتا ہے، وہ ہماری دسترس میں ہوتا ہے لیکن پھر بھی اس محبوب کی موجودگی میں بھی درد میں کمی نہیں ہوتی ہے۔ اس درد کی سمجھ ہی نہیں آتی کہ وہ کیوں ہوتا ہے اور سب کچھ پاس ہونے کے باوجود بھی اس سے نجات کیوں نہیں ملتی۔ یہ عشق ہوتا ہے جو اس درد میں بھی لذت ڈھونڈ لیتا ہے۔ مجھے عالیہ سے عشق ہو چکا تھا۔ اس عشق کا درد میں اپنے سینے میں محسوس کرنے لگا تھا۔

کپاس کا سیزن ختم ہو چکا تھا اور اس کی جگہ پر اب ہم نے گندم کاشت کر دی تھی۔ گندم کے ساتھ ساتھ ہم نے کافی ایکڑز پر سبزیاں بھی کاشت کر دی تھیں۔ یہ سبزیاں ہم آسٹن شہر لے کر جاتے تھے۔ گندم بیجنے کے بعد اس پر کوئی محنت نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی گندم کو زیادہ آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ زمینداروں نے چونکہ غلاموں پر پیسے لگائے ہوتے ہیں اور وہ ان کو فوری بٹھا کر کھانا تو نہیں کھلا سکتے۔ اس لئے زمیندار کوئی نہ کوئی کام کرتے رہتے تھے جس سے یہ غلام فارغ نہیں بیٹھتے تھے۔ ابو بہت زیادہ سبزی لگاتے تھے۔ سبزی کانچ گھر کا ہوتا تھا اور پانی بھی دریا سے لگ جاتا تھا۔ اس زمانے میں کوئی کھا، سپرے تو ہوتی نہیں تھی اس لئے کوئی خرچہ نہیں ہوتا تھا۔ غلام گھر کے ہوتے تھے جو صبح سے شام تک سبزی توڑتے تھے اور اس سبزی کو پھر نیل گاڑی میں ڈال کر شہر بھیج دیا جاتا تھا۔ ابو ہفتے میں دو بار نیل گاڑی شہر میں بھیجتے تھے۔ آج کل کدو کا سیزن تھا۔ ہم سب صبح شام تک کدو توڑتے تھے۔

غلاموں کے ساتھ رہتے رہتے میں خود بھی ایک غلام بن گیا تھا۔ میرا ہاتھ بھی اب پکا ہو گیا تھا اور میں باقی غلاموں کے برابر ہی کام کرتا تھا۔ سزا اب بھی دی جاتی تھی اور مجھے اس سے بری رکھا گیا تھا۔ ابو کو معلوم تھا کہ یہ وقتی جوش ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ کم ہو جائے گا۔ انہوں نے مسلح سپریداروں کو واضح کیا ہوا تھا کہ کوئی بھی مجھے کوڑا نہیں مارے گا۔ میرے ساتھ ساتھ عالیہ کے لئے بھی یہی حکم تھا۔ ابو نو جوان لڑکیوں کو ویسے بھی کوڑے نہیں مارنے دیتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کوڑوں کے نشانات سے لڑکی کا جسم خراب ہو جاتا ہے اور پھر اس غلام لڑکی کی قیمت بھی انتہائی گر جاتی ہے۔ ابو ایک پکے زمیندار تھے جو کبھی بھی گھالے کا سودا نہیں کرتے تھے۔ میں عالیہ کے نزدیک ہوتے ہوئے بھی اس سے دور تھا۔ میں جس قدر اس سے نزدیک

ہونے کی کوشش کرتا تھا وہ اتنا ہی مجھ سے دور ہو جاتی تھی۔ میں عشق کی آگ میں جلنے لگا تھا لیکن وہ یکسر مجھے نظر انداز کر رہی تھی۔ میں مالک تھا اور اس کی حیثیت ایک غلام سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ وہ میرے پاس ہوتی تھی، وہ میرے ساتھ سوتی تھی لیکن پھر بھی میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی وہ میرے ساتھ نہیں ہوتی تھی۔ وہ میری دسترس میں ہونے کے باوجود بھی میری نہیں تھی۔

”عالیہ! مجھے تم سے عشق ہو گیا ہے، مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔“ میں کوئی پچاسویں بار اسے اپنی محبت کا یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم دونوں اس وقت ایک کھیت میں آلو بیج رہے تھے۔

آلو اور مکئی دونوں امریکی فصلیں ہیں، یہ امریکہ میں کاشت ہوتی تھیں۔ کولمبس کے امریکہ آنے کے بعد پورا یورپ امریکہ آیا تو یہ دونوں فصلیں پوری دنیا میں پھیل گئیں۔ آلو اور مکئی دونوں امریکہ کے نسخے ہیں جو آج پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ آلو کا بیج نہیں ہوتا، یہ آلو کو کاٹ کر زمین میں دبایا جاتا ہے اور اسی آلو کے ٹکڑے سے پھر پودا پیدا ہوتا ہے جس کی جڑوں میں آلو لگتے ہیں۔ آپ آلو کو غور سے دیکھیں تو اس کے اوپر چار پانچ آنکھیں بنی ہوتی ہیں، انہیں آنکھوں سے پودے نکلتے ہیں۔ ہم ایک ایک آلو کے تین تین ٹکڑے کرتے تھے اور پھر ان ٹکڑوں کو زمین میں دباتے تھے۔ ہم صبح صبح پہلے دو گھنٹے آلوؤں کو کاٹ کر ان کے ٹکڑے کرتے تھے اور پھر ان ٹکڑوں کو کپڑے کی ایک بڑی جھولی میں ڈال کر پشت کے پیچھے باندھتے تھے۔ اس کے بعد بیلچے کی مدد سے پہلے کھیت میں گڑھا کھودتے تھے اور پھر اس گڑھے میں آلو کا ٹکڑا ڈال کر اوپر مٹی ڈال دیتے تھے۔ کھیت کو بیلوں کی مدد سے پہلے ہی ہل چلا کر نرم کر لیا گیا تھا۔ یہ چھوٹا سا کھیت تھا اس لئے یہاں صرف ہم دونوں ہی کام کر رہے تھے جبکہ باقی غلام دوسری طرف تھے۔

”عالیہ! مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔“ میں نے بیلچے کو زمین پر رکھا اور عالیہ کے بازو کو پکڑتے ہوئے کہا۔ اس نے میری پہلی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا اس لئے میں نے اسے بازو سے پکڑ کر روکا تھا اور اپنے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔

”عالیہ! تمہیں معلوم ہے کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں لیکن تم اب جان بوجھ کر مجھے نظر انداز کر رہی ہو؟“ میں نے کسی قدر غصے سے کہا۔

”ایلی صاحب! کیوں محبت کے چکروں میں پڑ رہے ہیں؟ یہ محبت ہم غلاموں کو اس نہیں آتی۔“ وہ دوبارہ کام کرنے لگی۔

”عالیہ! یہ میری بات کا جواب نہیں ہے، میں تمہارا جواب سننا چاہتا ہوں!“ میں نے اسے دوبارہ پکڑ کر روک لیا۔

”اچھا! تو پھر میں بھی آپ سے محبت کرتی ہوں۔۔۔ اب خوش ہیں؟“ اس نے نارمل لہجے میں کہا۔
 ”نہیں! تم جھوٹ بول رہی ہو، تم صرف میرا دل بہلا رہی ہو تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔

”اچھا! تو پھر کیسے یقین کریں گے؟ میں آپ کے ساتھ ہوں، چوبیس گھنٹے آپ کے ساتھ ہوتی ہوں، رات کو سوتی بھی آپ کے ساتھ ہوں اور کبھی آپ کی کسی بات سے انکار بھی نہیں کیا ہے۔ اب محبت سے کیسے انکار کر سکتی ہوں؟“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”عالیہ! میں سیریس ہوں، مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ میں یہاں صرف اور صرف تمہاری وجہ سے ہوں۔ یہ غلامی کی زندگی صرف اور صرف تمہاری وجہ سے چھیل رہا ہوں۔“ میں نے اس کے گالوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ میرے ہاتھوں میں مٹی لگی ہوئی تھی۔ اس مٹی نے عالیہ کے گال گندے کر دیئے تھے۔

”ایلی! آپ کو کوئی زبردستی سے تو کام نہیں کروا رہا ہے؟ آپ آزاد ہو کر واپس جاسکتے ہو۔۔۔ محبت بھی آپ کے اختیار میں ہے اور نفرت بھی۔ آپ تو آزاد سفید فام لڑکے ہو جو سب کچھ کر سکتا ہے جبکہ میں ایک غلام لڑکی ہوں جو نہ محبت اپنی مرضی سے کر سکتی ہے اور نہ نفرت۔۔۔ میرے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔“ اس نے پھکی سی مسکراہٹ سے کہا اور اپنے بازو سے گالوں کو صاف کرنے لگی۔

”ایلی صاحب! محبت وہاں ہوتی ہے جہاں اس کا اختیار ہو جبکہ میں تو چاہتے ہوئے آپ سے دور نہیں جاسکتی۔ مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی آپ کے ساتھ رہنا پڑتا ہے اور آپ کے ساتھ سونا پڑتا ہے۔ ابھی آپ محبت کا کہہ رہے ہیں تو ٹھیک ہے محبت بھی کر لیتے ہیں۔“ اس کی باتوں میں بہت گہرائی تھی۔

”تمہاری بات کا کیا مطلب ہے؟ تم مجبوری سے میرے ساتھ رہ رہی ہو؟ مجھے لگا ہم دوست ہیں۔“ میں نے کمزور لہجے میں کہا۔

”ایلی! دوستی برابر کے لوگوں میں ہوتی ہے جبکہ ہم دونوں برابر نہیں ہیں۔ تم مالک ہو اور میں غلام اور ہم دونوں میں نہ دوستی ہو سکتی ہے اور نہ ہی محبت۔“ اس نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا اور دوبارہ بیچ بونے میں مصروف ہو گئی۔ میں کافی دیر تک غصے سے اس کی طرف دیکھتا رہا لیکن وہ خاموشی سے کام کرتی رہی۔

”عالیہ! تمہیں مجھ سے محبت ہے یا نہیں ہے وہ الگ بات ہے لیکن مجھے تو تم سے محبت ہے، عشق ہے تم سے اور اسی لئے اس عشق کا درد بھی اب اپنے دل میں محسوس کرنے لگا ہوں۔“ میں نے اس کو کندھے سے پکڑ کر سیدھا کیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا۔

”ایلی صاحب! مکئی کا کھیت نزدیک ہی ہے۔ دونوں چلتے ہیں، پانچ منٹ لگیں گے اور آپ کے اس درد کا علاج ہو جائے گا۔“ اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

”عالیہ! تم مجھے غلط کیوں سمجھتی ہو؟ میں ایسا لڑکا نہیں ہوں۔ میں نے تم کو کبھی اس نظر سے دیکھا ہی نہیں ہے۔“ میں نے پھر احتجاج کیا۔

”اچھا! اگر پہلے کبھی نہیں دیکھا ہے تو اب دیکھ لو! محبت کا انجام تو یہی ہوتا ہے نا تو پھر تم کیوں گھبرارے ہو؟“ وہ اب میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بات کر رہی تھی۔

”عالیہ! تم بہت بدل گئی ہو، تم پہلے والی عالیہ بالکل نہیں رہی ہو۔“ میں نے اس سے نظریں چرائیں اور نیچے زمین کی طرف دیکھنے لگا۔

”ایلی! اس عشق سے باہر نکلو ورنہ ختم ہو جاؤ گے۔“ اس نے میرے چہرے پر ہاتھ رکھا اور اسے نزدیک کر کے اپنے ہونٹ میری گالوں پر رکھ دیئے۔

”یہ محبت نہیں ہے عالیہ! یہ تو محبت کی توہین ہے۔“ میں نے ہاتھ سے اسے دور کرتے ہوئے کہا۔

”ایلی! میں محبت کرنا ہی نہیں چاہتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم چار دن مجھ سے محبت کا کھیل کھیلو گے، چار دن کی خوشی دینے کی کوشش کرو گے اور پھر دل بھر جانے پر چھوڑ جاؤ گے۔ میں تمہارے اس دل کو بھرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کوشش کر رہی ہوں کہ تم جلد سے جلد مجھ سے اکتا جاؤ اور پھر چھوڑ کر چلے جاؤ تا کہ مجھے کم سے کم دکھ محسوس ہو۔“ وہ دوبارہ آلوکا بیج بونے میں مصروف ہو گئی۔

میں اس بار پھر اسے پیچھے سے دیکھتا رہا لیکن اس بار مجھ سے کچھ اور کہنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ہندوستان کی شہزادی تھی اور شہزادیوں کو حاصل کرنے کے لئے بہت محنت کرنی پڑتی تھی۔ شہزادیاں اتنی آسانی سے کہاں حاصل ہوتی ہیں۔ شام کو ڈیرے پر آئے تو ابوا ایک بار پھر واپس گھر جانے کا کہنے لگے۔ وہ اب روزانہ ہی مجھ پر واپسی گھر جانے کا زور دیتے تھے لیکن میں ہر بار ہی منع کر دیتا تھا۔

”ایلی بیٹا! ایسے کب تک چلتا رہے گا؟ اس عالیہ کے چکر میں تمہارا سارا مستقبل خراب ہو رہا ہے۔ ہم

نے تمہارے لئے کتنے بڑے بڑے خواب دیکھے تھے لیکن تم نے ان سب خوابوں کو چکنا چور کر دیا ہے۔“ ابو مجھے سمجھانے لگے۔ ہم دونوں تالاب کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے۔

”بیٹا! تمہاری ماں بہت پریشان رہتی ہے۔ تمہاری وجہ سے ہمارے پورے گھر کا ماحول خراب ہو رہا ہے۔ تمہاری ماں، بہن اور بھائی ہم سب تم سے محبت کرتے ہیں، تمہاری فکر کرتے ہیں۔ تمہاری منگیتر فلورین بھی بے چاری ہر وقت تمہارا ہی پوچھتی رہتی ہے۔ ہم سب تم سے محبت کرتے ہیں لیکن ایک تم ہو جو کسی کی بھی پروا نہیں کر رہے ہو۔ تمہیں اس عالیہ کے سوا اور کوئی دکھائی ہی نہیں دے رہا ہے۔“ ان کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

”بیٹا! تمہاری زندگی ادھر برنٹ میں نہیں ہے، تمہاری زندگی واشنگٹن میں ہے۔ تم غلامی یا زمیندار کے لئے پیدا نہیں ہوئے ہو۔ تم نے اس سے کہیں اوپر جانا ہے۔“ ابو نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور پر خیال نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔

”ابا! مجھے عالیہ سے محبت ہو گئی ہے، میں اس لڑکی سے محبت کرنے لگا ہوں۔“ میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میری آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔

”بیٹا! یہ غلام محبت کرنے کے لئے نہیں ہوتے، محبت ہمیشہ اپنے جیسوں سے ہوتی ہے۔ تم فلورین سے محبت کرتے ہو اور وہ تمہارے بچپن کی دوست اور منگیتر ہے۔“ ابو مجھے سمجھانے لگے۔

”ابا! یہ عالیہ میرے دماغ کے اندر آ کر بیٹھ گئی ہے۔ میں چاہ کر بھی اسے اب باہر نہیں نکال سکتا۔ ابا! آپ کا بیٹا ایلی عشق کے ان راستوں پر چل پڑا ہے جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہے۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! عالیہ ایک سیاہ فام لڑکی ہے اور ہمارا معاشرہ کبھی بھی اسے قبول نہیں کرے گا۔ وہ سفید فام نہیں ہے، وہ ہم میں سے نہیں ہے اور تم دونوں کبھی بھی ایک نہیں ہو سکتے۔ یہ پورا گاؤں تمہارے خلاف ہو جائے گا۔ تم ان گاؤں والوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہم میں سے کوئی بھی معاشرے سے بغاوت کر کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ بیٹا! ہم اس گاؤں سے نہیں لڑ سکتے۔“ وہ بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ انتہائی سنجیدگی سے بول رہے تھے۔ انھیں پہلے میری محبت کی شدت کا اتنا اندازہ نہیں تھا۔

”ابا! آپ گاؤں کی بات کرتے ہو میں تو اس عالیہ کے لئے پورے امریکہ سے لڑنے کے لئے تیار

ہوں۔ جو روک سکتا ہے وہ روک کر دکھا دے!“ میں وہاں سے اٹھا اور اندر کمرے میں چلا گیا۔ ابو کافی دیر تک باہر کھڑے کچھ سوچتے رہے اور پھر وہ بھی واپس گھر چلے گئے۔ رات کو سونے کے وقت ابو پھر آ گئے، ان کے ساتھ فلورین بھی آئی تھی۔ میں فلورین کو لیکر ایک بار پھر تالاب کے کنارے پر بیٹھ گیا جبکہ ابو عالیہ کو سمجھانے لگے۔ عالیہ اس سارے معاملے سے باخبر تھی لیکن وہ بے اختیار تھی۔ اس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا، وہ بے بس تھی۔

”ایلی! میری محبت کا کیا ہوگا؟“ فلورین گھنٹہ بھر تورتی رہی تھی اور آخر میں صرف ایک ہی جملہ کہہ سکی تھی۔ مجھے بے اختیار اس پر ترس آ گیا۔ وہ بے چاری بچپن سے محبت کرتی چلی آرہی تھی۔ اس نے میرے علاوہ اور کسی کا خواب ہی نہیں دیکھا تھا۔ ہم دونوں شادی کر رہے تھے لیکن اچانک ہی سب کچھ الٹ ہو گیا تھا۔ میں فلورین کو چھوڑ کر عالیہ سے محبت کرنے لگا تھا۔ فلورین اچانک ہی خالی ہاتھ ہو چکی تھی۔

”ایلی! میں تو صرف تم سے محبت کرتی ہوں۔“ اس نے مسکتے ہوئے کہا۔

”فیلی! میں خود بے بس ہو چکا ہوں۔۔۔ مجھے خود سمجھ نہیں آرہی ہے کہ میں کیا کروں۔ یہ محبت انسان کو پاگل کر کے رکھ دیتی ہے، میں بھی پاگل ہو چکا ہوں۔“ میں اسے تسلی دیتے ہوئے خود ہی رو پڑا تھا۔ مجھے خود سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اب کیا کروں۔ بس اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

”ایلی صاحب! آپ کی محبت محبت ہے اور ہماری کیا ہے؟ کیا یہ محبت نہیں ہے؟“ وہ اٹھی اور اندر کمرے میں چلی گئی۔

”انکل براؤن! آپ گھر چلے جائیں، آج میں بھی ادھر ایلی کے ساتھ ہی رہوں گی۔“ اس نے ابو کو گھر جانے کا کہا اور خود عالیہ سے میرا بستر پوچھ کر وہاں بیٹھ گئی۔

”ٹھیک ہے فلورین بیٹی! جیسے تم صحیح سمجھتی ہو۔ تم دونوں جوان اور سمجھ دار ہو، مجھے امید ہے ہمارے ایلی کو بھی عقل آ جائے گی۔“ انہوں نے فلورین کے سر پر ہاتھ پھیرا اور باہر چلے گئے۔ میں ابھی تک تالاب کے کنارے پر کھڑا تھا۔ ابو میرے ساتھ کوئی دس منٹ تک بیٹھے اور پھر گھر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں بھی اندر کمرے میں آ گیا۔ میرے بستر پر فلورین لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر دیوار کی طرف جگہ بنائی تو میں خاموشی سے لیٹ گیا۔ عالیہ ابھی تک ایک سائیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

”عالیہ! تم بھی لیٹ جاؤ یا پھر ایلی کے بغیر نیند نہیں آئے گی؟“ فلورین نے طنزیہ انداز میں کہا تو عالیہ

جلدی سے اپنے بستر پر فلورین کی دوسری طرف لیٹ گئی۔

”ایلی صاحب! تھوڑا ہمیں بھی محبت کا موقع دیں!“ فلورین نے میرے سینے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔
میں نے اپنا ایک بازو اس کی گردن کے نیچے سے گزارا اور اس کے بالوں کو سہلانے لگا۔

”ایلی! تمہیں یاد ہے بچپن میں ہم ایک دوسرے کے بغیر کبھی سوتے ہی نہیں تھے؟ ہمیں اکیلے میں نیند ہی نہیں آتی تھی اور میں روزانہ رات کو تمہارے گھر آ جایا کرتی تھی؟ امی لاکھ برا بھلا کہتی لیکن میں پھر رات کو گھر نہیں جاتی تھی۔ یار! ہمیں تو ایک دوسرے کے بغیر کھانا ہی ہضم نہیں ہوتا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے بغیر کبھی رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ پورا گاؤں ہماری محبت کی مثالیں دیا کرتا تھا۔ یار! تم نے تو سب کچھ ہی بھلا دیا ہے۔ ایلی! تمہیں تو نیند آ جاتی ہے لیکن میں تو اب بھی اسی موڑ پر کھڑی ہوں۔ مجھے تو اب بھی نیند نہیں آتی ہے۔ یار! تم کیوں بدل گئے ہو؟“ وہ میرے سینے پر سر رکھ کر ایک بار پھر رونے لگ پڑی تھی۔

میرے دل میں درد ہونے لگا تھا۔ میرا سینہ درد سے بھر چکا تھا۔ ایک میری محبت تھی اور ایک مجھ سے محبت کرتی تھی میں دونوں عورتوں کے درمیان پھنس چکا تھا۔ میں عشق کے امتحان سے گزرنے لگا تھا۔ ایک نامعلوم سادہ میرے سینے میں بھی ڈیرے ڈال کر بیٹھ چکا تھا۔ اگلے ایک ہفتے تک فلورین ایک سائے کی طرح میرا پیچھا کرتی رہی۔ وہ کہیں بھی مجھے اکیلا نہیں ہونے دیتی تھی۔ وہ روزانہ صبح اٹھ جاتی تھی، اپنا اور میرا کھانا لیتی تھی اور میرے ساتھ ہی کھیتوں میں جاتی تھی۔ میں کھیت میں کام کرتا تھا اور وہ کنارے پر بیٹھ کر مجھے دیکھتی رہتی تھی۔

وہ بہت نازک سی لڑکی تھی۔ زمیندارے کا سخت کام اس سے نہیں ہوتا تھا۔ وہ گھنٹہ دو گھنٹے میرے ساتھ کام کرتی تھی اور تھک جاتی تھی تو وہیں کنارے پر بیٹھ کر مجھے دیکھتی رہتی تھی۔ میں اسے گھر جانے کا کہتا تھا لیکن وہ انکار کر دیتی تھی۔ وہ سارا دن کھیت میں بیٹھی میرا کام ختم ہونے کا انتظار کرتی رہتی تھی۔ میں جب فارغ ہو جاتا تو میرے ساتھ ہی واپس ڈیرے پر آتی تھی۔ میں غصہ کرتا تھا تو آگے سے مسکرا دیتی تھی۔ وہ میرے کپڑے دھوتی تھی اور میرے لئے کھانا لیکر آتی تھی۔ رات کو وہ مجھے دبا بھی دیتی تھی۔ وہ میری ہر ایک ضرورت کا خیال رکھ رہی تھی لیکن پھر بھی میرا دل عالیہ کے علاوہ اور کسی کی طرف مائل ہی نہیں ہو رہا تھا۔ عالیہ کا مجھ سے مکمل رابطہ توڑ دیا گیا تھا۔ وہ الگ سوتی تھی اور کھیتوں میں بھی الگ ہی کام کرتی تھی۔ فلورین میری عالیہ سے بات بھی نہیں ہونے دیتی تھی۔ میں یہ سب کچھ خاموشی سے برداشت کر رہا تھا لیکن یہ معاملہ طویل

سے طویل تر ہی ہوتا جا رہا تھا۔ آخر میری برداشت جواب دے گئی اور میں نے کام سے واپسی پر فلورین کو روک لیا۔

”فلورین! تم واپس اپنے گھر چلی جاؤ۔“ میں نے اسے اپنے گھر جانے کا کہا۔

”ایلی! میں تمہیں اپنے ساتھ گھر لیکر ہی جاؤں گی۔“ اس نے فیصلہ کن انداز سے کہا اور ڈیرے کی طرف چلنے لگی۔

”فلورین! ان سب چیزوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے، میں اب کبھی بھی لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ یہ ایلی ختم ہو چکا ہے اور تم بے کار کوشش کر رہی ہو۔“ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر روکتے ہوئے کہا۔

”ایلی یار! مجھے کوشش تو کرنے دو، میں تم سے محبت کرتی ہوں اور مجھے یقین ہے میری محبت دیکھ کر ضرور واپس آؤ گے۔“ اس نے میرے مقابل کھڑے ہو کر کہا۔

”فلورین! جو تم کر رہی ہو وہ محبت نہیں خدمت ہے۔ تم صبح و شام سائے کی طرح میرے پیچھے لگی ہوئی ہو اور دن رات میری خدمت کر رہی ہو۔ فیلی! محبت کبھی خیرات میں نہیں ملتی۔ یہ کبھی محبت کرنے سے نہیں ملتی۔ تم جتنی بھی خدمت کر لو پھر بھی کبھی محبت حاصل نہیں کر سکتی۔ محبت کبھی خیرات میں ملتی ہی نہیں ہے۔ یہ اگر محنت کرنے سے یا مانگنے سے مل جانے والی چیز ہوتی تو میں کب کا سرخرو ہو چکا ہوتا۔ مجھے ایک سال ہو گیا ہے محبت کی خیرات مانگتے مانگتے لیکن آج تک خالی ہاتھ ہوں۔ میں اپنی ہی غلام عورت کی محبت حاصل نہیں کر سکا تو پھر تم کس امید پر دل لگائے بیٹھی ہو؟ گھر جاؤ فیلی! گھر جاؤ اور اس رانجھے کو بھول جاؤ۔“ میں نے اسے راستے میں ہی چھوڑا اور ڈیرے کی طرف جانے لگا۔

ہیر والے رانجھے کی کہانی میں نے عالیہ سے سنی تھی۔ رانجھا ہیر کے لئے بارہ سال بیلے میں بھینس چراتا تھا۔ میں بھی عالیہ کے لئے پچھلے ایک سال سے غلام بنا ہوا تھا۔ تھوڑا سا رانجھا تو میں بھی بن چکا تھا۔ فلورین بھی آہستہ آہستہ میرے پیچھے آنے لگی۔ میں ڈیرے پر آتے ہی اندر کمرے میں چلا گیا جبکہ وہ باہر ہی کھڑی رہی۔ ہمارے ڈیرے پر پہنچتے ہی باقی غلام بھی کام سے چھٹی کر کے پہنچنے لگے۔

انہی غلاموں میں ایک غلام فونشان بھی تھا۔ یہ ایک سال پہلے ہی ہمارے پاس کام پر آیا تھا۔ فونشان کو بھی ہم عالیہ کے ساتھ ہی خرید کر لائے تھے۔ وہ نانچیر یا کاربنے والا تھا۔ فونشان بیس سال کا ایک کڑیل جوان تھا۔ وہ بہت اچھا اور سختی لڑکا تھا۔ فلورین کے گھر میں کچھ کام تھا اور وہ وہاں ایک ہفتے تک کام کرتا رہا

تھا۔ فلورین کے والد نے ایک علیحدہ کمرہ بنوایا تھا۔ فونشان ان کے گھر جا کر کام کرواتا رہا تھا۔ فلورین کی فونشان سے ہیلو ہائے تھی۔ اس نے فونشان کو ڈیرے پر آتے دیکھا تو اس کے ساتھ کپ شپ لگانے لگی۔ وہ اسے فونشان کی بجائے فونٹی کہتی تھی۔ اس کی دیکھا دیکھی اب سارے ڈیرے والے بھی اسے فونٹی ہی کہنے لگے تھے۔

”فونٹی! عالیہ کو جانتے ہو؟“ فلورین اس سے پوچھنے لگی۔

”جی میم! اچھی لڑکی ہے لیکن ایلی صاحب کی وجہ سے آج کل حالات بہت خراب ہو چکے ہیں۔“ اس نے محتاط انداز سے کہا۔

”حالات خراب سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“ فلورین نے نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

”ارے نہیں میم صاحب! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ وہ اصل میں آپ کو پتہ ہے ناکہ ہم غلام لوگ کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتے ہیں۔“ فونٹی بات کر کے پھنس چکا تھا اور اب باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”فونٹی! مجھ سے سیدھی بات کرو، مجھ سے گھما پھرا کر بات مت کرو۔“ اس نے فونٹی کو گھورتے ہوئے کہا۔

”میم! ہم غلاموں کی کوئی اوقات نہیں ہوتی۔“ وہ گھبرا گیا تھا۔

”فونٹی! جو بھی تمہارے دل میں ہے وہ سچ سچ بتاؤ! مجھ پر اعتماد کرو، میں کبھی بھی آگے کسی سے بات نہیں کروں گی۔“ فلورین نے پر زور لہجے میں کہا۔

”میم! ایلی صاحب کو لیکر یہاں سبھی غلام پریشان ہیں۔ ہم سب کو عالیہ کی فکر ہو رہی ہے۔ ایلی صاحب کی وجہ سے وہ بے چاری بے موت ماری جائے گی۔“ فونٹی نے دائیں بائیں دیکھ کر ڈرتے ڈرتے کہا۔

”ایلی تو عالیہ سے محبت کرتا ہے پھر اس سے عالیہ کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟“ فلورین اس کی بات سمجھی نہیں تھی۔

”میم! ایلی ہمارے مالک براؤن صاحب کا بیٹا ہے جبکہ عالیہ سیاہ فام غلام لڑکی ہے جن سے ہمارے مالک کے بیٹے ایلی محبت کرتے ہیں۔ آپ کو تو اس بات کا پتہ ہے کہ امریکن معاشرہ کبھی بھی ایک سیاہ فام عورت کو قبول نہیں کرے گا۔ آپ لوگ کبھی بھی عالیہ کو وہ مقام نہیں دو گے جو ایک عام سفید فام عورت کو ملتا ہے۔ عالیہ اور ایلی کی محبت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ایلی صاحب اس پورے معاشرے سے نہیں لڑ سکتے۔ میم

صاحبہ! اس ساری جنگ میں ایلی صاحب تو شاید بچ جائیں لیکن عالیہ نہیں بچے گی۔ وہ بے چاری بے موت ماری جائے گی۔“ فونٹی نے پھیک سی مسکراہٹ سے کہا اور آگے بڑھنے لگا۔

”فونٹی! ایک بات سنو۔“ فلورین نے اسے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔

”جی میم! آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟“

”فونٹی! تم ایلی کو جانتے ہو وہ کسی سے نہیں ڈرتا ہے اور اس کی ضد کے سامنے سب کو جھکنا پڑے گا؟“ فلورین نے متفکر لہجے میں کہا، اسے اپنی فکر لگی ہوئی تھی۔ ایلی اگر عالیہ کو لڑ جھگڑ کر حاصل کر لیتا تو وہ خالی ہاتھ رہ جاتی۔ ایلی اس کی بجائے عالیہ کی طرف جارہا تھا اور اسے معلوم تھا کہ ایلی ہر کام کر سکتا تھا۔

”میم! یہ ناممکن ہے۔ ایلی اور عالیہ کی محبت کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔“ فونٹی نے فیصلہ کن لہجے میں

کہا۔

”فونٹی! تم ایلی کو نہیں جانتے ہو۔۔۔ وہ عالیہ کو حاصل کر کے ہی رہے گا۔“ فلورین نے کہا۔

”میم! یہ کوئی کہانی نہیں ہے اور نہ ہی عالیہ کوئی شہزادی ہے۔ یہ امریکی معاشرہ ہے جہاں موت ہی

ایک غلام کو آزاد کر سکتی ہے اور شاید عالیہ کے آزاد ہونے کا وقت آ گیا ہے۔“ وہ ایک بار پھر مڑ کر جانے لگا لیکن فلورین نے پھر اسے روک لیا۔

”فونٹی! تم عالیہ کے لئے کچھ کر سکتے ہو؟“ فلورین نے تیز لہجے میں کہا۔

”میم! میں مرنا نہیں چاہتا ہوں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”فونٹی! اس میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔“ فلورین پر خیال نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”سوری میم! میں کسی بھی پنگلے میں پڑ کر مرنا نہیں چاہتا۔“ یہاں تو چھوٹی سے چھوٹی سزا پر بھی مار دیا تھا

اس لئے فونٹی نے پھر انکار کر دیا۔

”فونٹی! سوچ لو؟ میں اس کی قیمت دینے کے لئے بھی تیار ہوں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ عالیہ بچ جائے؟

مجھے معلوم ہے کہ تم سب غلام عالیہ سے محبت کرتے ہو۔“ فلورین نے اسے قیمت کی آفر بھی کر دی۔

”میم! ڈالروں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں کسی بھی غلام کو ڈالر رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ

پیسے میرا مالک لے جائے گا اور آپ مجھے آزاد بھی نہیں کروا سکتیں۔ امریکہ میں کوئی سیاہ فام بغیر مالک کے

نہیں رہ سکتا۔“

یہ قانون سعودی عرب میں آج بھی کفیل کی صورت میں موجود ہے۔ سعودی عرب میں کوئی بھی غیر ملکی کفیل کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پوری دنیا سے غلامی ختم ہو چکی ہے لیکن ابھی بھی عرب ممالک میں یہ کفالت کی صورت میں موجود ہے۔ ہم لوگ یورپ اور امریکہ کو جتنی مرضی گالیاں دیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ انسانی غلامی کو امریکہ نے ہی ختم کیا تھا۔ اقوام متحدہ کے چارٹر میں یہ واضح لکھا ہوا ہے کہ کوئی بھی انسان کسی دوسرے انسان کا غلام نہیں ہو سکتا۔ عرب ممالک آج بھی کفالت کی آڑ میں غیر ملکی مزدوروں کو غلام بناتے ہیں۔ عرب ممالک سے تیل کے ذخائر ختم ہو رہے ہیں اور دنیا متبادل انرجی کی طرف جا رہی ہے۔ اگلے بیس پچیس سال بعد دنیا کی تمام ٹرانسپورٹ بجلی پر منتقل ہو جائے گی اور تیل کی ضرورت ختم ہو جائے گی۔ یہی عرب ممالک جن کے پاس ریت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، غریب ہونا شروع ہو جائیں گے۔ یہی عرب لوگ جو آج ہم لوگوں کو انسان ہی نہیں سمجھتے ہیں یہی لوگ ہمارے ملکوں میں مزدوری کے لئے آئیں گے۔

فونٹی عالیہ کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن اسے اپنی جان بھی پیاری تھی۔ وہ کوئی بھی ہشیاری دکھا کر مرنا نہیں چاہتا تھا۔

”فونٹی! تم میرا کام کر دو، بدلے میں میں تمہیں خرید لوں گی۔ ہمارے گھر میں چار غلام کام کرتے ہیں تم نے انہیں دیکھا ہے کہ وہ کس قدر مزے میں رہتے ہیں؟ ہمارے گھر میں کوئی فالتو کام نہیں ہوتا ہے۔ صرف گھر اور باغیچے کی صفائی سٹھرائی اور کھانا بنانا ہوتا ہے۔ تم پانچ لوگ یہ کام آسانی سے کر سکتے ہو۔ دیکھو فونٹی! میرا کام کر دو اور اس زمیندارے کے کام سے جان چھڑالو۔ صاف ستھرے کپڑے پہن کر گھر میں کام کرنا۔“ فلورین نے اسے آفر کرتے ہوئے کہا۔

”فلورین میم! میں غریب غلام ہوں، میری جان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔۔۔ میں بے موت مارا جاؤں گا۔“ فونٹی نے کمزور سا احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

”فونٹی! ہر چیز آسانی سے نہیں مل جاتی، اس کے لئے کچھ محنت کرنی پڑتی ہے۔“ فلورین نے سنجیدگی سے کہا۔

”ٹھیک ہے، مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ فونٹی نے سوال کیا۔ وہ فلورین کی بات مان چکا تھا۔ فلورین اسے لیکر جانوروں کے باڑے کی طرف چلی گئی اور وہاں جا کر اسے اپنا پورا پلان بتا دیا۔ یہ پلان اسی وقت فلورین نے سوچا تھا۔

”میم نہیں! میں یہ نہیں کر سکتا۔ یہ سب میرے بس کی بات نہیں ہے، میں پکا مارا جاؤں گا۔“ فونٹی نے پلان سنتے ہی انکار کر دیا۔

”فونٹی ایلی کو تم جانتے ہو کہ وہ کبھی بھی کمزوروں پر ہاتھ نہیں اٹھاتا ہے، وہ تمہیں مارے گا نہیں۔“
 ”فلورین میم! میں براؤن صاحب کی بات کر رہا ہوں۔ انہوں نے مجھے گولی مار دینی ہے۔“ فونٹی نے اس کی بات درمیان سے کاٹتے ہوئے کہا۔

”فونٹی! ایلی کے علاوہ باقی پوری فیملی میرے ساتھ ہے۔ میں انکل براؤن کی سب سے پیاری ہوں اور وہ مجھے بیٹیوں کی طرح چاہتے ہیں۔ وہ میری کوئی بھی بات ٹالتے نہیں ہیں، میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔“ فلورین نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے میم! براؤن صاحب آپ کی بات نہیں ٹالتے، وہ اگر مجھے کہہ دیں تو میں سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ وہ مالک ہیں، اگر وہ کہتے ہیں تو میں آپ کے پلان پر حرف بہ حرف عمل کرنے کے لئے تیار ہوں۔“ فونٹی نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

”اوکے فونٹی! میں آج رات ہی انکل سے بات کرتی ہوں اور وہ تمہیں کل صبح بتا دیں گے، تم تیار رہنا!“
 فلورین نے اس کی بات مان لی۔ فونٹی نے اس سے اجازت لی اور واپس کمرے کی طرف جانے لگا۔

”فونٹی!“ فلورین نے اسے پیچھے سے پکارا تو وہ پلٹ کر پیچھے دیکھنے لگا۔
 ”فونٹی! میں ایلی سے بہت محبت کرتی ہوں، مجھے میری محبت سے ملا دو میں ساری زندگی تمہاری احسان مند رہوں گی۔“ فلورین نے ٹھنڈے لہجے میں اس سے کہا اور وہ بھی وہاں سے باہر آ گئی۔ ابو ابھی تک ڈیرے پر ہی تھے۔ فلورین ان کے پاس گئی اور انہیں اپنا پلان بتانے لگی۔

”ٹھیک ہے بیٹی! مجھے امید ہے کہ یہ پلان کامیاب ہو جائے گا۔ صرف ایک غلام کی قربانی دینی پڑے گی اور تم دونوں بچوں کے لئے ایک کیا میں ایک سو غلاموں کی قربانی دینے کے لئے تیار ہوں۔“ ابو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”انکل! قربانی سے آپ کی مراد کیا ہے؟“ فلورین نے نہ سمجھتے ہوئے کہا۔
 ”فلورین بیٹی! ہم فونٹی کو زندہ نہیں چھوڑ سکتے، آج نہیں تو کل یہ بات کھل جائے گی۔ اگر فونٹی نے کبھی زبان کھول دی تو تمہیں پتہ ہے کہ ایلی کا غصہ کتنا ہے؟“ ابو نے گہرے لہجے میں کہا۔

”انکل! اگر مارنا ہی ہے تو پھر دونوں کو کیوں نہیں ماردیتے؟ عالیہ اور فوٹی دونوں مارے جائیں تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہ کاٹا ہی نکل جائے گا؟“ فلورین نے معنی خیز لہجے میں کہا تو ابواس کی بات سن کر اچھل پڑے۔

”ارے واہ! میری بہو تو بڑی سیانی ہوگئی ہے۔ اصل مسئلہ کی جڑ تو عالیہ ہے اور اگر عالیہ کو ہی ماردیا جائے تو یہ سارا مسئلہ ہی ختم ہو جائے گا۔“ ابو کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

”انکل! یہ واقعی صحیح رہے گا۔ عالیہ مرگئی تو ہم سب کی جان چھوٹ جائے گی۔ مجھے معلوم ہے کہ عالیہ کے آپ نے بہت پیسے دے دیے ہیں۔ میں اپنے ابو کو کہہ کر آپ کو عالیہ اور فوٹی کی پوری قیمت دلوا دوں گی۔“ فلورین نے ابو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”فیلی بیٹی! تم میری بیٹیوں کی طرح ہو، میں نے تم میں اور ازبیل میں کبھی فرق نہیں سمجھا ہے۔ اپنے ایلے کے لئے میری پہلی اور آخری چوائس صرف اور صرف تم ہو۔ تم میری بہو ہو اور گھر کی بہو سے کون پیسے لیتا ہے؟ مجھے پیسے نہیں چاہئیں بلکہ میں صرف تم سب کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔“ ابو نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور تالاب کی طرف آگئے۔

انہوں نے فوٹی کو بلایا اور اس سے بات کرنے لگے۔ فوٹی نے ان کا کام کرنے کی ہامی بھری اور واپس آگیا۔ وہ فلورین کے گھر کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کی زمینداروں کی مشکل ترین زندگی سے جان چھوٹنے والی تھی۔ وہ اس پر خوش ہو رہا تھا جبکہ دوسری طرف میرے والد اور فلورین اسے اس دنیا سے نکالنے والے تھے۔ اس کی اس دنیا سے ہی جان چھوٹنے والی تھی۔ میں ان سب ہنگاموں سے بے نیاز اندر کمرے میں کھانا کھا کر لیٹ گیا تھا اور اب سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ عالیہ میرے نزدیک ہی لیٹی ہوئی تھی۔ فلورین کے ایک طرف میں جبکہ دوسری طرف عالیہ سوئی تھی۔ فلورین ابھی تک باہر ہی گئی ہوئی تھی۔

”عالیہ! اس عشق کے لئے اور کون کون سے امتحان دینے پڑیں گے؟“ میں نے عالیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”یہ عشق اتنا آسان کہاں ہوتا ہے؟ یہ تو انسان کی جان لے لیتا ہے۔ ہاں ایلے! یہ عشق جان لے لیتا ہے، کبھی اپنی اور کبھی اپنے محبوب کی۔ ایلے صاحب! یہ عشق تو میری جان لے گا کیونکہ غلام محبوب کبھی عشق کی معراج تک نہیں پہنچتا۔ ہمارے پر اس مقام تک پہنچنے سے پہلے ہی جلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ میں بھی جل

رہی ہوں اور ایک دن ایسے ہی جلتے جلتے ختم ہو جاؤں گی۔“ اس نے آنکھیں بند کیں اور دوسری طرف کروٹ بدل کر سو گئی۔

اگلے ایک مہینے تک آہستہ آہستہ فونٹی کو عالیہ کے قریب کیا گیا۔ کپاس کا سیزن ایک بار پھر شروع ہو چکا تھا۔ میں اور فلورین ایک سائیڈ پر چنائی کرتے تھے جبکہ فونٹی کسی سائے کی طرح عالیہ کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ وہ عالیہ کے ساتھ ہی ہر جگہ جاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی چنائی کرتا تھا۔ مجھے فلورین کہیں بھی جانے نہیں دیتی تھی۔ میں عالیہ کو روزانہ دیکھتا تھا، اس سے بات بھی کرتا تھا لیکن اس سے آگے کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ مسلسل میری محبت کو نظر انداز کر رہی تھی اور میں عالیہ کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں مالک تھا اور وہ ہماری غلام تھی لیکن پھر بھی میں کچھ بھی اس کی مرضی کے بغیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اس کا اعتماد اور محبت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ عورت کو حاصل کرنا آسان ہے، مرد آسانی سے عورت کو حاصل کر لیتا ہے لیکن وہ صرف عورت کا جسم ہی ہوتا ہے۔ اصل چیز تو عورت کی روح ہوتی ہے، اس کا دل ہوتا ہے جو بہت کم مردوں کو نصیب ہوتا ہے۔ عورت ساری زندگی بغیر محبت کے بھی گزارہ کر لیتی ہے۔ وہ سکون سے چھت کے نیچے دو وقت کی روٹی پر ہی اپنی پوری زندگی ایک مرد کے ساتھ گزار دیتی ہے۔ ہم مرد لوگ اپنی عورت کو گالیاں دیتے ہیں، مارتے ہیں، بے عزتی کرتے ہیں اور وہ بے چاری ہمارے آگے دو لفظ بھی نہیں بولتی۔ ہم اسے رعب و دبدبہ کہتے ہیں۔ عورت پر ہاتھ اٹھانے والا مرد دنیا کا بے وقوف مرد ہوتا ہے جسے پتہ ہی نہیں ہوتا ہے کہ زندگی کا اصل مزا کیا ہوتا ہے۔ عورت کی محبت مرد کو بادشاہ بنا دیتی ہے۔ عورت جب محبت کرنے پر آتی ہے تو زندگی کا اصل حسن اور خوبصورتی نظر آنے لگتی ہے۔ عورت صرف مرد سے محبت ہی نہیں کرتی بلکہ وہ اس کے ساتھ جڑے ایک ایک رشتے سے محبت کرتی ہے۔ وہ اس کے گھر، اس کے کام سے محبت کرتی ہے۔ وہ اپنے محبوب کی ایک ایک عادت سے پیار کرتی ہے۔ وہ مکمل طور پر اپنے محبوب کے رنگ میں رنگ جاتی ہے۔ عورت اتنی جلدی کسی سے محبت نہیں کرتی لیکن جب کر لیتی ہے تو پھر اپنے محبوب پر فنا ہو جاتی ہے۔

فلورین مجھ سے ایسی ہی محبت کرتی تھی لیکن میری قسمت مجھے عالیہ کی طرف کھینچ رہی تھی۔ ہندوستانی حسن مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ محبت اور نفرت پر کبھی بھی انسان کا اپنا اختیار نہیں ہوتا۔ یہ دونوں چیزیں انسان کے بس سے باہر ہوتی ہیں۔ میرا بھی اس محبت پر کوئی بس نہیں چل رہا تھا۔ میں عالیہ سے عشق کرنے لگا

تھا اور اس عشق کے لئے سب کچھ کرنے پر تیار تھا۔ مجھے عالیہ کے سوا اور کوئی دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ عالیہ مجھ سے محبت نہیں کرتی تھی۔ وہ اس محبت کے چکروں میں پڑنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ وہ غلام تھی اور ایک غلام کی حیثیت سے اپنا سب کچھ میرے حوالے کرنے پر تیار تھی لیکن میں اس کے جسم سے تو محبت کرتا ہی نہیں تھا۔ فلورین اس سے کہیں زیادہ حسین تھی لیکن میں ظاہری حسن کی بجائے عالیہ کے باطنی حسن پر مر مٹا تھا۔

کہتے ہیں کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔ فلورین بھی اسی فارمولے پر گامزن ہو چکی تھی۔ وہ کسی بھی حالت میں اب عالیہ کو راستے سے ہٹا دینا چاہتی تھی۔ اس نے میرے والد اور بھائیوں کو بھی ساتھ ملا لیا تھا۔ عالیہ جس کو کبھی صرف میرے نام کی وجہ سے چھوٹ دی جاتی تھی اب ان سب کے ظلم کا شکار ہونے لگی تھی۔ اسے اب صرف میری محبت کی وجہ سے سزا دی جا رہی تھی۔ ابو اور دوسرے بھائیوں کا زور مجھ پر نہیں چلتا تھا۔ میں ان کا اپنا خون تھا اس لئے وہ مجھ پر سختی نہیں کر سکتے تھے۔ اسی وجہ سے میرا تمام غصہ وہ عالیہ پر نکال رہے تھے۔ عالیہ ان سب کے مظالم سہہ رہی تھی۔ فونٹی کو اس کا ہمدرد بنا کر آگے لایا جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فونٹی عالیہ کے انتہائی قریب آ گیا۔ ایک مہینے کی مسلسل محنت اور سازشوں نے آخر اپنا کام کر ہی دیا تھا۔ آخر پلان پر عمل کرنے کا دن آ ہی گیا تھا۔

اس دن ہم صبح اٹھے تھے اور حسب معمول چنانی کے لئے چلے گئے تھے۔ دوپہر کے پانی کے وقفے کے بعد ہم چنانی کر رہے تھے۔ ابو اور بڑے بھائی بھی آچکے تھے۔ ابو تو ایک چکر لگا کر اب دوسرے کھیت کی طرف چلے گئے تھے جبکہ بڑے بھائی وہیں فلورین کے ساتھ گپ شپ لگانے لگ گئے تھے۔ فلورین اب بھی میرے ساتھ ساتھ ہی ہوتی تھی۔ جیکسن بھائی جو کہ فیلکس سے چھوٹے اور مجھ سے بڑے تھے وہ دوسری طرف خالی کھیتوں کو بیچنے پر لگے ہوئے تھے۔ وہ اس طرف آتے ہی نہیں تھے۔ عالیہ نے کپاس کا تھیلا بھر لیا تو اسے خالی کرنے کے لئے پیچھے چلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی فونٹی بھی چلا گیا۔ اس کا تھیلا ابھی بھرا نہیں تھا لیکن وہ عالیہ کے پیچھے پیچھے ہی چلا گیا۔ کھیت کے بالکل درمیان میں بادام کا ایک بہت بڑا درخت تھا۔ عالیہ نے اپنی کپاس کا ڈھیر اسی درخت کے نیچے رکھا ہوا تھا جبکہ اس کے ساتھ ہی فونٹی کا بھی ڈھیر موجود تھا۔

”فونٹی! تم اپنا تھیلا تو بھر لیتے؟ ایسے ہی آدھا آدھا لیکر میرے ساتھ آؤ گے تو رات کو تمہاری کپاس بہت کم ہوگی اور سزا بھی مل جائے گی۔ پوری رات سردی میں درخت کے ساتھ زنجیروں سے گزارنی بہت مشکل ہوتی ہے۔“ عالیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں عالیہ! تمہارے لئے ایک رات کیا میں ساری زندگی بھی بھوکا پیاسا باہر کاٹ سکتا ہوں۔“ فونٹی نے بے پرواہی سے جواب دیا۔

”اچھا! بڑے رومانٹک ہو رہے ہو۔۔۔ خیر تو ہے نا؟“ عالیہ اس کی بات سن کر مسکرائے گی۔ وہ اسے فونٹی کا مذاق ہی سمجھ رہی تھی۔

”عالیہ! میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔“ عالیہ نے اپنا تھیل زمین پر رکھا تو اس نے عالیہ کو دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا۔

”کیا۔۔۔؟ کیا کر رہے ہو فونٹی؟ مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا ہے۔“ عالیہ نے تیز لہجے میں کہا اور فونٹی کو اپنے سے دور کرنے لگی۔

”عالیہ! تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ اس نے عالیہ کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے کپاس کی ڈھیری پر ہی گرا لیا اور اس کے اوپر لیٹ گیا۔

عالیہ مزاحمت کرنے لگی لیکن اس کے مقابلے میں فونٹی ایک دیوہیکل افریقی تھا۔ وہ پینتالیس کلو کی ایک نازک سی لڑکی تھی جبکہ فونٹی سات فٹ کا ایک دیوہیکل تھا۔ عالیہ اس کے آگے مزاحمت کر رہی تھی لیکن اس نے عالیہ کو مکمل بے بس کر دیا تھا۔ اس نے عالیہ کے دونوں ہاتھ اس کی پشت کے پیچھے کئے اور اس کے اوپر لیٹ گیا۔ عالیہ اس کے نیچے بڑی مزاحمت کر رہی تھی۔ وہ چیخنا چاہتی تھی لیکن فونٹی نے اس کا منہ بند کیا ہوا تھا۔ عالیہ کافی دیر تک مزاحمت کرتی رہی لیکن فونٹی اسے ایک انچ بھی حرکت نہیں کرنے دے دیا تھا۔ اس نے عالیہ کے چہرے کو چومنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ نیچے کی طرف آنے لگا۔

عالیہ مسلسل مزاحمت کر رہی تھی لیکن فونٹی کو کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ عالیہ کو زیادہ سے زیادہ تھکانا چاہتا تھا۔ عالیہ تھک جاتی تو اس کی مزاحمت بھی دم توڑ جاتی اور فونٹی یہی چاہتا تھا۔ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہو رہا تھا۔ دس پندرہ منٹ کی مسلسل مزاحمت نے عالیہ کو مکمل تھکا دیا تھا۔ اس سے ہلکی سی حرکت بھی اب نہیں ہو رہی تھی۔ فونٹی نے اپنی گرفت ہلکی کی اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ دوسری طرف عالیہ کو گنے کافی دیر ہو گئی تو فلورین اس کی فکر کرنے لگی۔

”ایلی! عالیہ کافی دیر سے گئی ہے، ابھی تک واپس نہیں آئی ہے۔“ فلورین مجھ سے پوچھنے لگی۔

”فلورین! وہ بے چاری تھک گئی ہوگی اور کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوگی۔ تم کیوں اس کے لئے پریشان

ہورہی ہو؟“ میں نے نارمل لہجے میں کہا۔

”یار! پریشان ہونے والی بات تو ہے نا؟ فونٹی بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا ہے۔۔۔“ فلورین نے پر خیال انداز سے میری طرف دیکھا اور اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”فیلی! بکواس مت کرو، عالیہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔ میں اسے پچھلے ڈیڑھ سال سے دیکھ رہا ہوں۔ وہ انتہائی شریف لڑکی ہے۔“ میں نے غصے سے جواب دیا۔

”اچھا! تم عالیہ کو اتنا کیسے جانتے ہو؟“ اس نے پھر سوال کیا۔

”فیلی! میرے پاس تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں ہے۔ تمہیں شک ہے تو جا کر دیکھ لو، مجھے عالیہ پر اعتماد ہے۔“ میں چٹائی کرنے لگا۔

”ارے! ہمیں کیا ضرورت ہے پیچھا کرنے کی؟ دونوں جوان ہیں اگر دس منٹ اکٹھے گزار لیتے ہیں تو کیا فرق پڑتا ہے؟“ اس بار فیلیکس نے گفتگو میں حصہ لیا۔ وہ ان دونوں پر الزام لگا رہے تھے۔

”فیلیکس بھائی! آپ مجھ سے بڑے ہیں اس لئے میں آپ کا لحاظ کرتا ہوں۔۔۔ پلیز! عالیہ کے متعلق ایسا کچھ مت کہیں ورنہ۔۔۔“ میں نے غصے سے ان کی طرف دیکھا اور دوبارہ چٹائی کرنے لگا۔

”ورنہ کیا ایلی! ورنہ کیا کر لو گے؟“ انہوں نے مجھے بازو سے پکڑ کر غصے سے پوچھا۔

”ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ آپ میرے بھائی ہو۔“ میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

”چلو کوئی بات نہیں، نو مہینے بعد پتہ چل جائے گا جب ایک چھوٹا فونٹی بھی اس دنیا میں آجائے گا۔ کیوں فلورین! چھوٹا فونٹی آئے گا یا چھوٹی عالیہ؟“ فیلیکس نے فلورین کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ان کے لہجے میں چھپا ہوا طنز مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا۔

”فیلیکس! آپ کو کیا تکلیف ہے؟ جو بات کرنی ہے وہ سیدھی مجھ سے کرو نا؟“ میں نے انہیں گریبان سے پکڑ لیا۔

”اس بے چاری معصوم سی لڑکی کی تم لوگوں نے زندگی اجیرن کر کے رکھ دی ہے۔“ میں نے چنگھاڑتے ہوئے کہا۔

”ایلی! یہ غلط بھی تو نہیں کہہ رہے ہیں۔۔۔ تمہارے سر پر تو محبت کا بھوت سوار ہے اس لئے تمہیں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اس دو ٹکے کی غلام لڑکی کے لئے آج تم اپنے بڑے بھائی کا گریبان پکڑ کر کھڑے ہو گئے

ہو؟“ فلورین نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ سے فیلکس کا گریبان چھڑواتے ہوئے کہا۔
 ”فلورین! وہ دو ٹکے کی غلام نہیں ہے، ایک جیتی جاگتی انسان ہے اور انتہائی شریف ترین لڑکی ہے۔“
 میں نے غصے سے کہا۔

”اچھا؟ تم تو اندھے ہو گئے ہو، تمہیں پتہ ہی نہیں ہے کہ وہ کیا کیا گل کھلا رہی ہے۔ میں نے درجنوں بار ان دونوں کو علیحدگی میں ایک دوسرے کے گلے لگتے اور چومتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ اتنے صاف کردار کی لڑکی نہیں ہے۔ پتہ نہیں کتنے لوگوں کے ساتھ منہ کالا کر چکی ہے۔“ فلورین نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔
 ”ایلی صاحب! تم ابھی بچے ہو، تمہیں ان عورتوں کا پتہ نہیں ہے۔ ان کا کبھی بھی کسی ایک مرد سے دل نہیں بھرتا۔ میری ایک عمر ہو گئی ہے ان کھیتوں میں پھرتے پھراتے۔۔۔ میں ان سیاہ فام عورتوں کی ایک ایک رگ سے واقف ہوں۔ یہاں چنائی کرنے والی کوئی ایک عورت بھی ایسی نہیں ہے جس کے ساتھ میں نے اچھا ٹائم نہ گزارا ہو۔ عالیہ اس لئے بچی تھی کیونکہ اسے سیشل تمہارے لئے چھوڑا گیا تھا لیکن وہ فونٹی کے ساتھ منہ کالا کر رہی ہے۔“ فیلکس نے ایک بار پھر بولنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے گلے کو بھی مسل رہا تھا۔ میں نے اس کے گریبان کو پکڑ کر غصے سے کافی جھٹکے دیئے تھے اس لئے اس کا گلہ لال ہو گیا تھا۔

”تم لوگوں کی ذہنیت ہی گندی ہے۔ تم تو اپنے گھر کے علاوہ باہر کی ہر لڑکی کو ہی غلط نظر سے دیکھتے ہو، لیکن میں تمہارے جیسا نہیں ہوں۔“ میں دوبار اس کا گریبان پکڑ لیا۔

”ایلی اپنے بھائی پر غصہ کیوں نکال رہے ہو؟ جو سچ ہے اس سے آنکھیں ملانے کی تم میں ہمت نہیں ہے اور الٹا ہمیں ہی گندہ کہہ رہے ہو؟“ فلورین ایک بار پھر ہم دونوں کے درمیان میں آ گئی۔

”اچھا؟ یہ بات ہے تو میں دکھاتا ہوں تم لوگوں کو کہ عالیہ کتنی پاک باز لڑکی ہے اور تمہاری ذہنیت کتنی گندی ہے۔“ میں نے فلورین کا بازو پکڑا اور اسے تقریباً گھسیٹا ہوا اپنے ساتھ لیکر بادام کے درخت کی طرف جانے لگا۔ فیلکس بھی ہمارے پیچھے پیچھے آنے لگا۔

جیسے ہی ہم نے کھیت کر اس کیا اور درخت کے قریب پہنچے، ہمیں فونٹی اور عالیہ دونوں قابل اعتراض حالت میں کپاس پر لیٹے نظر آ گئے۔ عالیہ بالکل آرام سے اس کے نیچے لیٹی ہوئی تھی اور فونٹی اپنے شیطانی کھیل میں مصروف تھا۔ عالیہ مزاہمت کر کر کے بالکل تھک چکی تھی اس لئے آرام سے لیٹی ہوئی تھی اور اچانک آنے والے کو ایسے لگ رہا تھا کہ وہ دونوں اپنی مرضی سے یہ سب کچھ کر رہے ہوں۔ ان لوگوں کا مقصد پورا

ہو چکا تھا۔ میں نے دونوں کو قابل اعتراض حالت میں دیکھ لیا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ میں نے لڑکھڑاتے ہوئے فلورین کا سہارا لینا چاہا لیکن ناکام رہا اور نیچے زمین پر گر گیا۔

”اوہ بے غیر تو! تمہیں بالکل شرم نہیں آتی؟ یہ سب کچھ کرتے ہوئے تم نے ہمارے بھائی ایلہی کا بھی لحاظ نہیں کیا؟ اپنے مالک کا بھی احساس نہیں کیا؟“ فلیلیکس نے مصنوعی غصے سے چلاتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے زمین پر لیٹے ہوئے فونٹی اور عالیہ کو ٹھڈے مارنے شروع کر دیئے۔

مسلم پہریدار بھی قریب ہی موجود تھے۔ انہوں نے بھائی کے چلانے کی آواز سنی تو وہ بھی وہاں پہنچ گئے اور ان سب نے مل کر فونٹی اور عالیہ کو مارنا شروع کر دیا۔ میں ان سب باتوں سے بے نیاز بے ہوش ہو چکا تھا۔ مجھے عالیہ کی بے وفائی پر رتی برابر بھی شک نہیں تھا لیکن یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر مجھ سے برداشت نہیں ہوا اور میں وہیں گر کے بے ہوش ہو چکا تھا۔ مجھے بہت بڑا ذہنی صدمہ لگا تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں عالیہ کی ایک مقدس تصویر بنائی ہوئی تھی لیکن آج ان دونوں کو اس حالت میں دیکھ کر میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ فلورین میرے نزدیک بیٹھی مجھے ہوش دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے سب کی آوازیں سنائی دے رہی تھی لیکن میرے ہاتھ پیر جواب دے چکے تھے۔ میں اٹھنا چاہتا تھا لیکن اٹھ نہیں سکتا تھا۔ عالیہ نے آج میری محبت کا خون کر دیا تھا۔

”کیا ہوا ہے؟“ مجھے یکدم ابو کی آواز سنائی دی۔ وہ بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔

”ابا! فونٹی عالیہ کے ساتھ پکڑا گیا ہے۔ یہ دونوں بے غیرت اپنا منہ کالا کر رہے تھے۔“ مجھے فلیلیکس بھائی کی آواز آئی۔ ابو نے ان سے پوچھا تھا اور وہ ابو کو صورتِ حال بتا رہا تھا۔

”فونٹی! تم انتہائی گھٹیا ترین انسان ہو۔۔۔ یہاں اس ڈیرے پر درجنوں عورتیں ہیں لیکن پھر بھی تجھے عالیہ ہی ملی تھی اپنا منہ کالا کرنے کے لئے؟“ ابو نے بھی اسے ٹھڈے مارنے شروع کر دیئے۔

”مالک! غلطی ہو گئی ہے مجھے معاف کر دیں۔“ فونٹی دونوں ہاتھ جوڑے ابو سے معافی مانگنے لگا۔

”نہیں! تم دونوں معافی کے قابل نہیں ہو۔۔۔ تمہیں ایک پل کے لئے بھی میرے بیٹے کا خیال نہیں آیا؟ تمہیں معلوم بھی تھا کہ یہ تمہارے مالک کی امانت ہے لیکن تم نے پھر بھی اس کے ساتھ منہ کالا کیا؟“ ابو اسے اور زور زور سے ٹھڈے مارنے لگے۔

دوسری طرف فلیلیکس بھائی نے عالیہ کو کوڑے مارنے شروع کر دیئے۔ عالیہ پہلے ہی فونٹی کے ساتھ

زور لگا لگا کر ادھ موٹی ہو چکی تھی۔ فلیکس بھائی کے ٹھڈوں اور پھر کوڑوں نے اسے بالکل ہی ادھ مرا کر دیا تھا۔ اس کی آواز بھی حلق سے نہیں نکل رہی تھی۔ وہ شاید معافی مانگنا چاہتی تھی، اپنی زندگی کی بھیک مانگنا چاہتی تھی لیکن مسلسل برستے ہوئے کوڑے اسے لمحہ لمحہ موت کے قریب لیکر جا رہے تھے۔ وہ بار بار بے ہوش ہو رہی تھی اور بار بار ہوش میں آ رہی تھی۔ مسلسل برستے ہوئے کوڑوں نے اس کا سارا جسم ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کا پورا جسم ہی خون سے لٹھڑ چکا تھا۔ وہ درد کی زیادتی سے بے ہوش ہوئی تھی اور کوڑے کی ضرب سے دوبارہ ہوش میں آ جاتی تھی۔ فلورین میرے اوپر جھکی مسلسل مجھے ہوش دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں ہوش میں تھا لیکن ہلنے جلنے سے قاصر تھا۔

”مالک! غلطی ہو گئی ہے معاف کر دو! دوبارہ ایسا نہیں کروں گا۔“ فونٹی مسلسل معافیاں مانگ رہا تھا۔
 ”نہیں! تم نے غلطی نہیں کی ہے۔۔۔ تمہیں معلوم تھا کہ یہ بے غیرت عالیہ تمہارے مالک کی پسند ہے لیکن پھر بھی تم دونوں نے منہ کالا کر کے ہماری غیرت کو لکا رہا ہے۔ تم دونوں کسی بھی رحم کے قابل نہیں ہو۔“ ابا نے مسلح پہریدار کے ہاتھ سے بندوق لی اور اسے فونٹی کی طرف تان لیا۔

”مالک! معاف کر دو۔۔۔“ فونٹی نے رحم دلانہ نظروں سے مالک کی طرف دیکھا۔
 ”نہیں! تم دونوں کی سزا صرف اور صرف موت ہے۔“ انہوں نے فونٹی کے سر پر بندوق کی نال رکھی اور ٹریگر دبا دیا۔

ٹھاہ کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی گولی فونٹی کے سر کو پھاڑتے ہوئے نکل گئی۔ اس کا سر ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ وہ مر گیا تھا۔ ایک اچھی اور بہتر زندگی کے لالچ میں وہ اپنی غلامی کی زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ وہ بڑے سفید چمڑی والے لوگوں کی بڑی سیاست کی نظر ہو چکا تھا۔
 ”تم دونوں کی سزا صرف اور صرف موت ہے، تم سیاہ فام اسی کے حقدار ہو۔“ ابو نے ایک نفرت انگیز نظر اس کے مردہ جسم پر ڈالی اور پھر عالیہ کے طرف دیکھا۔

رائفل کی آواز نے اسے بھی ہوش دلادی تھی۔ بھائی نے کوڑے مارنا بند کر دیئے تھے۔ ابو نے رائفل سے خالی خول نکال کر باہر پھینکا اور پہریدار کی طرف دوسری گولی لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ پہریدار نے گولی ابو کے ہاتھ پر رکھی تو انہوں نے اسے رائفل میں ڈالا اور دوبارہ کاک کر لیا۔ اس زمانے میں آٹومیٹک رائفل نہیں ہوتی تھی۔ ابو نے رائفل کی نال اس بار عالیہ کی طرف کی۔ عالیہ زمین پر پڑی زخموں سے چوران

کی طرف دیکھ رہی تھی۔ عالیہ کی آنکھوں میں خوف کی ایک ہلکی سی جھلک بھی نہیں تھی۔ وہ ابو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اپنی موت کا انتظار کر رہی تھی۔ ہندوستانی غیرت اتر دکھا رہی تھی۔ وہ زندگی کی بھیک مانگنے کی بجائے مرنا پسند کر رہی تھی۔ ابو نے رائفیل کے ٹریگر پر انگلی رکھی۔ عالیہ مرنے لگی تھی، مجھے اچانک ایک جھٹکا لگا۔ میں تڑپ کر اٹھا اور زمین پر پڑی عالیہ اور ہندوق کی نال کے درمیان آ گیا۔

”ابا! عالیہ کو معاف کر دو۔“ میں نے لڑکھڑاتے ہوئے کہا۔

”نہیں ایلی! تم ایک سائیڈ پر ہو جاؤ، اس کا جرم بہت بڑا ہے۔ اس کی سزا صرف اور صرف موت ہے۔“ ابو نے گرجدار آواز میں کہا۔ وہ غصے سے چنگھاڑ رہے تھے۔

”پھر بھی ابو! عالیہ کو معاف کر دو، میں اسے مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔“ میں نے عالیہ کو چھوڑ دینے کا کہا۔

”ایلی! ایک سائیڈ پر ہو جاؤ۔ آج اگر اسے معاف کر دیا تو کل کو یہ سب میرے گریبان تک آ جائیں گے۔ ان دونوں نے آج ہماری غیرت کو لاکرا ہے۔ اس کا عاشق تو مرچکا ہے اب اس کی باری ہے۔“ ابو نے مجھے ایک سائیڈ پر دھکا دیا۔ وہ آج ہر حالت میں عالیہ کو مارنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ان سب کا اصل مقصد ہی عالیہ کی موت تھی۔ ایک عالیہ کے مرجانے سے سارے معاملات سیدھے ہو جاتے اور وہ آج اس معاملے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہتے تھے۔

”ابا! عالیہ کو معاف کر دو، آپ کا بیٹا اسے مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔۔۔ یہ مرگئی تو میں بھی مر جاؤں گا۔“ میں نے ابو کے پیر پکڑ لیے۔

”ایلی! یہ لڑکی ایک دوسرے لڑکے کے ساتھ منہ کالا کرتے ہوئے پکڑی گئی ہے، تم نے اپنی آنکھوں سے اسے فونٹی کے ساتھ دیکھا ہے لیکن پھر بھی۔۔۔“ انہوں نے اپنی بات درمیان میں ادھوری چھوڑی اور میری طرف غصے سے دیکھنے لگے۔ میں ان کے پیروں میں بیٹھا عالیہ کی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ اس عالیہ کی زندگی کی بھیک جو ابھی تھوڑی دیر پہلے میری ہی آنکھوں کے سامنے فونٹی کے ساتھ منہ کالا کر رہی تھی۔

”ایلی! تم انتہائی گھٹیا ترین اور بے غیرت ترین انسان ہو۔۔۔ مجھے آج تمہیں اپنا بیٹا کہتے ہوئے بھی شرم محسوس ہو رہی ہے۔“ انہوں نے انتہائی نفرت سے مجھے لات ماری۔

”ابا! یہی عشق ہے جو پچھلے ڈیڑھ سال سے آپ کے بیٹے کو نچا رہا ہے۔“ میں نے ابا کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”ابا! آپ کو اندازہ بھی نہیں ہے کہ آپ کا بیٹا اس عالیہ سے کتنی محبت کرتا ہے۔ میں اسے مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔“ میں دونوں ہاتھ جوڑے گھٹنوں کے بل ان کے سامنے بیٹھا عالیہ کی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔

”ایلی یہ۔۔۔“ انہوں نے غصے سے مجھے پکارا۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتے تھے لیکن میں ان کی بات درمیان سے کاٹ دی۔

”ابا! یہ جیسی بھی ہے اچھی ہے یا بری ہے میں اسے مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔“ میری آنکھوں سے آنسو آ گئے۔

”ٹھیک ہے پھر! اسے سزا تو ضرور ملے گی۔۔۔ تمہیں اسے بھولنا ہوگا، فلورین سے شادی کرنی ہوگی اور واشنگٹن جانا ہوگا؟ تمہیں وہی ایلی بننا پڑے گا جو اس عالیہ سے پہلے تھے؟“ ابا نے شرط رکھی۔

”مجھے منظور ہے ابا! آپ جو کہو گے مجھے قبول ہے۔ بس! اسے زندہ رکھیں۔“ میرے ہاتھ ابھی تک ابو کے سامنے بندھے ہوئے تھے۔

”ٹھیک ہے ایلی! یہ زندہ رہے گی لیکن آج کے بعد تم اس کے کسی بھی معاملے میں دخل اندازی نہیں کرو گے۔“ ابا نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو میں نے ان کے فیصلے کے آگے سر جھکا لیا۔ عالیہ کی زندگی بچ گئی تھی اور میں بس یہی چاہتا تھا۔

”فیلیکس! اسے لیکر ڈیرے پر پہنچو! باقی غلاموں کو بھی چھٹی دے دو اور ان سب کو ڈیرے پر لیکر آ جاؤ۔ میں آج ان غلاموں کو بتانا چاہتا ہوں کہ جو بھی میرے خلاف جائے گا اس کا انجام کیا ہوگا۔“ ابو نے فیلیکس کو کہا اور گھوڑے پر بیٹھ کر دوسرے کھیت کی طرف چلے گئے۔

انہوں نے آج سب غلاموں کو چھٹی دے دی تھی۔ عالیہ اور فونٹی دونوں کو ڈیرے پر پہنچا دیا گیا۔ فونٹی تو بے چارہ اسی وقت مارا جا چکا تھا۔ انہوں نے فونٹی کی لاش کو ہی درخت کے ساتھ لٹکا دیا اور اسی درخت کے تنے کے ساتھ عالیہ کو بھی باندھ دیا گیا۔ تالاب کے کنارے لگے ہوئے درخت کے تنے کے ساتھ عالیہ کو باندھا گیا تھا اور ایک کوڑا بردار آدمی اسے کوڑوں سے مار رہا تھا۔ سارے غلام اس وقت صحن میں کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ عالیہ کی چیخیں اس وقت پورے ڈیرے پر گونج رہی تھیں۔

چمڑے کے بنے ہوئے کوڑے کوتیل میں رکھ کر سکھایا گیا تھا۔ وہ جدھر بھی پڑتا تھا وہاں سے پوری کھال ہی ادھیڑ کر رکھ دیتا تھا۔ کوڑے کی شرٹاپ شرٹاپ کی آواز کے ساتھ عالیہ کی چیخیں بھی مسلسل آرہی

تھیں۔ میں ان سب سے دور ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے ہوئے تھے لیکن عالیہ کی چیخیں میرے دماغ میں گھس رہی تھیں۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر میرے گالوں پر لکیریں بنا رہے تھے۔ میں بھی عالیہ کے ساتھ ساتھ ہی تڑپ اور سسک رہا تھا۔ مار عالیہ کو پڑ رہی تھی لیکن اس کا اثر مجھ پر ہو رہا تھا۔ رورو کر میرا گلا خشک ہو چکا تھا۔ فلورین میرے ساتھ بیٹھی مجھے دلا سے دے رہی تھی۔ وہ بار بار میرے گالوں پر آنے والے آنسوؤں کو پونچھ رہی تھی لیکن میری آنکھوں میں تو ایسے جیسے سمندر ہی اٹڈا یا تھا جو ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

”ایلی! چھوڑ دو یار! اب بس کرو، کیوں ایک بے وفا لڑکی کی خاطر اپنی زندگی کو روگ لگا رہے ہو؟“
فلورین مجھے چپ کر رہی تھی۔

”ایلی! چپ کر جاؤ یار! تمہارے اس دکھ نے مجھے بھی رُلا دیا ہے۔“ وہ مجھے اپنے سینے سے لگا رہی تھی۔

”ایلی! بھول جاؤ اسے۔۔۔ میں تمہیں اس سے کہیں زیادہ پیار دوں گی۔ میں تمہیں کبھی دکھی نہیں ہونے دوں گی۔“ وہ مسلسل بول رہی تھی لیکن میرے کان تو عالیہ کی طرف لگے ہوئے تھے۔
عالیہ کی چیخیں میرے کانوں کے پردے پھاڑ کر میرے دماغ میں گھس رہی تھیں۔ آخر یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر ہو گیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا عالیہ کے پاس چلا گیا۔ کوڑا بردار غلام ابھی تک عالیہ کو مار رہا تھا۔ میں جا کر عالیہ سے لپٹ گیا۔ کوڑا ہوا میں لہرایا اور ایک زوردار آواز شراب کے ساتھ میرے جسم پر پڑا اور خون کے چھینٹے اڑ کر دور تک جا گرے۔ غلام بروقت اپنے ہاتھ کو روک نہیں سکا تھا۔ اس کا کوڑا میری پشت پر پڑا تھا اور وہاں سے گوشت اکھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کی نظر جیسے ہی میری زخمی پیٹھ پر پڑی تو اس کے ہاتھ سے کوڑا گر گیا اور اس نے جلدی سے میرے پیر پکڑ لئے۔

”معاف کر دیں مالک! مجھ سے غلطی ہو گئی۔“ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میں اس سے بے پروا عالیہ کے ساتھ لپٹا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر کپڑے نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور اس کا پورا جسم لہو لہان تھا۔ وہ درد کی شدت سے کانپ رہی تھی۔

”ایلی! ایک سائیڈ پر ہو جاؤ، آج اسے اس کے کئے کی سزا ملے گی۔“ ابونے لات مار کر غلام کو دور ہٹایا اور خود کوڑا پکڑ لیا۔ غلام ابونے کی لات کھا کر دور گرا اور دور بھاگ کر باقیوں کے ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں ایک

بارپھر ابو اور عالیہ کے درمیان آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”ابا! بس کر دیا پھر مجھے جان سے مار دو اور پھر اس کے بعد جو دل ہے وہ کرو۔“ میں نے اپنے دونوں ہاتھ ابو کے سامنے جوڑے اور خاموش ہو گیا۔ وہ کچھ دیر تک میری طرف دیکھتے رہے اور پھر کوڑا پھینک کر چلے گئے۔

میں نے ہمت کر کے عالیہ کو زنجیروں سے آزاد کیا۔ وہ وہیں زمین پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی زمین پر بیٹھ گیا اور چاروں طرف کھڑے لوگوں کی طرف بے بسی سے دیکھنے لگا۔ وہ سب غلام بھی عالیہ کی حالت پر ترس کھا رہے تھے لیکن وہ مجبور تھے۔ وہ سب غلام تھے اور اپنے آقا کے حکم سے روگردانی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ عالیہ کا درد محسوس تو کر سکتے تھے لیکن اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔

”پیٹر! جاؤ اور عالیہ کو اٹھا کر اندر کمرے میں لے جاؤ، اس کے زخموں پر مرہم بھی لگا دینا۔“ بڑے بھائی نے پیٹر سے کہا تو وہ جلدی سے آگے بڑھا۔ اس نے ایک اور غلام کو ساتھ لیا اور دونوں عالیہ کو اٹھا کر اندر کمرے میں لے گئے۔

میں عالیہ کے ساتھ ساتھ ہی معمول کی طرح چل رہا تھا۔ انہوں نے عالیہ کو ایک بستر پر لٹایا اور اس کے زخموں پر مرہم لگانے لگے۔ عالیہ زخموں کی شدت سے بے ہوش ہو چکی تھی۔ میں ایک بار پھر کمرے کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور عالیہ کی طرف دیکھنے لگا۔ فلورین بھی میرے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

”ایلی! ان بے وفائوں کے ساتھ دل نہیں لگاتے، یہ کبھی کسی ایک کی ہو کر نہیں رہ سکتیں۔“ اس نے میرے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

”فلورین! عشق کبھی بے وفا نہیں ہوتا، عشق صرف عشق ہوتا ہے۔“ میں نے ایک ہاتھ سے اپنے آنسو صاف کئے اور زخموں سے چور تڑپتی ہوئی عالیہ کی طرف دیکھنے لگا۔

مجھے اب بھی اس بے وفا عالیہ سے عشق تھا۔ اگلے ایک مہینے تک عالیہ ایسے ہی بستر پر پڑی رہی اور میں اس کے ساتھ ساتھ ہی رہا۔ میں نے عالیہ کی خدمت اور تیمارداری میں کوئی کسر بھی نہیں چھوڑی تھی۔ ابو اور فلورین مجھے مسلسل گھر جانے کا کہتے رہتے تھے لیکن میں نے ان سب کو نظر انداز کر دیا تھا۔ میں نے ابو سے عالیہ سے دور رہنے اور فلورین سے شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن میں اس وعدے سے مکر گیا تھا۔ ابو اور فلورین دونوں مجھے میرا وعدہ یاد دلاتے تھے لیکن میں سب کچھ بھول چکا تھا۔ مجھے عالیہ کے علاوہ اور کوئی بھی

نظر نہیں آتا تھا۔

”ایلی! تم اپنے وعدے سے پھر گئے ہو!“ فلورین اکثر مجھ سے کہتی تھی اور میں ہمیشہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے کہ فلسفے پر عمل کرتا تھا۔

مجھے عالیہ کے علاوہ اور کوئی نظر ہی نہیں آتا تھا۔ عالیہ ایک مہینے تک بالکل ٹھیک ہو گئی اور اپنے پیروں پر چلنے پھرنے لگی تھی۔ میں ایک بار پھر اس سے محبت کی بھیک مانگنے لگا تھا اور وہ پھر انکار کر رہی تھی۔ مجھے اس انکار کی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ میرے گھر والوں نے تنگ آ کر مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ میں اب دن بدن چڑچڑاسا ہو گیا تھا۔ عالیہ مجھے فلورین سے شادی کرنے اور واشنگٹن جانے پر زور دیتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں واشنگٹن چلا جاؤں اور سیاہ فام غلاموں کے لئے کچھ کروں۔

”عالیہ! میں تم سے عشق کرتا ہوں اور تمہارے علاوہ کسی اور کا خیال بھی نہیں لاسکتا۔“ وہ گائے کا دودھ دھونے کے لئے باڑے میں آئی تھی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے باڑے میں آ گیا تھا اور اسے پکڑ لیا تھا۔

”ایلی! مجھے تم سے کوئی محبت نہیں ہے۔“ وہ واپس مڑنے لگی لیکن میں نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔

”عالیہ! کیوں مجھے اور اپنے آپ کو سزا دے رہی ہو؟ تم صرف ایک بار میری محبت کا اقرار کر لو میں تمہیں آزاد بھی کر دوں گا اور شادی بھی کروں گا۔“ میں نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”ایلی! امریکی معاشرہ سفید فام مالک کی شادی ایک غلام سیاہ فام سے نہیں ہونے دے گا۔ ہم دونوں کبھی بھی ایک نہیں ہو سکتے۔“ اس نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”عالیہ! تم ایک بار اقرار تو کرو، میں کوئی نہ کوئی راستہ نکال لوں گا۔ ہم دونوں بھاگ کر ہندوستان چلے جائیں گے۔“ میں نے اس کے چہرے کو چومتے ہوئے کہا۔

”ایلی! میں ہندوستان نہیں جانا چاہتی میں یہی امریکہ میں رہنا چاہتی ہوں۔“ وہ ہاتھ چھڑا کر جانے لگی لیکن میں نے پھر پکڑ لیا۔

”عالیہ! میں تمہارے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتا، اگر تم مجھے نہ ملی تو میں مرجاؤں گا لیکن کسی اور کا نہیں ہونے دوں گا۔“ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔

”ایلی صاحب! ابھی بہت کچھ ہو آپ، جان دینا بہت بڑی بات ہے۔“ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور واپس گائے کی طرف مڑ گئی۔ میں غصے سے باہر نکلا اور سنٹور روم میں چلا گیا۔ وہاں

چوہوں کو مارنے کے لئے گولیاں پڑی ہوئی تھیں، میں نے گولیاں اٹھالیں اور پانی کی تلاش میں دائیں بائیں نظر دوڑانے لگا۔

”پانی ڈھونڈ رہے ہو ایللی؟“ عالیہ اچانک کمرے میں داخل ہوئی اور پوچھنے لگی۔ اس نے میرے ہاتھ میں چوہے مار گولیاں دیکھ لی تھیں۔ یہ خشک اور کڑوی گولیاں تھیں جو بغیر پانی کے نہیں پی جاسکتی تھی۔ ہم انہیں پیس کر مکھن میں ڈالتے تھے۔ اس زمانے میں میٹھی گولیاں نہیں ہوتی تھیں بلکہ بہت کڑوی ہوتی تھیں۔ ”تمہیں اس چیز سے کیا ہے۔۔۔ تمہاری تو جان چھوٹ جائے گی؟“ میں دوبارہ دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

”صحیح کہتے ہو۔۔۔ میری تو جان چھوٹ جائے گی، میں پانی لیکر آتی ہوں۔“ وہ باہر گئی اور ایک منٹ بعد ہی پانی کا ایک پیالہ لیکر آ گئی۔ میں ابھی تک وہیں سنور روم میں ہی کھڑا تھا۔ میں پانی کا پیالہ دیکھ کر اس کی طرف بڑھا۔

”عالیہ! میں عشق کی اس انتہا تک پہنچ چکا ہوں جہاں سے واپسی ممکن ہی نہیں ہے۔ تم نہیں تو یہ زندگی ہی فضول اور بے معنی ہے۔ شاید میرے مرنے کے بعد ہی تمہیں یقین آ جائے کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا تھا۔“ میں نے پانی کا پیالہ لینے کے لئے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور اس سے پیالہ پکڑ لیا۔

”عالیہ! مجھے تم سے محبت ہے۔“ میں نے عالیہ سے کہا اور گولی منہ میں ڈالنے لگا۔ جیسے ہی میرا ہاتھ منہ کے قریب گیا۔ اس نے ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر مار دیا۔ تھپڑ انتہائی قوت سے مارا گیا تھا۔ میں تھپڑ کے زور سے دو قدم پیچھے چلا گیا تھا۔ پانی کا پیالہ نیچے گر کر ٹوٹ گیا تھا۔

”ایلی! یہ محبت نہیں ہے بلکہ یہ بزدلی ہے۔ خودکشی کر کے تم کو نسا محبت حاصل کر لو گے؟“ اس نے غصے سے کہا۔

”عالیہ! میں صرف اس درد سے نجات چاہتا ہوں۔ میں مرنا نہیں چاہتا، میں صرف اس درد کو مارنا چاہتا ہوں جو چومیس گھنٹے میرے سینے میں ہوتا رہتا ہے۔ میں صرف اس درد کو مارنا چاہتا ہوں۔“ میں وہیں زمین پر بیٹھ کر رونے لگ گیا۔ میں اس عشق کی آگ میں جلتے جلتے بالکل ہی راکھ ہو چکا تھا۔

”ایلی! میں شادی شدہ ہوں۔ افریقہ سے ہم دونوں میاں بیوی کو اغوا کیا گیا تھا۔ عاکون کو پہلے ہی ایک زمیندار خرید کر لے گیا تھا جبکہ مجھے بعد میں آپ خرید کر لے آئے تھے۔“ عالیہ نے میرے پاس بیٹھتے

ہوئے کہا۔ وہ شادی شدہ تھی، میں اس کی بات سن کر شاک میں آ گیا۔

”تم نے یہ سب کچھ پہلے کیوں نہیں بتایا؟“ میں نے سوال کیا۔

”ایلی! میں تمہیں بتانا چاہتی تھی لیکن تم نے کبھی موقع ہی نہیں دیا اور ویسے بھی ہم غلاموں کی شادیاں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔“ اس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”عالیہ! یہ ٹھیک نہیں ہے۔ تم نے آج تک مجھے اندھیرے میں رکھا ہے۔“ میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

”ایلی! میں چاہتی تھی کہ تم چار دن میرے ساتھ گزارو اور پھر فلورین سے شادی کر کے واشنگٹن چلے جاؤ۔ ایلی! میں تمہیں غلامی کی زندگی دکھانا چاہتی تھی تاکہ تم ہم مظلوموں کے لئے کچھ کر سکو۔ میں تمہیں پہلے دن ہی اگر اپنی شادی کا بتا دیتی تو پھر تم کبھی بھی میرے لئے یہاں تک نہ آتے۔ میں چاہتی تھی کہ تم میرے پیچھے آؤ، مجھ سے محبت کرو، چار دن میرے ساتھ گزارو اور فلورین سے شادی کر کے واشنگٹن چلے جاؤ۔“ اس نے میرے کندھے پر اپنا سر رکھ لیا۔

”عالیہ! میں ایک کمزور سا انسان ہوں، میں اس پورے سسٹم کے خلاف کیسے لڑ سکتا ہوں؟ ہماری ساری زراعت ان غلاموں کے اوپر ٹکی ہوئی ہے۔ میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا۔ میں امریکہ کے ان بڑے بڑے زمینداروں سے لڑ کر تمہیں آزاد نہیں کروا سکتا۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”ایلی! میں تمہیں بارش کا پہلا قطرہ بننے کا کہہ رہی ہوں۔۔۔ تم کوشش تو کرو! لوگ تمہاری بات تو سنیں گے؟ ایک بار چنگاری جلے تو سہی۔۔۔ تمہاری نہیں تو تمہارے بعد آنے والے لوگوں کی بات سنیں گے۔ تم شروع کرو اختتام دوسرے لوگ آ کر کریں گے۔“ اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

”عالیہ! ان سب چیزوں کے درمیان میری محبت کدھر جائے گی؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایلی! محبت تو ہر کوئی ہی کرتا ہے۔ بہت سے لوگ اپنے محبوب کو حاصل بھی کر لیتے ہیں لیکن محبت کی کہانی وہی امر ہوتی ہے جو کسی کے کام آتی ہے۔ ایلی! محبت ہمیشہ قربانی مانگتی ہے۔ ہم غلاموں کے لئے قربانی دے دو تو تمہارا عشق ناقیمت امر ہو جائے گا۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”عالیہ! میں عاکون کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“ میں نے اسے پیچھے سے پکارا۔

”پتہ نہیں وہ کہاں ہوگا، اتنے بڑے امریکہ میں تم اسے کہاں تلاش کرو گے؟“ وہ پھکی سی مسکراہٹ سے کہنے لگی۔

”عالیہ! میں اس خوش قسمت انسان کو دیکھنا چاہتا ہوں جو تمہاری زلفوں کی چھاؤں میں بیٹھا کرتا تھا۔ میں اس خوش نصیب کو دیکھنا چاہتا ہوں جو آج بھی تمہارے دل میں کہیں چھپا بیٹھا ہے۔“ میں اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

”ایلی! تم کیسے اسے تلاش کرو گے؟ پتہ نہیں وہ کہاں ہوگا، کس حال میں ہوگا۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ عاکون کی یاد نے عالیہ کو رلا دیا تھا۔ اس نے اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”عالیہ! یہ جو عشق ہوتا ہے نایہ صرف محبوب کی خوشی مانگتا ہے۔ تمہاری خوشی عاکون کے ساتھ ہے تو یہ ایلی تمہیں اس سے ضرور ملائے گا۔“ میں نے اس کو سٹور روم میں ہی چھوڑا اور باہر نکل آیا۔

ابو ڈیرے پر نہیں تھے، وہ گاؤں گئے ہوئے تھے۔ میں نے ایک گھوڑا لیا اور گاؤں پہنچ گیا۔ ابو گھر پر ہی موجود تھے۔ فلورین بھی ادھر ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ گھر والے مجھے اچانک دیکھ کر خوش ہو گئے۔ میں کوئی سال بعد آج گھر آیا تھا۔ میں ڈیرے جانے کے بعد دوبارہ کبھی گھر آیا ہی نہیں تھا۔

”ارے! میرا بیٹا ایلی گھر آ گیا ہے۔“ امی مجھے دیکھتے ہی جلدی سے میرے پاس آئی اور مجھے گلے سے لگانے لگی۔ میں امی سے مل کر ابو کے پاس آ گیا۔

”اچھا کیا ایلی بیٹا! شکر ہے اس عالیہ کا بھوت تمہارے سر سے اترا اور تم گھر واپس آ گئے۔“ ابو نے میرے کندھے پر تھکی دی اور مجھے گلے سے لگا لیا۔

”ابو! میں عالیہ کو لیکر کورپس کرسٹی جانا چاہتا ہوں۔۔۔ مجھے پیسے چاہئیں۔“ میں نے ابو سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔

”کیا۔۔۔؟ کیا کہا تم نے؟“ ابو نے الجھتے ہوئے پوچھا کہا۔

”ابا! میں عالیہ کو لیکر کورپس کرسٹی جانا چاہتا ہوں، مجھے پیسے چاہئیں۔“ میں نے من و عن اپنے الفاظ

دہرا دیئے۔

”میں نے تم سے زیادہ بے غیرت اور ذلیل لڑکا آج تک نہیں دیکھا ہے۔ وہ عالیہ جو کسی اور کے ساتھ

منہ کالا کر رہی تھی اسے اب تم واپس ہندوستان لیکر جانا چاہتے ہو؟“ ابو نے چیختے ہوئے کہا۔

”ایلی! میں تمہارے بغیر کیسے رہوں گی۔“ فلورین جلدی سے آگے آ کر کہنے لگی۔ وہ بے چاری بھی میرے علاوہ اور کسی کا خواب تک نہیں دیکھتی تھی۔

”ایلی! میرے پاس کوئی فالتو پیسہ نہیں ہے، دفع ہو جاؤ میری نظروں سے! میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔“ ابو نے مجھے گھر سے باہر دھک دیتے ہوئے کہا۔

”براؤن! کیا کر رہے ہو؟ جوان بیٹا ہے!“ امی جلدی سے آگے بڑھ کر مجھے روکنے لگی۔

”ڈیانا! یہ حرامی ہمارا بیٹا نہیں ہے۔ اس کو عالیہ کے علاوہ اور کوئی نظر ہی نہیں آتا ہے۔ اس نے کبھی اپنے بہن بھائیوں کا سوچا ہی نہیں ہے۔“ وہ میری طرف نفرت سے دیکھ رہے تھے۔

”میرے بچے! ہندوستان بہت خطرناک ملک ہے اور ہم سب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتے۔“ امی نے میرا بازو تھام رکھا تھا۔ میں نے آہستگی سے اپنا بازو چھڑوایا اور دوبارہ ابو کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

”میرے پاس تمہارے لئے کوئی پیسہ نہیں ہے۔۔۔ جاؤ اور اپنی مرضی کرو!“ انہوں نے مجھ سے منہ پھیر لیا۔

”ابا! عالیہ شادی شدہ ہے۔۔۔ وہ دونوں میاں بیوی افریقہ سے اغوا ہو کر آئے تھے اور کورپس کرسٹی میں الگ الگ بک گئے تھے۔ میں عالیہ کو لیکر کورپس کرسٹی جانا چاہتا ہوں تاکہ اس کے شوہر عاکون کو تلاش کر سکوں۔ ابا میں دونوں میاں بیوی کو ملانا چاہتا ہوں۔“ میں نے اس بار وضاحت سے کہا۔

”کیا۔۔؟ کیا عالیہ شادی شدہ ہے؟ اور تم اسے اس کے شوہر سے ملانا چاہتے ہو؟“ فلورین نے اٹکتے ہوئے کہا۔

”ہاں فلورین! میں عالیہ کو اس کے شوہر عاکون سے ملانا چاہتا ہوں۔“

”اگر عالیہ کو اس کا شوہر عاکون مل جائے گا تو پھر تمہاری محبت تو ختم ہو جائے گی اور تم واپس میرے پاس آ جاؤ گے؟“ وہ اب بھی انک انک کو بول رہی تھی۔

”فلورین! محبت کبھی ختم نہیں ہوتی، یہ محبت تو میرے مرنے کے بعد ہی ختم ہوگی۔ بس اتنا کہتا ہوں کہ میں واپس تمہاری زندگی میں آ جاؤں گا۔ محبت تو نہیں ہوگی لیکن بحر حال واپس تمہارے پاس آ ضرور جاؤں گا۔ امید ہے تم مجھے بغیر محبت کے بھی قبول کر لو گی؟“ میں نے فلورین کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے تو صرف ایلی چاہیے! محبت کے ساتھ یا محبت کے بغیر، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تو محبت کرتی ہوں نا؟ اور ایک دن میری محبت تمہیں بھی محبت کرنے پر مجبور کر دے گی۔“ فلورین نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”ابا! مجھے پیسے چاہئیں؟“ میں نے دوبارہ ابا سے سوال کیا۔

”بیٹا! کتنے پیسے چاہئیں تمہیں؟“ عالیہ کی شادی کا سن کر ابو کا غصہ بھی ختم ہو چکا تھا۔

”جتنے آپ دے سکتے ہیں۔“ میں نے مختصر کہا۔

”میرے پاس گھر میں پانچ ہزار ڈالر کے قریب پڑے ہیں۔۔۔ کیا بہت ہیں یا پھر مزید پیسوں کا بھی بندوبست کروں؟“ ابو نے سوال کیا۔

”بہت ہیں ابو! پانچ سو ڈالر تک غلام کی قیمت ہوتی ہے۔ دو گنا، تین گنا بھی لے لیں تو پھر بھی دو ہزار ڈالر کے قریب قریب بچ دیں گے۔“ میں نے ابو سے کہا۔

”ایلی! میں ابھی گھر سے مزید پیسے لیکر آتی ہوں، ابو کے پاس بہت پیسے ہیں۔ تم جیسے بھی ہو عاکون کو لازمی خرید کر لانا۔“ فلورین نے جلدی سے کہا اور اپنے گھر کی طرف بھاگ گئی۔ ابو کمرے میں گئے اور گھر میں پڑے ہوئے سارے پیسے لیکر آ گئے۔

”ایلی بیٹا! اگر تم کہتے ہو تو میں بھی تمہارے ساتھ جاتا ہوں؟ مجھے ان غلاموں کے معاملات کی ڈیل کرنے کا کافی اندازہ ہے۔“ ابو نے رقم کا لفافہ مجھے پکڑاتے ہوئے کہا۔

”نہیں ابو! میں سنبھال لوں گا، آپ پریشان مت ہوں۔“ میں نے ابو کو انکار کر دیا۔

فلورین کا گھر ہمارے ہمسائے میں ہی تھا۔ دس پندرہ منٹ تک وہ بھی اپنے والد سر لیون کے ساتھ آ گئی۔ وہ اپنے ساتھ دس ہزار ڈالر کے قریب رقم لیکر آئے تھے۔ فلورین ان کی اکلوتی بیٹی تھی اور وہ اپنی بیٹی کے لئے سب کچھ کرنے کے لئے تیار تھے۔

”ایلی بیٹا! یہ میں ایک کارڈ اور خط دے رہا ہوں۔ تم اس خط کو لیکر پہلے آسٹن جاؤ اور وہاں کے میئر سے ملو۔ وہ تم کو ہماری پارٹی کا کارڈ بنا کر دیں گے۔ یہ کارڈ پورے امریکہ میں کہیں بھی لیکر جاؤ گے تو چلے گا۔ تم عاکون کے مالک زمیندار سے بات کرنا اور اگر نہ مانے تو پھر اس کارڈ کو لیکر تھانے شیرف کے پاس چلے جانا۔ ہماری پارٹی اس وقت اقتدار میں ہے۔ پولیس اور سول حکومت دونوں تمہاری مدد کریں گے اور تم عاکون کو حاصل کر لو گے۔“ سر لیون مجھے سمجھانے لگی۔

میں کافی دیر تک ان کی باتیں سنتا رہا اور پھر ان سے اجازت لیکر ڈیرے پر آ گیا۔ امی نے میرے کپڑوں کا ایک تھیلا بنا کر دے دیا تھا جس میں میرے کافی کپڑے موجود تھے۔ میری بہن ازبیلانے اپنے بھی دو کپڑوں کے جوڑے تھیلے میں رکھ دیئے تھے تاکہ عالیہ کے پہننے کے کام آجاتے۔ میں ڈیرے پر آیا، عالیہ کو اپنے ساتھ لیا اور ہم دونوں ایک ہیل گاڑی پر بیٹھ کر آسٹن شہر آ گئے۔ میں نے فلورین کے ابو کا دیا ہوا خط شہر کے میئر کو دیا تو اس نے مجھے اپنے سرکاری میئر والا ایک خط اور کارڈ بھی دے دیا۔ آسٹن شہر سے ہم بحری جہاز میں بیٹھے اور کورپس کرسٹی کی طرف روانہ ہو گئے۔

”عالیہ! یہ تھوڑے پیسے تم بھی اپنے پاس رکھو۔۔۔ سارے پیسے ایک جگہ پر اکٹھے رکھنا اچھی بات نہیں ہے۔“ میں نے پانچ ہزار ڈالر کے قریب رقم اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ میرے پاس پندرہ ہزار ڈالر تھے جو کہ بہت بڑی رقم تھی۔ اتنی رقم سے ہم پچاس غلام خرید سکتے تھے۔ عالیہ نے پیسے دیکھے تو بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”ایلی! تم سے زیادہ وفادار اور پیار کرنے والا انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ تم وہ رانجھے ہو جو اپنی ہیر کے لئے کسی بھی حد تک جاسکتے ہو۔ یہ عالیہ خوش نصیب ہے جو اسے تمہارے جیسا محبت کرنے والا انسان ملا ہے۔“ وہ مجھ سے گلے لگ کر رونے لگی۔ عالیہ چونکہ سیاہ فام تھی اس لئے وہ اوپر عرشے پر نہیں جا سکتی تھی۔ جہاز کے اوپر عرشے پر صرف سفید فاموں کو ہی جانے کی اجازت تھی جبکہ سارے غلام نیچے تہہ خانے میں رہتے تھے۔ میں نے تہہ خانے کی بجائے ایک کیبن ہی لے لیا تھا۔ جہاز کے اندر کافی کیبن بنے ہوتے تھے جن کا کرایہ بہت زیادہ تھا۔ میں نے عالیہ کو نیچے تہہ خانے میں بھیجنے کی بجائے پورا کیبن ہی کرایہ پر لے لیا تھا۔ عالیہ نے مجھ سے پیسے پکڑے اور انہیں اپنے لباس میں ڈال لیا۔

”عالیہ! یہ رانجھا کون ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ایلی! یہ ہمارے پنجاب کی ایک لوگ داستان ہے۔ رانجھا اپنی ہیر سے بہت محبت کرتا تھا اور اسی نے اپنی ہیر کے لئے بارہ سال بھینس چرائی تھیں۔“ عالیہ مجھے ہیر رانجھے کی کہانی سنانے لگی۔

”اچھا؟ تو میں اب رانجھا بن گیا ہوں؟“ میں نے اس کی کہانی سننے کے بعد کہا۔

”ہاں! تم واقعی رانجھے ہو، امریکی رانجھے۔“ وہ مسکراتے ہوئے میرے گلے سے لگ گئی۔

جہاز دریائے کولوراڈو میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ دو دن کے سفر کے بعد ہم کورپس کرسٹی

پہنچ گئے۔ ہم صبح صبح بندرگاہ پر پہنچ گئے تھے۔ میں نے یہاں کمرہ لینے کی بجائے سیدھا بندرگاہ پر بنے ہوئے غلاموں کے مرکزی دفتر کا رخ کیا۔ عالیہ کو امریکی شکاری جارج سے خریدا گیا تھا۔ میں نے دفتر والوں کو عاکون کا نام اور قد بتایا اور ساتھ میں مالک کا نام جارج بتا کر پتہ کرنے کے لئے کہا۔ جارج عالیہ اور عاکون دونوں کا مالک تھا۔ دفتر میں بیٹھے ہوئے لوگ میری بات پر زیادہ سنجیدہ نہیں ہو رہے تھے۔ وہ ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔ یہاں بندرگاہ پر روزانہ ہزاروں کی تعداد میں خرید و فروخت ہوتی تھی۔ ان سب کی خرید و فروخت کا حساب و کتاب اور کاغذات الگ الگ مہینوں کے حساب سے ترتیب سے رکھے ہوتے تھے لیکن پھر بھی کوئی ملازم اتنی تکلیف نہیں کرتا تھا۔ ہمیں عاکون کا سیریل نمبر معلوم نہیں تھا۔ اگر سیریل نمبر معلوم ہوتا تو دس منٹ میں ہی اس کے کاغذات نکل سکتے تھے۔ نام سے بہت مشکل ہوتی تھی۔ میں نے آسٹن کے میئر کا خط دکھایا تو وہ اہمیت دینے لگے۔

”ایلن سر! ہمیں تین چار گھنٹے لگ جائیں گے۔ آپ بندرگاہ کا ایک چکر لگالیں اور دوپہر کے بعد آجائیں، آپ کا کام ہو جائے گا۔“ ایک ملازم مجھے دوپہر تک آنے کا کہنے لگا۔ میئر کے خط نے ان پر اثر دکھایا تھا اور وہ سیدھے ہو گئے تھے۔

”ٹھیک ہے سر! میں دوپہر کے بعد آ جاؤں گا۔ آپ پلیز! عاکون کا پتہ کر کے دے دیں، یہ بہت ضروری ہے۔ ہم دونوں آسٹن سے سیشل یہاں آئے ہیں۔“ میں نے جیب سے دس ڈالر کا نوٹ نکالا اور اسے ملازم کے ہاتھ میں دے دیا۔

”میئر صاحب میرے رشتہ دار ہیں، میں ان سے آپ لوگوں کی تعریف بھی کروں گا اور انعام کے طور پر پچاس ڈالر بھی دے کر جاؤں گا۔ مجھے ہر حالت میں عاکون کا پتہ چاہیے۔“ میں نے ملازم سے مزید پچاس ڈالر دینے کا کہا۔

”سر آپ فکر مت کریں، نیچے تہہ خانے میں سارا ریکارڈ تاریخ کے حساب سے لگا ہوا ہے۔ میں اس دن عاکون کے نام سے جتنے بھی غلام بیچے گئے تھے ان سب کی فائل لاکر آپ کو دکھا دوں گا۔“ ملازم پچاس ڈالر کر سن کر ہی خوش ہو گیا تھا۔

میں وہاں سے باہر آیا اور عالیہ کو لیکر بندرگاہ کا چکر لگانے لگا۔ جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز تھے اور ایسے ہی غلاموں کی خرید و فروخت ہو رہی تھی۔ پانچ گھنٹے تک مسلسل آوارہ گردی کرنے کے بعد ہم نے ایک سرائے

سے کھانا کھایا اور دوبارہ دفتر پہنچ گئے۔ وہاں ملازم نے عاکون کا ایڈریس معلوم کر لیا تھا۔ وہاں پہنچے تو اس نے عاکون کی فائل نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ اس دن آٹھ غلام عاکون کے نام سے فروخت ہوئے تھے۔ ان آٹھ میں سے صرف ایک کے مالک کا نام جارج تھا جبکہ اس کے ساتھ جارج کے نائب آندریا کا نام بھی موجود تھا۔ عالیہ کی فائل بھی جارج اور آندریا کے نام سے تھی۔ فائل پر عاکون کا نمبر BRF/40 لکھا ہوا تھا اور پتہ ممفس کا لکھا ہوا تھا۔ یہی عاکون عالیہ کا شوہر تھا۔ میں نے ملازم سے ایڈریس اور نمبر لیا اور اس کا شکریہ ادا کر کے پچاس ڈالر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ عاکون کا پتہ معلوم کرنے کے بعد ہم ایک بار پھر جہاز میں سوار ہو گئے۔ ہماری اگلی منزل نیوآرلینز تھی۔

نیوآرلینز شہر گلف آف میکسیکو کے کنارے لوزیانہ ریاست کا شہر ہے۔ یہ مسیسیپی دریا کے کنارے پر واقع ہے۔ نیوآرلینز سے ہم نے جہاز تبدیل کیا اور مسیسیپی دریا میں سفر کرتے کرتے ممفس پہنچ گئے۔ ممفس ٹینیسی ریاست کا آخری سرحدی شہر ہے۔ یہ تین ریاستوں کے سنگم پر واقع ہے جبکہ چوتھی ریاست میسوری سے صرف سو کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ ممفس مسیسیپی دریا کے کنارے پر واقع ہے۔ دریا کے مشرقی کنارے پر ممفس جبکہ مغربی طرف آرکنساس ریاست شروع ہو جاتی ہے۔ ممفس کے جنوب میں مسیسیپی ریاست شروع ہو جاتی ہے۔ آج ممفس شہر پھیل کر تینوں ریاستوں میں چلا گیا ہے۔ سات لاکھ 7 کی آبادی والا یہ شہر ساڑھے آٹھ سو مربع کلومیٹر پر مشتمل ہے۔ ہم دوپہر کے بارہ بجے کے قریب ممفس پہنچ گئے تھے۔ وہاں سے ہم پہلے شہر کے میئر کے پاس آ گئے۔ میں نے ان کو اسٹن کے میئر کا لیٹر دکھایا تو انھوں نے میری ہر ممکن مدد کا وعدہ کیا۔

”سر! پہلے میں خود جا کر ایک چکر لگا لیتا ہوں اور اس سے عاکون کو خریدنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر وہ نہ مانے تو پھر آپ کے پاس حاضر ہو جاؤں گا۔“ میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے بیٹا! تم جاؤ اور پہلے خود اس معاملے کو ہینڈل کرنے کی کوشش کرو، مجھے امید ہے وہ زمیندار عاکون کو بیچنے کے لئے تیار ہو جائے گا۔“ میئر نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”شکریہ سر! میں عاکون کے مالک کو منہ مانگی قیمت ادا کروں گا۔“ میں نے ان سے ہاتھ ملایا اور ان کے دفتر سے باہر آ گیا۔

عاکون کا مالک مارکوس ممفس سے دس کلومیٹر اوپر شمال کی طرف ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتا تھا۔

یہ اصل میں کوئی گاؤں نہیں تھا بلکہ یہ مارکوس اور کچھ دوسرے زمینداروں کی جگہ تھی اور انہوں نے وہیں پر رہنے کے لئے ڈیرے بنا لیے تھے۔ اب یہ جگہ بھی ممفس شہر کا حصہ بن گئی ہے۔ ہم نے ایک تانگہ لیا اور مارکوس کے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ مارکوس کا ڈیرہ بھی ہمارے ڈیرے کے تقریباً برابر ہی تھا۔ وہ یہاں کا ایک بڑا زمیندار تھا۔ ڈیرے سے باہر ایک کھیت میں کافی سارے غلام کام کر رہے تھے۔ میں نے تانگے والے کو ادھر ہی تانگہ کھڑا کرنے اور ہمارا انتظار کرنے کا کہا اور عالیہ کو لیکر تانگے سے اتر گیا۔

”چلو عالیہ! ان لوگوں سے مارکوس کا پتہ پوچھتے ہیں۔“ میں اسے لیکر کھیت کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ ٹماٹروں کا کھیت تھا اور غلام ٹماٹروں پر رہتے تھے۔

”ایلی۔۔؟“ میں آگے چل رہا تھا۔ مجھے پیچھے سے عالیہ کی آواز آئی تو میں پیچھے مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا بات ہے عالیہ؟ تم رک کیوں گئی ہو؟“ میں نے اسے رکتے ہوئے دیکھا تو سوال کیا۔
 ”ایلی سوری یار! میں تمہیں محبت کے بدلے محبت نہیں دے سکی۔“ اس نے آگے بڑھ کر میری گالوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”عالیہ! سوری کس بات کی؟ تم نے تو مجھے عشق کرنا سکھایا ہے اور عشق تو بدلے میں کچھ بھی نہیں مانگتا ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ میری آواز لڑکھڑائی تھی اور میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکلنے لگے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔

”عالیہ! بہت درد ہوتا ہے یار! بہت زیادہ درد۔۔۔ اتنا درد کہ برداشت سے باہر ہو جاتا ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کسی دن میرا سینہ اس درد سے پھٹ جائے گا۔“ مجھے عالیہ کی بانہوں کا سہارا ملا تو میں بے اختیار اس کے گلے لگ کر رونے لگا۔

”ایلی! تم کہتے ہو تو ہم ابھی یہاں سے واپس چلے جاتے ہیں؟ میں عاکون سے نہیں ملتی؟“ میں نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے چپ کر وادیا۔

”عالیہ! یہ میرے عشق کی تو بین ہے۔ عشق تو وہ ہوتا ہے جو محبوب کی خوشی میں خوش ہوتا ہے۔ میری زندگی کا مقصد ہی اب تمہاری خوشی ہے۔ میں واشنگٹن میں ایک گھر بناؤں گا جہاں تم اور عاکون دونوں رہو گے۔ میں وائٹ ہاؤس میں کام کروں گا۔ امریکہ اور پوری دنیا میں بکھرے کروڑوں سیاہ فام غلاموں کے

حقوق کے لئے کام کروں گا۔ بدلے میں تمہارے ہاتھ کا دو وقت کا کھانا چاہیے اور بس اس سے زیادہ اور میری کوئی خواہش نہیں ہے۔ میں اور کچھ نہیں مانگتا، میں تمہارے اور عاکون کے بچوں کو پڑھاؤں گا، لکھاؤں گا اور آزاد انسان بناؤں گا۔ میں انہیں غلام نہیں بننے دوں گا۔“ میں اس کے گلے لگ کر انتہائی جذباتی ہو کر بول رہا تھا۔

”ایلی! تم عشق کی انتہا تک پہنچ چکے ہو۔ اس دنیا میں تو یہ عالیہ تمہاری نہیں ہو سکی لیکن مرنے کے بعد آخری اور دائمی زندگی میں یہ عالیہ صرف اور صرف تمہاری ہوگی۔“ اس نے مجھ سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔

”عالیہ صاحبہ! آپ بھی اس عشق کو سمجھنے میں غلطی کر رہی ہو، تم اس جنم میں بھی میری ہو اور اگلے جنم میں بھی میری ہی رہو گی۔ عشق میں دو جسموں کا ملاپ ضروری تو نہیں ہوتا، تم میرے ساتھ رہو یا عاکون کے ساتھ کیا فرق پڑتا ہے؟ میرا عشق عاکون سے پہلے بھی تھا اور عاکون کے بعد بھی ایسے ہی رہے گا۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ بھی آہستہ آہستہ میرے پیچھے آنے لگی۔ کھیت میں پہنچ کر میں نے ان سے زمیندار مارکوس کا پوچھا تو وہ کھیت مارکوس کا ہی تھا۔

”سر! آپ کو کیا کام ہے؟“ مارکوس کے ایک گھڑسوار پہریدار نے مجھ سے سوال کیا۔ وہ غلاموں کے کام کی نگرانی کے لئے کھڑا تھا۔

”میں ان سے ایک غلام کی معلومات لینے آیا ہوں؟“ میں نے اس کے سوال کا جواب دیا۔

”کوئی غلام کے متعلق پوچھنا ہے آپ نے؟“ اس نے ایک اور سوال کر دیا۔ اس کی نظریں میرے پیچھے کھڑی عالیہ پر جمی ہوئی تھیں۔

”آپ کون ہیں بھائی صاحب؟“ میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کر دیا۔

میرا الجھ کانی تیز تھا۔

”جی! میں یہاں پہریدار ہوں، میں ان غلاموں کا خیال رکھتا ہوں۔“ اس نے میری بات کا جواب دیا۔

”اچھا! تو آپ مارکوس کے ملازم ہو؟“ میں نے ملازم کے لفظ پر کافی زور دیتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کا ایسے عالیہ کی طرف دیکھنا کافی ناگوار گزر رہا تھا۔ اس لئے میں نے طنزیہ لہجے میں اسے اس کی اوقات یاد دلائی تھی کہ وہ صرف ایک ملازم ہے۔

”جی سر! میں ان کا ملازم ہوں، مارکوس سر آپ کو ڈیرے پر ہی مل جائیں گے۔ وہ وہیں ڈیرے پر ہی رہتے ہیں۔“ پہریدار اس بار لائن پر آ گیا تھا۔

”شکریہ سر! میں یہاں ایک غلام عاکون کا پتہ کرنے آیا ہوں۔ وہ لائبریریا سے آیا تھا اور مارکوس نے اسے کارپس کرسٹی کی بندرگاہ سے خریدا تھا۔“ میں نے اس بار نرم لہجے میں اس سے سوال کیا۔

”عاکون؟ لائبریریا والا؟“ اس نے قدرے اونچی آواز میں کہا تو تمام غلام ہی کام روک کر ہم دونوں کی طرف دیکھنے لگے۔

”جی جی سر! وہی لائبریریا سے آیا تھا۔۔۔ آپ جانتے ہیں اسے؟“ عالیہ نے جلدی سے پوچھا۔ اس کی آواز شدت جذبات سے لڑکھڑاہی تھی۔

”بیٹی! تم عالیہ ہو؟ عاکون کی بیوی عالیہ؟“ ایک قدرے عمر رسیدہ غلام نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ سارے غلاموں نے کام چھوڑ دیا تھا اور وہ سب ہمارے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔

”جی انکل! میں ہی عالیہ ہوں، وہ کہاں ہے؟“ وہ اس ادھیڑ عمر غلام سے پوچھنے لگی۔

”آؤ میرے ساتھ، میں تمہیں وہاں لے چلتا ہوں۔“ اس نے عالیہ کا ہاتھ پکڑا اور ڈیرے کی طرف جانے لگا۔

”اینڈرسن۔۔۔“ پہریدار نے غصے سے اسے آواز دی۔ ادھیڑ عمر اینڈرسن بغیر پوچھے ہی کام چھوڑ کر ہمارے ساتھ چل پڑا تھا۔

”پہریدار صاحب! زیادہ سے زیادہ جان سے ہی مار سکتے ہونا؟ تو مار دو! بس روکو مت۔“ اس نے پیچھے مڑ کر پہریدار سے کہا اور پھر ہمارے ساتھ ساتھ آگے جانے لگا۔ کھیت سے باہر نکل کر ہم ڈیرے کی طرف چل پڑے۔ تا نگلہ ابھی تک وہیں انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اسے بھی ڈیرے کی طرف آنے کا کہا اور ہم پیدل ہی جانے لگے۔ ڈیرہ نزدیک ہی تھا۔

”عالیہ! عاکون بہت اچھا لڑکا تھا۔ ایک اچھا نوجوان، ایک اچھا غلام، ایک اچھا شوہر اور ان سب سے بڑھ کر ایک بہت اچھا مسلمان تھا۔“ اس نے ڈیرے کے دروازے کو دھک دے کر کھولا تو سامنے ہی عاکون نظر آ گیا۔

سامنے صحن میں برگد کا ایک بہت بڑا بیڑ تھا۔ درخت کی ایک اونچی ٹہنی رسی سے باندھی ہوئی تھی اور اس

رسی کے ساتھ عاکون لٹک رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ عاکون مرچکا تھا۔ اسے برگد کے درخت کے ساتھ پھانسی دی گئی تھی۔ عالیہ کی نظر عاکون کے بے حس و حرکت جسم پر پڑی تو وہ وہیں چکر اکر گر پڑی۔ میں بھی وہیں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میری ٹانگوں میں بالکل جان ہی نہیں رہ گئی تھی۔ اینڈرسن عالیہ کو ہلا جھلا کر ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اندر سامنے ڈیرے پر کچھ غلام کام کر رہے تھے۔ اینڈرسن نے انہیں پانی لانے کا کہا۔ وہ پانی لیکر آئے تو اینڈرسن پانی کے چھینٹے عالیہ کے چہرے پر مارنے لگا۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے ان لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عالیہ اور عاکون کو کچھڑے دو سال ہو گئے تھے اور وہ دو سال بعد عاکون کو دیکھ رہی تھی۔ عاکون کو آج صبح ہی کسی وقت مارا گیا تھا۔ ہم ایک دن لیٹ ہو گئے تھے۔

”اٹھو میری بچی! ہوش میں آؤ۔“ اینڈرسن عالیہ کے چہرے پر مسلسل چھینٹے مار رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی عالیہ کو ہوش آگئی۔ اینڈرسن نے اسے سہارا دیکر کھڑا کیا اور وہ اس کے سہارے چلتے ہوئے عاکون کی لاش کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ میں بھی آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

”سوری عالیہ! ہمیں دیر ہو گئی ہے۔“ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ عالیہ اس کی لٹکی ہوئی لاش کے ساتھ لپٹ کر رونے لگی۔

”عالیہ بیٹی! صبر کرو بیٹی! یہ شہید ہوا ہے اور شہید کبھی مرتے نہیں ہے۔ مت رو بیٹی! شہید کی موت پر روتے نہیں ہیں۔“ اینڈرسن اس کے کندھے پر ہاتھ کر تسلی دے رہا تھا۔

”چاچا! پچھلے دو سال سے ایک ایک پل، ایک ایک رات اس کو یاد کرتے ہوئے گزار دی ہے۔ آج ملا ہے تو کس حال میں۔۔۔ چاچا تھوڑا سا رو لینے دو۔“ عالیہ کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

”چاچا! ہوا کیا تھا؟ اس کو کیوں مارا گیا تھا؟“

”یہ مسلمان تھا۔۔۔ غلاموں کو عیسائیت کی راہ سے بھٹکا کر اپنی راہ پر لگاتا تھا۔ اس کی وجہ سے میرے اس گاؤں کے سبھی غلام مسلمان ہو چکے ہیں۔“ عاکون کے مالک مارکوس نے میری بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ وہ بھی ہمارے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”کتنے ظالم لوگ ہو آپ۔۔۔ انسانی جان کی کوئی قیمت ہی نہیں ہے آپ کی نظر میں؟ زمین پر فرعون بن کر بیٹھ گئے ہو؟“ میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مجھے اس شخص سے گھن آرہی تھی جس

نے مذہب کی بنیاد پر ایک معصوم انسان کو مار دیا تھا۔

”تم انسان نہیں جانور ہو جانور۔“ اچانک عالیہ نے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔

”مظلوموں پر ظلم کرتے ہوئے تمہیں خدا یا نہیں آتا؟“ عالیہ نے اس کے گریبان کو پکڑ کر ایک جھٹکا دیا تو وہ زمین پر گر گیا۔ عالیہ اس کے سینے پر بیٹھ کر اس کا گلا دبائے لگی۔ مارکوس عالیہ سے کہیں زیادہ طاقتور تھا لیکن اس وقت تو عالیہ پر ایک جنون سوار تھا۔ عالیہ پوری قوت سے اس کی گردن دبا رہی تھی۔ اس کا سانس بند ہو گیا تھا اور آنکھیں باہر آ رہی تھیں۔ میں جلدی سے آگے بڑھ کر عالیہ کو چھڑانے لگا۔

”عالیہ! چھوڑ دو اسے!“ میں عالیہ کے ہاتھ اس کی گردن سے الگ کرنے کے لئے زور لگانے لگا۔ عاکون کی لاش دیکھ کر وہ پاگل ہو چکی تھی۔ میں نے مدد کے لئے اینڈرسن کی طرف دیکھا تو وہ بھی میری مدد کرنے لگا۔ ہم دونوں نے زور لگا کر عالیہ کو مارکوس سے الگ کیا۔

”عالیہ! پلیز صبر کرو، اس کے مرنے سے تمہارا عاکون واپس تو نہیں آ جائے گا؟ وہ شہید ہو چکا ہے۔“ میں عالیہ کو سمجھانے لگا۔

”تم نے مجھے ہاتھ لگایا ہے؟ ایک سیاہ فام غلام نے آج مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے؟ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ مارکوس نے زمین سے اٹھتے ہوئے کہا۔ عالیہ نے اس کے چہرے پر مکے بھی بہت مارے تھے۔ اس کی ناک اور منہ سے خون نکل رہا تھا۔

”تم اسے ہاتھ تو لگا کر دکھاؤ! میں تمہیں پھاڑ کر تمہارے اندر سے گزر جاؤں گا۔“ میں نے اسے گریبان سے پکڑتے ہوئے کہا۔

”مظلوموں پر ظلم کرنے والا شیر نہیں کتا ہوتا ہے اور تم کتے سے بھی بدتر ہو۔“ میں نے اسے دھکا دیا تو وہ ایک بار پھر زمین پر گر پڑا۔ میں عالیہ کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا، میں اس کا محافظ بن رہا تھا۔ عالیہ کی طرف آنے والا ہر وار مجھ سے ہو کر گزرتا۔

”چلو ایللی! واپس گھر چلتے ہیں۔“ عالیہ نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ میں اسے لے کر گیٹ سے باہر آیا تو باہر پانچ سو کے قریب سیاہ فام غلام کھڑے تھے۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی نعرے مارنے لگے۔ انہیں عالیہ کے آنے کی خبر ملی تو وہ سب آپے سے باہر ہو گئے تھے۔ آج صبح عاکون کو پھانسی دی گئی تھی اور اس کی خبر پورے گاؤں میں پھیل چکی تھی۔ سارے سیاہ فام غلام عاکون کی تعلیمات سے متاثر ہو کر

مسلمان ہو چکے تھے۔ عاکون کو اسی تبلیغ کی وجہ سے آج مارا گیا تھا۔ لوگ غصے میں تھے۔ انہیں جب عالیہ کے آنے کی خبر ملی تو سب غلاموں نے بغاوت کر دی تھی۔ وہ سب لوگ عالیہ اور عاکون کی محبت کو جانتے تھے۔ سب سے پہلی بغاوت اسی کھیت میں ہوئی تھی جہاں ہم دونوں گئے تھے۔ انہوں نے مسلح پہریدار کو مار دیا تھا اور خود باقی ڈیروں پر چلے گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ خبر پورے علاقے میں چلی گئی تھی اور اس وقت کوئی چھ سو کے قریب غلام باہر کھڑے تھے جبکہ تیس کے قریب مسلح پہریدار بھی وہ لوگ پکڑ کر لے آئے تھے۔ ہمارے باہر نکلنے کے بعد کچھ غلام اندر گئے اور مارکوس کو بھی پکڑ کر لے آئے۔ کچھ سیاہ فام مجھے بھی پکڑنے لگے لیکن عالیہ اور اینڈرسن نے انہیں روک دیا۔ وہ سب انتہائی غصے سے نعرے بازی کر رہے تھے۔ آج ان لوگوں نے بغاوت کر دی تھی۔ آج عاکون اور عالیہ کی وجہ سے امریکہ میں بغاوت کی ابتدا ہو گئی تھی۔ امریکہ کی تین ریاستوں کو لگنے والے شہر ممفس سے صرف چند کلومیٹر کے فاصلے پر موجود اس چھوٹے سے گاؤں میں آج غلامی کے خلاف بغاوت شروع ہو چکی تھی۔ یہ آگ جو آج یہاں لگی تھی وہ آہستہ آہستہ پورے امریکہ میں پھیلنے والی تھی۔ میں نے مجمع کی طرف دیکھا۔ تاحد نگاہ مجھے لوگ ہی لوگ نظر آ رہے تھے جو انتہائی غصے اور جوش سے نعرے لگا رہے تھے۔

”عالیہ ماں! آپ کا شوہر عاکون ہمارا لیڈر تھا۔ وہ ہمارا سربراہ تھا اور اب اس کے جانے کے بعد تم ہو۔ ہمیں حکم دو ماں! کیا کرنا ہے؟“ ایک نوجوان سیاہ فام آگے آیا اور وہ عالیہ کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ “عالیہ! یہ بہت غلط ہو گیا ہے۔۔۔ ان میں سے اب کوئی بھی نہیں بچے گا یہ سب مارے جائیں گے۔“ میں نے فکر مندی سے کہا۔

”ہم مقابلہ کریں گے ایللی صاحب!“ عالیہ نے پر عزم لہجے میں کہا۔

”نہیں عالیہ! تمہیں امریکہ کی طاقت کا اندازہ نہیں ہے، تم لوگ کبھی بھی یہ جنگ جیت نہیں سکتے۔“ میں نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

”ایللی صاحب! جنگ کبھی جیتنے کے لئے نہیں لڑی جاتی۔۔۔ اپنے حقوق کے لئے لڑی جانے والی جنگیں شکست کے باوجود اثر رکھتی ہیں۔ آزادی سب کا حق ہے، ہم نہیں تو ہماری اولاد ضرور آزاد پیدا ہوگی۔“ اس نے پر عزم لہجے میں کہا۔

”آزادی کے لئے جان دے سکتے ہو؟“ عالیہ نے اس بار سامنے سر جھکا کر نوجوان سے مخاطب ہو کر

کہا۔

”جی ماں! ہم سب آزادی کے لئے جان دے سکتے ہیں۔“ نوجوان نے عالیہ کو ماں کہتے ہوئے پھر سر جھکا لیا۔ وہ عالیہ سے صرف چار پانچ سال چھوٹا تھا لیکن وہ عالیہ کو ماں کہہ رہا تھا۔

”اس آزادی کے لئے کون کون جان دے سکتا ہے؟“ عالیہ نے اس بار آگے بڑھ کر اونچی آواز میں پوچھا۔ وہ پورے مجمع سے مخاطب ہو کر کہہ رہی تھی۔

”ہم سب حاضر ہیں ماں! پورے مجمع نے مل کر چلاتے ہوئے کہا۔ وہ سب عالیہ کو ماں کہہ رہے تھے۔

”ایلی صاحب! کچھ کہنا ہے؟“ عالیہ نے مجھ سے سوال کیا۔

”میں تمہیں مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔“ میری آواز لڑکھڑائی۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ کہہ ہی نہیں سکا۔

”ایلی! موت سے ڈر نہیں لگتا مجھے، میں لڑنا چاہتی ہوں۔“ وہ میرے مقابل کھڑی ہو گئی۔

”عالیہ! لڑنا میں بھی چاہتا ہوں۔۔۔ اس غلامی کو ختم کرنے کے لئے اپنے ہی ملک میں اپنے ہی سفید فام بھائیوں کے ساتھ لڑوں گا لیکن میں قلم سے لڑنا چاہتا ہوں۔ ہتھیار سے قلم زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ ہماری جگہ ممفس کا چھوٹا سا شہر نہیں واشنگٹن ہے بلکہ میں وہاں جا کر جدوجہد کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ میری نظریں اب بھی چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ انسانوں کا ایک جم غفیر اکٹھا ہو چکا تھا۔ غلام کچھ مزید سفید فاموں کو بھی پکڑ کر لے آئے تھے۔

”عالیہ! مجھے تمہاری ضرورت ہے، تمہارے بغیر میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ میرے ساتھ واپس چلو!“

میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”عالیہ ماں! یہ صحیح کہہ رہے ہیں۔۔۔ ہم مر بھی گئے تو کوئی بات نہیں مگر آپ کو زندہ رہنا ہوگا۔ آپ زندہ رہیں گے تو امید بھی زندہ رہے گی۔“ نوجوان نے دھیمے لہجے میں کہا۔ اس کا سرا بھی تک عالیہ کے سامنے جھکا ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے، میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔۔۔ انشا اللہ! آزادی ہمارا مقدر بنے گی۔ ایک دن ہم بھی آزاد ہوں گے۔“ عالیہ نے اس سے کہا اور میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

”چلو ایلی! چلتے ہیں۔“ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ماں! ان کا کیا کرنا ہے؟“ نوجوان نے زمین پر بیٹھے سفید فاموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ان کی تعداد پچاس کے قریب ہو چکی تھی۔ غلاموں نے ان سے ہتھیار چھین لئے تھے اور انہیں یرغمال بنا کر زمین پر بٹھایا ہوا تھا۔ سبھی کے ہاتھ پیچھے پشت پر رسیوں سے باندھے ہوئے تھے۔ وہ سب رحم دلانہ نظروں سے عالیہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”ان کے سر کاٹ کر گاؤں کے چوراہے اور سڑک کے کنارے پر لٹکاؤ جبکہ باقی جسم پر تیل چھڑک کر آگ لگا دو۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو پکڑو۔ ان کی فصلوں، دکانوں، گھروں کو آگ لگاؤ۔ پولیس اور آرمی والے آئیں تو ان بچوں کو آگے کرو۔ کوئی رحم نہیں، صرف اور صرف دہشت ہو۔ پانچ سال کے بچے سے لیکر 100 سال کے بوڑھے تک کی آنکھوں میں دہشت نظر آنی چاہیے۔ اتنی دہشت پھیلا دو کہ یہ لوگ سیاہ رنگ کو دیکھتے ہی کانپنا شروع کر دیں۔“ عالیہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میرا ہاتھ پکڑا گاؤں سے باہر جانے لگی۔

”عالیہ! تم بہت ظالم ہو، اتنا ظلم کون کرتا ہے؟“ میں نے عالیہ کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔
 ”ایلی صاحب! ہمارے ہندوستان میں ایسے ہی جنگیں لڑی جاتی ہیں۔ ہم لوگ دشمن کا سات نسلوں تک پیچھا کرتے ہیں۔“ وہ میرے آگے آگے چل رہی تھی جبکہ میں کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ ہمارے پیچھے گولیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ بچوں اور عورتوں کی چیخوں کی آواز آرہی تھی۔ یہ چیخیں میرے کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھیں۔ مجھے یہ سب کچھ غلط لگ رہا تھا لیکن میں بے بس تھا۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا یا شاید میں کچھ کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ میں عالیہ کے کسی بھی قدم کو غلط نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ جو بھی کرتی تھی جو بھی کہتی تھی بس آنکھیں بند کر کے یقین کرنے کو دل کرتا تھا۔

”ایلی صاحب! یہ جو جنگ ہوتی ہے نا! یہ بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ انسان کو ایسے ایسے فیصلے کرنے پر مجبور کر دیتی ہے جو نہ مذہب مانتا ہے اور نہ معاشرہ لیکن پھر بھی وہ صحیح ہوتے ہیں۔ میرا یہ فیصلہ بھی صحیح ہے۔ چار لوگوں کی جان جائے گی تو چار لاکھ لوگوں کی زندگی آسان بنے گی۔“ وہ دور آسمان پر اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھ رہی تھی۔

”ایلی! ہم سے زیادہ خوش قسمت تو یہ پرندے ہیں جو آزادی سے اڑتو سکتے ہیں۔“ میں خاموشی سے اس کے سانولے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ میرے پاس اس کے کسی بھی سوال کا جواب نہیں تھا۔ میں لا جواب ہو گیا تھا۔ اس دن ہم ممفس سے واپسی اسٹن کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس بار ہم نے جہاز سے

جانے کی بجائے کبھی سے سفر کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ ممفس سے ہم شریو پورٹ آئے اور پھر شریو پورٹ سے ڈلاس اور ڈلاس سے آگے آسٹن کا سفر ایک دن کا تھا۔ ہم واپس گھر آ گئے۔ عاکون کے بغیر ہمارے پیچھے ممفس میں بغاوت پھوٹ چکی تھی۔ وہاں ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔ پولیس نے بغاوت پر قابو پانے کی کوشش کی تھی لیکن باغی پورے ممفس شہر پر قابض ہو گئے تھے۔ انہوں نے پورے شہر کو آگ لگا دی تھی۔ مس پسی دریا کا رنگ خون سے سرخ ہو چکا تھا۔ تین ریاستوں کی پولیس مقابلہ کر رہی تھی لیکن سیاہ فاموں کی بغاوت روکنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ وہ سب وحشی ہو چکے تھے۔ انہوں نے ممفس شہر کے ساتھ ساتھ جونز بورو اور جیکسن شہر پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ انھوں نے کھڑی فصلوں کو آگ لگا دی تھی۔ وہ دیہاتوں پر قبضہ کرتے تھے اور وہاں سولہ سال سے اوپر تمام مردوں اور بوڑھوں کو مار دیتے تھے۔ مس پسی دریا امریکہ کی شمالی ریاستوں کو اٹلانٹک سمندر ملاتا تھا جو آگے یورپ اور پوری دنیا تک جاتا تھا۔ اس دور میں مس پسی دریا کو لورڈو دریا اور یوگراڈے دریا امریکہ کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے۔ سیاہ فام غلام باغیوں نے ممفس کے قریب مس پسی دریا پر قبضہ کر لیا۔ وہ یہاں سے کسی بھی بحری جہاز کو نہیں گزرنے دے رہے تھے۔ پولیس ان کے ہاتھوں بے بس ہوئی تو فوج آ گئی۔ امریکہ کی جنوب مشرقی ریاستوں میں باغیوں کے خلاف ایک جنگ چھڑ چکی تھی۔ ہم دونوں ان ہنگاموں سے دور گھر آ چکے تھے۔ ہماری ریاست ٹیکساس ان ہنگاموں سے بہت دور تھی۔

”ابو! آپ عالیہ کو میرے نام کر دیں؟ آپ اس کو میرے نام پر منتقل کر دیں، میں اس کا لیگل مالک بننا چاہتا ہوں۔“ میں ابو کے سامنے کھڑا ان سے کہہ رہا تھا۔ وہ گھر کے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمیں واپس آئے پورا مہینہ گزر چکا تھا۔ پیچھے ممفس میں آرمی نے باغیوں پر قابو پا لیا تھا۔ امریکی فوج نے تمام باغیوں کو گولی مار دی تھی۔ ممفس شہر مکمل طور پر اجڑ چکا تھا۔ اسے اب دوبارہ آباد کیا جا رہا تھا۔

”بیٹا! اس کی کیا ضرورت ہے؟ جو میرا ہے وہ سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔۔۔ میں باپ ہوں تمہارا۔“ انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”ابو! وہ بات ٹھیک ہے، میں صرف اسے اپنے نام کرنا چاہتا ہوں۔ ایک خواہش ہے میری کہ وہ میری ملکیت میں لکھی جائے۔“ میں نے ابو کے قدموں کے قریب زمین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے بیٹا! کل صبح میسر صاحب کے پاس جا کر میں اس کے کاغذات تمہارے نام کر دوں گا۔“

ابو نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اب میری کسی بات پر اتنی جلدی اختلاف نہیں کرتے تھے۔ گھر والوں کو میری فطرت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ میں عالیہ کے خلاف کسی کی بھی نہیں سنتا تھا۔

”شکریہ ابو! آپ بہت اچھے باپ ہیں۔“ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”ایلی بیٹا! کچھ محبتیں ایسی ہوتی ہیں جو بڑے بڑے خاندانوں کو نگل جاتی ہیں، جو سوائے دکھ اور درد کے کچھ نہیں دیتیں۔ بیٹا! ایسی محبتوں سے پرہیز ہی کرنا چاہیے۔ ہم بہت کمزور لوگ ہیں۔ تمہاری اس بے جوڑ محبت کے لئے امریکی معاشرے سے نہیں لڑ سکتے۔“ وہ کرسی سے اٹھے اور اندر کمرے میں چلے گئے۔

ان کی آنکھیں لال ہو چکی تھی اور ان میں پانی آ گیا تھا۔ وہ اپنے آنسو چھپانے کے لئے اندر چلے گئے تھے۔ میں نے ایک پل کے لئے دروازے کی طرف دیکھا اور خاموشی سے باہر چلا گیا۔ میرے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں اس عشق کے آگے مکمل طور پر بے بس ہو چکا تھا۔ اگر محبت کرنا انسان کے اختیار میں ہوتا تو دنیا کا کوئی بھی شخص محبت نہ کرتا۔ یہ سگریٹ کے اس نشے کی طرح ہے جسے چھوڑنا بھی چاہتے ہیں لیکن چھوڑ نہیں سکتے۔ دوسرے دن صبح ہی ابو نے عالیہ کے کاغذات لئے اور اسے میرے نام پر منتقل کر کے میری مہر کی لگا دی۔ عالیہ اب باقاعدہ طور پر میری غلام ہو گئی تھی۔ میں دوبارہ ڈیرے پر جا کر زمیندارے کا کام کرنا چاہتا تھا لیکن گھر والے مجھے اب ڈیرے پر جانے سے روک رہے تھے۔ عالیہ نے بھی ان کی حمایت کی تھی وہ ڈیرے کی بجائے گھر پر ہی رہنے لگی تھی۔ اس کے بغیر میں ڈیرے پر جا ہی نہیں سکتا تھا۔ میں بھی اب گھر پر ہی رہنے لگا۔ وقت آہستہ آہستہ کر کے گزرنے لگا۔ میری محبت شدید سے شدید تر ہونے لگی۔ محبت جب شدت اختیار کر لیتی ہے، جب کوئی انسان انتہائی ٹوٹ کر کسی کو چاہنے لگتا ہے تو پھر کبھی نہ کبھی محبوب کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو ہی جاتا ہے۔ عالیہ بھی میری محبت سے متاثر ہونے لگی تھی۔ میرے گھر والوں نے تو میرے اس عشق کے آگے مکمل ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ وہ ہمارے اس معاملے میں بالکل ہی نہیں پڑتے تھے۔ صرف فلورین ہی تھی جو اب بھی مسلسل مزاحمت کر رہی تھی، وہ مجھ سے شدید محبت کرتی تھی۔ وہ مسلسل سائے کی طرح میرا پیچھا کر رہی تھی۔ عالیہ کو گھر اور ڈیرے کے کام سے نجات ملی تو اس نے گاؤں کے دوسرے سیاہ فام غلاموں کے ساتھ رابطے شروع کر دیئے۔ وہ دوسرے سیاہ فام غلاموں کو اسلام کی تبلیغ کر رہی تھی۔ یہ کام مسلسل چھ مہینے تک چلتا رہا اور پھر اس کے نتائج بھی آنا شروع ہو گئے۔ عالیہ انتہائی خوش مزاج اور متاثر کن شخصیت کی حامل تھی۔ اس کے دھیمے لہجے میں کی جانے والی بات سیدھی دل پر اثر کرتی

تھی۔ سیاہ فام غلام بہت جلد اس کی باتوں سے متاثر ہونے لگے۔ گاؤں کے سفید فام آبادی کو عالیہ کی تبلیغ پر اعتراض ہونے لگا۔ اسلام میں غلاموں کے لاتعداد حقوق تھے۔ اسلام کسی کو بھی صرف رنگ اور نسل کی بنیاد پر حقیر نہیں مانتا تھا۔ خدا کی نظر میں گورے اور کالے عربی اور عجمی میں کوئی فرق نہ تھا بلکہ سب برابر تھے۔ یہ امر کی قانون کے بالکل برعکس تھا۔ یہاں ہر کالے رنگ والا غلام ہوتا تھا۔ یہاں آزادی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ کوئی بھی سیاہ فام بغیر کسی امریکی مالک کے نہیں رہ سکتا تھا۔ عالیہ میری غلام تھی لیکن میں چاہ کر بھی اسے آزاد نہیں کر سکتا تھا۔ مالک کے پاس اپنے غلام کو جان سے مار دینے کا اختیار تھا، اذیتیں دینے کا اختیار تھا۔ جانوروں کی طرح آگے کسی اور کو بیچنے کا اختیار بھی تھا لیکن وہ اسے آزاد نہیں کر سکتا تھا۔ یہ امر کی معاشرے کے بنائے ہوئے قوانین تھے جو اسلام کے بالکل مختلف تھے۔ سیاہ فام غلام مسلمان ہو رہے تھے۔ ان کے اندر آزادی کے لئے لڑنے، جہاد کرنے اور شہید ہونے کی تمنا بڑھ رہی تھی۔ ہمارے گاؤں کے لوگ اسی جہاد سے ڈرتے تھے۔ وہ عالیہ کو روکنا چاہتے تھے۔ عالیہ کی شکایتیں لیکر گاؤں والے ہمارے گھر آتے تھے۔ ابو ہر روز مجھ سے عالیہ کے معاملے پر لڑتے تھے لیکن میں ہر حال میں عالیہ کے پیچھے کھڑا ہوتا تھا۔ مجھے عالیہ کے علاوہ اور کوئی بھی نظر نہیں آتا تھا۔

”عالیہ! گاؤں کے حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ لوگوں کے رویے تبدیل ہو رہے ہیں۔“ میں نے عالیہ کے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں اس وقت ڈیرے سے واپس آرہے تھے۔

”ایلی! آزادی اتنی آسانی سے کہاں ملتی ہے؟“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ میری بات سن کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”عالیہ! ہمارے گاؤں کے حالات بھی ممفس کی طرح ہو رہے ہیں، مجھے اب ڈر لگنے لگا ہے کہ کہیں ہمارا شہر بھی ممفس شہر جیسا نہ ہو جائے۔ کہیں دریا کو لورڈو کا پانی بھی خون سے سرخ نہ ہو جائے۔“ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا حسین چہرہ جنت سے آئی ہوئی کسی حور کی طرح نظر آ رہا تھا۔ وہ کافی دیر تک میری آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ میں اس کی نظروں کی تپش سے گھٹلنا شروع ہو گیا تھا۔ آخر کار اس پری پیکر کا منہ کھلا اور اس نے مجھ سے کہا۔

”ایلی! مجھے لگتا میرے ساتھ ہو۔“ وہ اتنا کہہ کر واپس مڑ گئی۔

”عالیہ! میں ہمیشہ سے تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔ پہلے دن سے لیکر آج تک اور آگے ہمیشہ تمہارے

ساتھ رہوں گا۔ مجھے اپنی نہیں تمہاری فکر ہے۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ یہ گاؤں والے تجھے ماردیں گے اور بدلے میں سیاہ فام بغاوت کر دیں گے۔ نہ وہ بچیں گے اور نہ گاؤں والے۔ عالیہ! دونوں طرف کے لوگ مریں گے اور دونوں طرف کے لوگ سیاہ فام اور سفید فام دونوں میرے اپنے ہیں۔ مجھے تو دونوں طرف سے ہی نقصان ہوگا؟“ میں نے نمناک لہجے میں کہا۔

”ایلی! خدا بہتر کرے گا، یہ سارے فیصلے اس کی ذات پر چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ جو بھی کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”عالیہ! میرا کیا بنے گا، میرے اس عشق کا کیا بنے گا؟“ میں نے آہستگی سے اس کے نرم گالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

”ایلی! تم نے ہماری اس قوم پر بڑے احسانات کئے ہیں۔ ہماری آنے والی نسلیں بھی تمہارے اس نام سے واقف ہوں گی۔ تمہارا نام ہمیشہ تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔“ وہ ایک بار پھر مڑ کر جانے لگی لیکن میں نے پھر اسے روک لیا۔

”عالیہ! مجھے نام نہیں چاہیے بلکہ میں صرف اور صرف تمہیں چاہتا ہوں۔ میں تمہیں واپس انڈیا لیکر چلا جاتا ہوں، ہم دونوں وہاں آزادی سے رہ سکتے ہیں؟“ میں پر امید نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”ٹھیک کہتے ہو ایلی! میں چلی جاتی ہوں انڈیا لیکن میرے بعد ان لاکھوں سیاہ فام غلاموں کا کیا ہوگا؟ کیا ان کو بھی انڈیا لے جاسکتے ہو؟“ اس نے مجھے کندھے سے پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ایلی! کیا باقی لاکھوں غلاموں کو لیکر جاسکتے ہو؟“ اس نے پھر اپنے سوال کو دہرایا۔

”عالیہ! میں کوئی حکمران نہیں ہوں۔ میں تمہیں بچانے کی طاقت رکھتا ہوں اور تمہیں ہی بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے باقی کسی کی فکر نہیں ہے۔ میں صرف اپنے عشق کو بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں راجھے، رومیو اور مجنوں کی طرح بے مراد نہیں رہنا چاہتا۔ میں تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارے ساتھ ایک اچھی اور بہترین زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ پوری دنیا کی خوشیاں تمہارے جھولی میں ڈال دینا چاہتا ہوں۔ تمہارے ساتھ بوڑھا ہونا چاہتا ہوں۔“ میں جذبات کی رو میں بہکنے لگا۔

”ایلی! ایسے خواب مت دیکھا کرو جن کی تعبیر ممکن نہ ہو۔“ اس نے پھیکسی مسکراہٹ سے کہا اور چلی گئی۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ گھرا گیا۔

عالیہ کی مخالفت پورے گاؤں میں چل رہی تھی۔ میرے والد، بھائی اور فلورین یہ بھی عالیہ کے سخت خلاف ہو چکے تھے۔ عالیہ کو دودفعہ مارنے کی کوشش بھی کی جا چکی تھی لیکن میں بروقت اس کی مدد کو آ گیا تھا۔ میں اب چوبیس گھنٹے ایک رائل اپنے ساتھ رکھنے لگ گیا تھا۔ ہر آنے والا دن پہلے دن سے زیادہ مشکل ہو رہا تھا۔ میں عالیہ کو سمجھا سمجھا کر تھک گیا تھا لیکن وہ کسی بھی حالت میں نہیں مان رہی تھی۔ تھوڑے عرصے میں ہی ہمارے گاؤں میں بیس کے قریب غلام مارے جا چکے تھے جبکہ دوسفید نام بھی مارے گئے تھے۔ ہمارا گاؤں بالکل آتش فشاں کے دھانے پر آ گیا تھا جو کسی بھی وقت پھٹ سکتا تھا۔

”ایلی! تمہیں معلوم ہے نا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟“ میں صبح صبح ناشتہ کر کے گھر سے نکلنے لگا جب اچانک فلورین نے مجھے روک لیا۔ وہ میری منگیتر تھی۔

”کیا ہوا ہے؟“ میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

”اچھا؟ تو تمہیں کچھ نہیں پتہ ہے؟ ایلی صاحب ہمارے اس گاؤں کو آگ لگنے والی ہے اور اس آگ کے تم ذمہ دار ہو۔“ اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر غصے سے کہا۔

”اچھا! تو میں کیا کروں؟“ میں بھی جواباً غصے میں آ گیا۔

”ایلی! تم بہت کچھ کر سکتے ہو لیکن تم کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے۔“ اس نے مجھ سے لپٹتے ہوئے کہا۔

”فلورین! یہ سب کچھ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ غلامی کے خلاف بغاوت کی جو آگ بھڑک اٹھی ہے اسے بجھانا اب میرے بس سے باہر ہے۔ یہ آگ اب ہمارے پورے گاؤں اور آس پاس کے درجنوں اور دیہات کو جلا کر بھسم کر دے گی۔ یہ آگ اب یہاں سے آسٹن شہر تک جائے گی۔ جو اس آگ سے بچنا چاہتا ہے وہ اس گاؤں کو چھوڑ کر چلا جائے۔“ میں نے اپنے گھر والوں کو بھی رات کہہ دیا تھا۔ ایک دو دن تک وہ سب جا رہے تھے۔

”فیلی! چار دن کے لئے تم بھی اس گاؤں کو چھوڑ کر چلی جاؤ؟“ میں نے اس کی کمر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ وہ میرے گلے لگی ہوئی تھی۔

”ایلی تم بھی جا رہے ہو؟“ اس نے پر اشتیاق لہجے میں کہا۔

”نہیں فلورین! میرا جینا مرنا یہاں عالیہ کے ساتھ ہے، میں عالیہ کے بغیر کہیں نہیں جاؤں گا۔“ میں نے آہستگی سے اسے گلے سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

”صحیح کہتے ہوا ایللی! ہمارے ہر معاملے کے پیچھے عالیہ ہی تو ہوتی ہے۔ کتنی خوبصورت زندگی تھی تم لوگوں کی اس عالیہ کے آنے سے پہلے۔۔۔ محبت تھی، چاہت تھی اور خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔“ اس نے ایک طویل سانس لیا اور گھر کے اندر چلی گئی جبکہ میں عالیہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ وہاں بیٹھی میرا انتظار ہی کر رہی تھی۔ وہ گھر کے اندر رہنے کی بجائے سرونٹ کوٹر میں ہی رہتی تھی۔ میں کمرے میں گیا تو وہ مائیکل کے بچوں کے ساتھ مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی۔ مائیکل ہمارے سیاہ فام غلام کا نام تھا۔ اس کی شادی ابونے ہی اپنی ایک غلام سے کروائی تھی جس سے اس کے دو بچے بھی تھے۔ سات سال کی بیٹی جبکہ پانچ سال کا بیٹا تھا۔

”تیار ہو عالیہ؟“ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”گڈ مارنگ ایللی سر!“ مائیکل کی سات سالہ بیٹی نے مجھ سے لپٹتے ہوئے کہا۔ وہ مجھ سے کافی مانوس تھی۔ مجھے وہ چھوٹی سی لڑکی بہت پیاری لگتی تھی۔ میں اس کے ساتھ بہت کھیلتا تھا۔ میں نے اس کو اوپر اٹھایا تو وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ میں سفید فام امریکی تھا۔ میرے سنہری بال تھے۔ مائیکل کی بیٹی کو وہ بال بہت اچھے لگتے تھے۔

”چلیں ایللی!“ عالیہ نے مجھ سے کہا تو میں اس کے ساتھ باہر آ گیا۔

”ایللی! یہ صوفیہ ہے، کتنی معصوم ہے۔۔۔ اگلے سال اسے بھی ڈیرے پر بھیج رہے ہیں۔ اس کی ساری معصومیت اور بچپن ایک جھٹکے میں ہی ختم ہو جائے گا۔ سب سے پہلے آپ کے بھائی ہی اس کی عزت لوٹیں گے، پھر مسلح پہریدار اور پھر یہ ایک ایک کر کے سبھی مردوں کے ہاتھ چڑھے گی۔ پچاس ساٹھ سال تک ان مردوں کی حوس کا نشانہ بنے گی اور پھر بوڑھی ہو کر مر جائے گی۔ ایللی! میں ان لوگوں کے لئے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ میں موت سے نہیں ڈرتی۔ شہادت کی موت کی تمنا تو ہمیشہ سے میرے دل میں ہے۔“ وہ میرے آگے آگے چل رہی تھی۔

”ایللی! آزادی کی جدوجہد کے لئے بہا ہوا خون کبھی رائیگاں نہیں جاتا، میری موت بھی رائیگاں نہیں جائے گی۔“ وہ ایک رو میں کہتی چلی جا رہی تھی۔

اسے شاید اپنی موت کا پہلے سے ہی علم ہو گیا تھا۔ ہم ڈیرے پر پہنچے، دوپہر تک ہم نے وہیں ٹائم گزارا اور پھر واپس گھر آ گئے۔ ہمارے جانے کے بعد فلورین اپنے گھر نہیں گئی تھی۔ وہ ہمارے باہر نکلتے ہی سرونٹ

کواٹر میں چلی گئی تھی۔ وہ پورا دن مائیکل کے ساتھ رہی تھی۔

”مائیکل! دیکھ لو آگے تمہاری مرضی ہے۔ میرا کام کر دو تو بدلے میں اپنی آزادی خرید لو۔ میں تمہیں، تمہاری بیوی اور بچوں کو افریقہ واپس بھیج دوں گی۔“ وہ مائیکل کو لیکر اندر کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ مائیکل کے بچے باہر صحن میں کھیل رہے تھے۔

”فلورین میم! یہ بہت خطرناک ہے، میری اس میں جان چلی جائے گی۔“ مائیکل نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

”مائیکل! گاؤں کے حالات تمہیں بھی دکھائی دے رہے ہیں، یہاں آگ لگنے والی ہے۔ اس آگ میں ہم سفید فام تو شاید بچ جائیں کیونکہ ہمارے پاس اسلحہ ہے، پولیس اور فوج ہے۔ لیکن تم لوگ نہیں بچو گے۔ ناکام بغاوت ہوگی اور بدلے میں تم سب مارے جاؤ گے۔“ فلورین نے باہر کھیلنے ہوئے بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میم! اس معاملے میں میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں تو ایک غریب غلام ہوں۔۔۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔“ مائیکل نے جواب دیا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

”مائیکل! اس سارے فساد کی جڑ عالیہ ہے۔ اس عالیہ کے چلے جانے سے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ اسے سمجھانے لگی۔

”فلورین میم! یہ کام میرے بس سے باہر ہے، میں نہیں کر سکتا۔ مجھے اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی عزیز ہے۔ میں آپ بڑے لوگوں کے درمیان آ کر بے موت مارا جاؤں گا۔“ مائیکل نے اس کے آگے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

”ایک بار سوچ لو مائیکل! یا تو تم ہمارے ساتھ ہو یا پھر ہمارے دشمن کے ساتھ۔۔۔ کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔“ فلورین نے اس بار سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”مائیکل! عالیہ کو مار دو ورنہ اگر وہ بچ گئی تو تم اپنے پورے خاندان سمیت مارے جاؤ گے۔ ہم سفید فاموں کی دہشت تم نے دیکھی ہوئی ہے۔ تمہاری آنکھوں کے سامنے پہلے تمہارے بچوں کو مارا جائے گا اور پھر تمہیں۔“

”صوفیہ! ادھر آؤ۔“ فلورین نے آواز دیکر صوفیہ کو بلایا تو وہ بھاگ کر اندر کمرے میں آ گئی۔

”مائیکل! عالیہ کے شوہر عاکون کو لانے کے لئے میں نے ایللی کو دس ہزار ڈالر دیئے تھے۔ میں ایللی کو حاصل کرنے کے لئے پچاس ہزار ڈالر بھی دے سکتی ہوں۔ جبکہ تم اور تمہاری فیملی کو امریکہ بھیجنے کے لئے ایک ہزار ڈالر ہی لگیں گے۔ میرا کام کرو مائیکل اور بدلے میں عزت سے اپنے ملک میں آزادی سے زندگی گزارو۔“ اس نے صوفیہ کو اٹھایا اور اسے اپنے ساتھ لیکر باہر آ گئی۔

دو پہر کو میں اور عالیہ واپس آئے تو میں عالیہ کو سرونٹ کو اسٹریٹ میں چھوڑ کر خود گھر آ گیا۔ اپریل کا مہینہ شروع ہو چکا تھا، سردی ختم ہو چکی تھی اور بہار کا موسم آ گیا تھا۔ میں صبح صبح گھر سے نکلا تھا اور ابھی تھک گیا تھا اس لئے لیٹتے ہی نیند آنے لگی۔ دوسری طرف عالیہ بھی تھک چکی تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو سامنے ہی مائیکل بیٹھا ہوا تھا اس نے مسکرا کر مائیکل کو سلام کیا اور بستر پر لیٹ گئی۔

”عالیہ! گاؤں کے حالات بہت خراب ہو گئے ہیں۔“ مائیکل نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہاں چاچا! معلوم ہے۔“ عالیہ نے مختصر جواب دیا۔

”عالیہ! یہ سب کچھ کیوں کر رہی ہو؟ تمہیں معلوم ہے اس بغاوت کا انجام کیا ہوگا لیکن تم پھر بھی اس آگ سے کھیل رہی ہو؟“ مائیکل نے تیز لہجے میں کہا۔

”چاچا! آگ تو لگ چکی ہے۔ اب تو یہ دیکھنا ہے کہ اس آگ سے کتنے گھروں کو بچایا جاسکتا ہے۔“ عالیہ نے آنکھیں بند کیں اور کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ مائیکل اسے کافی دیر تک گھورتا رہا آخر کار وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور کمرے سے باہر آ گیا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا گھر میں آیا اور وہاں سے سیدھا کچن میں چلا گیا۔ وہ ہمارے گھر کا پرانا غلام تھا اس لئے آزادانہ گھر میں آتا جاتا رہتا تھا۔ اس نے کچن میں رکھی ہوئی ایک بڑی گوشت کاٹنے والی چھری اٹھائی اور دوبارہ بارہر نکل گیا۔ اس بار وہ کوئی دس پندرہ منٹ تک وہیں صحن میں ہی کھڑا رہا اور پھر دل مضبوط کر کے عالیہ کے کمرے میں چلا گیا۔ عالیہ ان سب چیزوں سے بے خبر سو رہی تھی۔ مائیکل نے چھری نکال کر ہوا میں بلند کی، اس نے ایک ہاتھ سے عالیہ کا منہ بند کیا، اس کی چھاتی پر بیٹھا اور چھری کو اپنے سر سے بلند کیا اور پوری طاقت سے اسے عالیہ کے سینے میں گھونپ دیا۔

”آہ۔۔۔“ عالیہ کے جسم کو ایک جھٹکا لگا اور مائیکل کا ہاتھ اس کے منہ سے ہٹ گیا۔ عالیہ کی چیخ نکل گئی۔ اس نے عالیہ کا دوبارہ منہ دبایا اور چھری کا دوسرا ور کیا۔ اس بار عالیہ مزاہمت کرتی رہی لیکن اس کا ہاتھ

منہ سے نہ ہٹا۔ مائیکل نے چھری اس کے سینے سے نکالی اور ایک وار اس کے دل کے مقام پر کیا۔ پرانے زمانے کی دھات کی بنی ہوئی انتہائی بھاری چھری تھی۔ وہ عالیہ کی پسلیوں کو کاٹتی ہوئی اس کے دل پر گھس گئی تھی۔

”عالیہ! تمہیں یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا، یہ جگہ تمہارے لئے نہیں تھی۔“ وہ غصے اور دکھ سے چلاتے ہوئے عالیہ پر وار کر رہا تھا۔

اس نے عالیہ کے منہ سے ہاتھ ہٹالیا تھا اور پے درپے اس کے سینے، پیٹ اور گردن پر چھری کے وار کرنے لگا۔ عالیہ کے منہ سے چیخ نکلی جو سیدھی گھر میں داخل ہو کر میرے کانوں تک پہنچی۔ میں سویا ہوا تھا۔ عالیہ کی چیخ سن کر میں نے بستر سے چھلانک لگائی اور کھڑکی سے کود کر باہر صحن میں آ گیا۔ دروازے کی طرف سے فاصلہ بہت زیادہ تھا۔ میں صحن میں گرا اور پھر جلدی سے اٹھ کر بھاگتا ہوا عالیہ کے کمرے کی طرف جانے لگا۔ ایک منٹ میں ہی میں نے صحن کر اس کیا اور عالیہ کے کمرے کو دھکا مار کر کھولا اور اندر کمرے میں آ گیا۔ اندر کمرے کا منظر دیکھ کر مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ سامنے عالیہ خون میں لت پت پڑی ہوئی تھی اور مائیکل انتہائی جنونی انداز میں اسے چھریاں مار رہا تھا۔ میں نے دھکا دے کر اسے عالیہ کے اوپر سے گرایا اور عالیہ کو دیکھنے لگا۔

”ایلی! مائیکل کا کوئی قصور نہیں ہے، اسے معاف کر دینا۔“ عالیہ نے اٹکتے ہوئے لہجے میں کہا، وہ مرتے ہوئے بھی اپنا خون معاف کر رہی تھی۔

”عالیہ! یہ کیسے ہو گیا؟“ میں نے اس کا سراپنی گود میں رکھ لیا۔

”عالیہ! میں تمہارے بغیر کیسے رہوں گا؟“ میں اس کے نکلتے ہوئے خون کو ہاتھ سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ایلی! میرے پاس صرف اتنا ہی وقت تھا، میں جا رہی ہوں۔“ اس کی سانس اکھڑنی شروع ہو گئی۔

”عالیہ! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا، میں بھی مر جاؤں گا۔ یہ زندگی تمہارے بغیر بے معنی ہے۔“ میں نے خون آلود ہاتھوں سے اس کی زلفیں سنوارتے ہوئے کہا۔

”ایلی! ایک وعدہ کرو کہ میرے بعد خودکشی نہیں کرو گے اور کسی سے بدلہ نہیں لو گے؟“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے سر ہلایا تو وہ مطمئن ہو گئی۔

”ایلی! میرے اس مشن کو آگے ضرور بڑھانا آزادی سب کا حق ہے۔“ اس نے چار پانچ جھٹکے لئے اور ساکت ہو گئی۔ وہ مر گئی تھی، نہیں بلکہ وہ شہید ہو چکی تھی۔ میں اس کے مردہ جسم کو سینے سے لگائے زار و قطار رونے لگ گیا۔ ابو اور دوسرے بھائی عالیہ کی چیخیں سن کر کمرے میں آچکے تھے۔ فلورین اور دوسرے بھی گھر والے کمرے میں آگئے تھے۔

مائیکل! غدار! ہم نے تمہیں اپنے گھر کا ایک فرد سمجھا اور تم نے ہمارے ہی اعتماد کو ٹھیس پہنچائی؟“ ابو اور دوسرے بھائی مائیکل کو مارنے لگے۔

”مالک معاف کر دیں مجھ سے غلطی ہو گئی، مالک مجھے معاف کر دیں۔“ مائیکل ان لوگوں کے پکڑ رہا تھا۔

”نہیں! تم اس قابل نہیں ہو، تم کسی بھی رحم کے قابل نہیں ہو۔“ ابو نے رائفل کی نال اس کے سر کو لگائی، وہ اسے بھی فوٹی کی طرح ماردینا چاہتے تھے۔ میں جلدی سے اٹھا اور ابو کی رائفل پکڑ لی۔

”ابو! آپ سب باہر جاؤ۔“ میں نے جھٹکا دے کر رائفل چھینی اور اسے ایک سائیڈ پر پھینک دیا۔

”ایلی! یہ لوگ رحم کے قابل نہیں ہیں۔۔۔ تمہاری وجہ سے پہلے ہی یہ لوگ ہمارے گریبان تک آگئے ہیں۔“ ابو اس کی طرف بڑھنے لگے لیکن میں درمیان میں آگیا۔

”سارے لوگ کمرے سے باہر نکل جاؤ! آخری بار کہہ رہا ہوں ورنہ اس مری ہوئی عالیہ کی قسم میں ایک ایک کوز مین پر بچھا دوں گا۔“ میں نے جیب سے پستل نکال کر اسے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

”ایلی بیٹا! ہم تمہارے اپنے ہیں۔“ امی نے میری طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”امی! دروازہ اس طرف ہے۔“ میں نے پستول کا بلٹ مارا اور ان کی طرف پستول کر دیا۔

”ایلی! تم اپنی ماں پر پستول تان رہے ہو؟“ ابو نے غصے سے کہا۔

”ابا! خدا کے لئے باہر چلے جائیں ورنہ یقین کریں میں سب کو ماردوں گا۔ میں بھول جاؤں گا کہ یہاں میرا کوئی رشتہ دار بھی ہے۔“ میں نے ان کے ماتھے پر پستول رکھ دیا۔ وہ باہر چلے گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے باقی گھر والے بھی چلے گئے۔ میں نے مائیکل کی بیٹی صوفیہ کو بازو سے پکڑ کر کمرے میں لایا اور دروازہ بند کر دیا۔

”مائیکل! کس کے کہنے پر عالیہ کو مارا ہے؟“ میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔ وہ ابھی تک گھٹنوں میں اپنا

سردے کر بیٹھا ہوا تھا۔

”مالک! مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔“ اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”مائیکل! نام کیا ہے؟ کس کے کہنے پر عالیہ کو مارا ہے؟“ میں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

”مالک! میں بہت غریب آدمی ہوں، غلام ہوں۔۔۔ میری کوئی اوقات نہیں ہے۔“ اس نے رحم دلانہ

نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”مائیکل! میں نے زندگی میں کبھی کسی مظلوم پر ہاتھ نہیں اٹھایا ہے لیکن آج اس عالیہ کی خاطر میں وہ بھی

کر گزروں گا۔“ میں نے اس کی بیٹی صوفیہ کو پکڑا اور پستول کی نال اس کے سر پر لگا دی۔

”مالک! میں نام نہیں بتا سکتا، وہ بہت طاقت ور ہے۔“

”مائیکل! نام بتاؤ۔۔۔“ میں نے چیختے ہوئے کہا۔

”میں ہوں ایللی! قتل اس نے میرے کہنے پر کیا ہے۔“ فلورین نے دروازے کو دھکا دے کر کھولا اور

اندر کمرے میں آ گئی۔

”ایللی! عالیہ کو میرے کہنے پر مارا گیا ہے۔“ وہ میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔۔۔

”کیوں۔۔۔؟ کیوں کیا یہ سب کچھ؟“ میں نے پستول کی نال اس کے سر پر لگا دی۔

”ایللی! میرے بیٹے غصے مت کرو۔۔۔ ہم بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ ابو نے جلدی سے درمیان میں

بولتے ہوئے کہا۔

”نہیں انکل! آپ ٹھہر جائیں، اس معاملے کو آج نمٹ جانے دیں۔“ فلورین نے انہیں روک دیا۔

”کیوں؟ کیوں کیا تم نے یہ سب؟“ میں دوبارہ اس سے پوچھنے لگا۔

”ایللی! وجہ چھوڑو، فائر مارو۔۔۔ انتظار کس چیز کا کر رہے ہو؟ تم کیا سمجھتے ہو کہ محبت صرف تمہیں ہی کرنا

آتی ہے؟“ وہ میرے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”فلورین! تم نے بہت غلط کیا ہے۔۔۔ یہ سب کچھ کر کے تم کبھی بھی مجھے نہیں پاسکتی۔“ میں نے رائفل

کی نال نیچے کر لی۔

”ایللی! محبت میں سب جائز ہوتا ہے، تم گولی مارو اور اس محبت کو بھی ختم کر دو۔“ اس نے پستول دوبارہ

اپنے سینے پر رکھ لیا۔

”یار! اس کا کیا تصور تھا؟ اس بے چاری کو کس جرم کی سزا ملی ہے؟“ میں نے غصے سے پستول ایک کونے میں پھینکا اور عالیہ کی خون آلود لاش کے قریب بیٹھ گیا۔

”ایلی! اس کا کوئی تصور نہیں تھا، اسے صرف یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“ وہ میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

”فلورین! میں محبت کرتا تھا اس سے، تم نے دو پیار کرنے والوں کو جدا کیا ہے۔ تم کبھی بھی خوش نہیں رہو گی۔“ میں نے غصے سے اسے دھتکار تے ہوئے کہا۔

”کون دو پیار کرنے والے ایلی؟ میں نہیں بلکہ یہ عالیہ درمیان میں آئی ہے۔ پیار تو ہم دونوں کرتے تھے۔ یہ عالیہ ہمارے درمیان میں آئی ہے۔ اس کی کوئی جگہ نہیں تھی یہاں، ہم اس سے پہلے بھی یہاں خوش تھے اور اس کے جانے کے بعد بھی خوش رہیں گے۔“ وہ ایک بار پھر میرے نزدیک آ گئی۔

”فلورین! تم نے بہت بڑا گناہ کیا ہے، بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ اس گناہ کی سزا موت نہیں ہے بلکہ موت تو بہت آسان سی سزا ہے، تمہیں زندہ رہنا ہے۔ اسی دنیا میں اپنے گناہوں کی سزا پوری کرنا ہے اور پھر مرنے کے بعد بھی دوزخ ہی تمہاری اصل جگہ ہوگی۔“ میں وہاں سے اٹھا اور گھر سے باہر آ گیا۔ ہمارے گھر کے سامنے ہی ایک نہر بہتی تھی، میں نہر کے کنارے پر لگے ہوئے ایک درخت کا سہارا لیکر بیٹھ گیا۔ مائیکل کی بیٹی صوفیہ بھی میرے نزدیک آ کر بیٹھ گئی۔

”چاچو! عالیہ باجی کو کیا ہوا ہے؟“ اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی کلاںیاں میری گردن کے گرد حائل کیں اور معصومیت سے پوچھنے لگی۔ اسے چاچا کہنا عالیہ نے ہی سکھایا تھا۔ وہ کبھی کبھی مجھے چاچا کہا کرتی تھی۔

”صوفیہ! تمہاری چاچی مر گئی ہے، وہ بے چاری مر گئی ہے۔“

”اسے ابونے مارا ہے؟“ صوفیہ نے اگلا سوال کیا۔

”نہیں میرے بچے! تمہارے بابا تو بہت اچھے ہیں وہ کیوں عالیہ کو ماریں گے؟“ میں نے جلدی سے اسے سینے لگاتے ہوئے کہا۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکلنے لگے۔

”ایلی! صوفیہ کی معصومیت کے لئے آگے نہیں بڑھو گے؟“ مجھے عالیہ کے ساتھ کیا ہوا وعدہ یاد آ گیا۔ مجھے اس کے مشن کو آگے بڑھانا تھا۔ میں نے اس کا بازو پکڑا اور واپس گھر آ گیا۔ گھر میں وہی پرانا ماحول بنا ہوا تھا۔ ایک درخت کے ساتھ مائیکل کو الٹا لٹکایا ہوا تھا اور ابو پورے زور شور سے اسے کوڑے مار رہے

تھے۔

”چاچو! ابو کو کیوں مار رہے ہیں؟“ ننھی صوفیہ کا دل اپنے والد کو کوڑے کھاتے ہوئے دیکھ کر دہل گیا تھا۔

”بیٹا! ہم امریکی انسان نہیں ہیں، ہم تو جانوروں سے بھی بدتر قوم ہیں۔ اتنا ظلم تو جانور بھی نہیں کرتے ہیں۔“ میں نے اس کی نرم گالوں کو چومتے ہوئے کہا۔

”چاچو! ابا کو بچالیں۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“ اس ننھی سی بچی نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ میں عالیہ کی موت سے ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ عالیہ کے عشق میں میں فنا ہو چکا تھا۔ اس کی اچانک موت نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ عالیہ کے ساتھ میں بھی مرجانا چاہتا تھا۔ میں مائیکل، فلورین اور اپنے والد تینوں کو عالیہ کی موت کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔ میں عالیہ کی موت کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ میں ان تینوں کا خون کرنا چاہتا تھا۔ میں ان تینوں کو عبرت کا نشان بنا کر خود بھی مرجانا چاہتا تھا لیکن مجھے عالیہ کا عشق اس چیز سے روک رہا تھا۔ میں نے عالیہ کے مقصد کو آگے بڑھانا تھا۔ وہ غلامی کے خلاف لڑنا چاہتی تھی۔ وہ صوفیہ اور اس جیسی لاکھوں معصوم سیاہ فام بچیوں کو آزاد کروانا چاہتی تھی۔ وہ اس دنیا سے غلامی کی لعنت کو ختم کر دینا چاہتی تھی۔ وہ سیاہ فام قوم کو آزاد کروانا چاہتی تھی۔ میں زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھا اور اس معصوم صوفیہ کو گلے سے لگا لیا۔

”میری بچی! میں تمہارے باپ کو ہی نہیں تمہاری پوری قوم کو بھی بچاؤں گا۔ خدا نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں تمہیں غلام بنانے والے؟“ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اپنی آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں کو صاف کیا اور لٹکتے ہوئے مائیکل کے پاس آ گیا۔ میں نے ابو کے ہاتھ سے کوڑا لیکر اسے ایک طرف پھینکا اور مائیکل کی رسی کھول کر اسے نیچے اتار دیا۔

”ایلی! اس نے عالیہ کو قتل کیا ہے، یہ کسی بھی رحم کے قابل نہیں ہے۔“ ابو نے غصے سے کہا۔

”ابو! عالیہ میری تھی، وہ میری محبت تھی، میری غلام تھی اور میرا سب کچھ تھی۔ میں عالیہ کا قتل معاف کرتا ہوں۔ میں اپنی عالیہ کا خون معاف کرتا ہوں۔ جاؤ مائیکل! گھر جاؤ، میں نے خدا کے نام پر تمہیں معاف کر دیا ہے۔“ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اوپر اٹھانا چاہا لیکن وہ میرے پیروں میں ہی بیٹھ گیا۔

”ایلی بابا! میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے، میں معافی کے قابل نہیں ہوں۔“ وہ میرے پاؤں پکڑ کر

کہنے لگا۔

”مائیکل! میں خدا کے نام پر تمہیں چھوڑ رہا ہوں۔ وہ خدا بہت بڑا ہے، وہ بھی تمہیں معاف کر دے گا۔“
میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور اسے اس کے کمرے میں بھیج دیا۔

”فلورین! میں تم سے شادی کے لئے تیار ہوں، صرف ایک شرط پر میں واشنگٹن جانا چاہتا ہوں۔
تمہارے والد بہت بڑے آدمی ہیں۔ فیکس کے گورنر بھی تمہارے رشتہ دار ہیں اور وائیٹ ہاؤس میں بھی
تمہارے والد کی پارٹی برسر اقتدار ہے۔ مجھے وائیٹ ہاؤس جانا ہے؟“ میں نے سامنے کھڑی فلورین کی
طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایلی! میں سب کچھ کروں گی تمہارے لئے۔۔۔ وائیٹ ہاؤس کے انچارج کرنل جوزف میرے
والد کے ساتھ پڑھتے رہے ہیں، وہ ہماری مدد کریں گے۔“ فلورین جلدی جلدی سے بولنے لگی۔
”ٹھیک ہے فلورین! اپنے والد سے بات کر لو، میں جلد سے جلد شادی کر کے واشنگٹن جانا چاہتا ہوں۔“
میں عالیہ کے کمرے کی طرف جانے لگا۔

”ایلی! مجھے معاف کر دینا، میں ہمیشہ تمہیں خوش رکھوں گی۔“ فلورین نے مجھے بازو سے پکڑ کر کہتے
ہوئے کہا۔

”فیملی! یہ دونوں کام میں نہیں کر سکوں گا۔ نہ میں تمہیں معاف کر سکتا ہوں اور نہ ہی خوش رہ سکتا ہوں۔
تمہیں اس بے چاری عالیہ کو نہیں مارنا چاہیے تھا۔ وہ میری زندگی تھی، اس کے بغیر تو اب خالی ایلی ہی رہ گیا
ہے۔ اس ایلی نے اب خوش رہنا ہی چھوڑ دیا ہے۔“ میں نے اس سے اپنا ہاتھ چھڑوایا اور عالیہ کے پاس آ
گیا۔ اندر کمرے کو صاف کر دیا گیا تھا۔ خون آلود بستر کو اٹھا کر باہر رکھ دیا گیا تھا اور عالیہ کو صاف سفید چادر
میں لپیٹ دیا گیا تھا۔ وہ زمین پر سفید چادر اوڑھے پڑی تھی۔ اس کا چہرہ اکھلا ہوا تھا۔ میں خاموشی سے اس
کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

”عالیہ! یہ زندگی بہت بڑی ہے یار، بہت لمبی زندگی ہے۔ کیسے کٹے گی یہ زندگی تمہارے بغیر؟“ میں
اس کے سرہانے بیٹھ کر رونے لگ گیا۔

”صبر کرو میرے بیٹے! خدا کو یہی منظور تھا۔“ ابو نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
”نہیں ابو! آپ لوگ جو اس زمین پر خدا بنے ہوئے ہو۔۔۔ آپ کو ہی عالیہ منظور نہیں تھی۔ ابا! یہ تو مر

گئی ہے، جیسی بھی تھی مرگئی۔ ایک دن آپ نے بھی مرجانا ہے۔ قیامت والے دن اس عالیہ کا ہاتھ آپ کے گریبان پر ہوگا۔ ابا! اتنا ظلم مت کریں کہ آگے جا کر جواب دینا مشکل ہو جائے۔“ میں عالیہ کے سانولے چہرے کو دیکھنے لگا۔

دوسرے دن صبح دس بجے کے قریب عالیہ کو دفنا دیا گیا اور شام کو میری اور فلورین کی شادی ہو گئی۔ ہم دونوں نے انتہائی سادگی سے شادی کی تھی۔ دو دن گاؤں میں رہنے کے بعد ہم واشنگٹن کی طرف چل پڑے۔ فلورین کے والد میرسر لیون بھی ہمارے ساتھ واشنگٹن آ گئے۔ انہوں نے اپنے دوست کرنل جوزف سے کہہ کر مجھے وائیٹ ہاؤس میں ملازم کروا دیا۔ اس وقت امریکہ کے صدر ابراہم لنکن تھے۔

ابراہم لنکن امریکہ کے سولہویں صدر تھے۔ یہ 1809ء میں امریکی ریاست کیپٹکی میں پیدا ہوئے۔ یہ انتہائی غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے بچپن میں بہت مزدوری کی تھی۔ سیاہ فام غلاموں کے ساتھ کام کر کے انھوں نے ان کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ لنکن انسانی غلامی سے نفرت کرتے تھے اور سخت خلاف تھے۔ وہ امریکہ کو انسانی غلامی سے آزاد کروانا چاہتے تھے۔ 1860ء میں وہ امریکہ کے صدر بنے۔ ہم ان کے صدر بننے کے ایک سال بعد وائیٹ ہاؤس آئے تھے۔ میں چونکہ انگلش، فرینچ، افریقین اور انڈین معاشرے کو سمجھتا تھا۔ میں فرانسیسی اور ہندی زبانوں کے علاوہ افریقہ کی بھی کافی ساری زبانیں جانتا تھا۔ اس کے علاوہ اسلام کے بارے میں بھی مکمل معلومات رکھتا تھا۔ اس دور میں امریکہ صنعتی طور پر کافی آگے بڑھ رہا تھا۔ امریکہ دوسرے براعظموں میں بھی قسمت آزمائی کر رہا تھا۔ ان حالات میں پڑھے لکھے نوجوانوں کی بہت ضرورت تھی۔ میری وائیٹ ہاؤس میں انٹری تو فلورین کے والد کی وجہ سے ہوئی تھی۔ میں کرنل جوزف کی سفارش پر وائیٹ ہاؤس میں ملازم ہوا تھا لیکن اس سے آگے میری محنت تھی جو بہت جلد ہی مجھے امریکی صدر لنکن تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ وائیٹ ہاؤس میں کام کرنے والے باقی افراد نوکری صرف پیسے اور اقتدار کے لئے کر رہے تھے لیکن میں یہ سب کچھ ایک مقصد کے تحت کر رہا تھا۔ مجھے عالیہ کے خواب کو پورا کرنا تھا۔ میں اس دنیا سے غلامی کی ختم کرنے کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔ اس کام میں خدا کی غیبی مدد بھی میرے ساتھ تھی۔ میں کامیابی کے زینے طے کرتے کرتے صدر لنکن تک پہنچ چکا تھا۔ میں انٹرنیشنل ان فیئر میں ان کا نوجوان مشیر بن چکا تھا۔

”ایلی بچے! تم بہت محنتی لڑکے ہو، انتہائی ذہین اور محنت کرنے والے۔۔۔ تم بہت اوپر تک جاؤ گے۔“

شام کو حسب معمول میں صدر صاحب کو بریفنگ دینے کے بعد واپس جانے لگا تو انھوں نے مسکراتے ہوئے میری حوصلہ افزائی کی۔

”سر! انسان اس دنیا میں آتا ہے، مزدوری کرتا ہے، بچے پیدا کرتا ہے اور ایک دن خاموشی سے مر جاتا ہے۔ موت سے اوپر تو کچھ نہیں ہوتا ہے سر؟“ میں نے اداس لہجے میں کہا اور واپس جانے لگا۔

”ایلی! مجھے تمہاری بات کی سمجھ نہیں آئی ہے۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ انھوں نے الجھتے ہوئے کہا۔

”سر! آپ اسلام کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟“ میں نے مختصر سوال کیا۔

”ہاں! اسلام کے بارے میں کافی پڑھا ہوا ہے میں نے۔ مجھے تاریخ پڑھنے کا شوق ہے اور میں نے اسلامک ہسٹری پڑھی ہوئی ہے۔“ انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ نے حضرت عمر رضی اللہ کا نام سنا ہے؟ یہ مسلمانوں کے دوسرے حکمران (خلیفہ) تھے۔“ میں نے اگلا سوال کیا۔

”ہاں! میں انہیں جانتا ہوں، اسلامی دنیا کے بہت بڑے اور طاقت ور حکمران تھے۔ بیت المقدس انہی کے دور میں مسلمانوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔“ انہوں نے وضاحت سے جواب دیا۔ میں ان کے نزدیک آکر کھڑا ہو گیا۔

”ایلی! میں اب بھی تمہارا مطلب نہیں سمجھا ہوں؟“ انہوں نے خجندیگی سے کہا۔

”سر! حضرت عمر کہتے تھے کہ دریاۓ فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر جائے تو اس کا سوال قیامت کے دن خدا عمر سے پوچھے گا۔ سر! آپ امریکہ کے صدر ہو، یہاں امریکہ میں کتنے انسان مر رہے ہیں، لاکھوں غلام ہیں امریکہ میں اور کروڑوں اس دنیا میں۔ قیات والے دن یہ سب آپ سے سوال کریں گے!“ میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایلی! تمہیں معلوم ہے کہ امریکہ کی پوری معیشت اس غلامی کے کاروبار پر ٹکی ہوئی ہے؟ یہ سیاہ فام غلام نہیں ہوں گے تو امریکہ کے کھیت اور کارخانے ویران ہو جائیں گے۔“ وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

”سر! وہ جانور نہیں ہیں بلکہ انسان ہیں۔ صرف رنگ کالا ہے باقی ان میں اور ہم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کے بھی ماں باپ ہوتے ہیں، بیوی بچے ہوتے ہیں اور بہن بھائی ہوتے ہیں۔ وہ جانور نہیں

ہیں بلکہ وہ بھی ہماری طرح ہی سوچتے ہیں۔ انہیں بھی ہماری طرح درد ہوتا ہے سر! قیامت والے دن آپ کیسے ان لوگوں کا سامنا کریں گے؟“ میں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

”ایلی! ان لوگوں کا درد میں محسوس کرتا ہوں۔ ان غلاموں کے ساتھ میں نے بھی زندگی گزاری ہے۔ میں ان کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں لیکن میرے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے۔“ انہوں نے بے بسی سے کہا۔

”سر! خدا نے آپ کو زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچایا ہے۔ آپ ایک موبچی کے بیٹے ہو کر امریکہ کے صدر بنے ہیں تو اس میں خدا کی مصلحت ہے۔ شاید اس غلامی کو ختم کرنا خدا نے آپ کے ہاتھ میں لکھا ہوا ہے؟“ میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

”ایلی! یہ بہت بڑی جنگ ہے۔ جنوبی ریاستیں امریکہ سے الگ ہونے کی جدوجہد کر رہی ہیں۔ لڑائی شروع ہوئی تو کہیں امریکہ ہی نہ ٹوٹ جائے؟“ انہوں نے فکر مندی سے کہا۔

”سر! خدا کو مانتے ہیں آپ؟“ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تو میں مزید کہنے لگا۔

”سر! وہ جو اوپر آسمان میں خدا بیٹھا ہوا ہے نا وہ سب کچھ دیکھتا ہے۔ وہ کبھی کسی کا برا نہیں کرتا۔ آپ اگر سچے دل سے اس خدا کی راہ میں لڑیں گے تو وہ کبھی بھی آپ کا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔ یہ امریکہ ٹوٹے گا نہیں بلکہ ایک عظیم طاقت بن کر اس دنیا کے نقشے پر ابھرے گا۔ اگر اس دنیا سے غلامی ختم ہوگئی تو تاریخ میں آپ کا نام سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ سر! لوگ پیدا ہوتے ہیں، مزدوری کرتے ہیں، بچے پیدا کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ آپ ان میں سے نہیں ہو۔ ان بے چارے سیاہ فام غلاموں کے لئے کچھ کر جائیں تاریخ آپ کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔“ میں نے ان کو سلام کیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ دوسرے دن ہی انہوں نے امریکی پارلیمنٹ میں انسانی حقوق پر ایک دھواں دار تقریر کی۔ انہوں نے امریکہ اور پوری دنیا سے غلامی کو ختم کرنے کے لئے جدوجہد کا اعلان کر دیا۔

”ریاست ہائے متحدہ امریکہ کسی بھی حالت میں انسانی غلامی کو قبول نہیں کرے گا۔ یہ آخری آدمی اور آخری گولی تک لڑیں گے۔ اس دنیا میں غلامی کے لئے اب کوئی جگہ نہیں ہے۔“ امریکی صدر لنکن کی آواز پورے ہال میں گونج رہی تھی۔ میں ان سے تین قدم پیچھے کھڑا پورے ہال کو دیکھ رہا تھا۔ لوگ چلا رہے تھے، گالیاں دے رہے تھے لیکن صدر صاحب کے چہرے پر ایک سلوٹ تک نہیں آئی تھی۔ وہ پر عزم لہجے میں بول رہے تھے۔ میں نے اوپر چھت کی طرف دیکھا تو مجھے عالیہ بھی نظر آ گئی۔ سفید کپڑوں میں ملبوس وہ جنت

سے آئی ہوئی حور لگ رہی تھی۔

”عالیہ!“ میں نے آہستہ آواز میں اسے پکارا۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آئے۔

”ایلی! اس دنیا میں محبت تو بڑے بڑے لوگ کر گئے ہیں لیکن تمہاری محبت ان سب سے آگے ہے۔ تم محبت کے آسمان پر چمکتا ہوا ستارہ ہو جو کبھی غروب نہیں ہوگا۔“ وہ مسکراتے ہوئے میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں دوبارہ صدر صاحب کو بولتے ہوئے دیکھنے لگا۔ وہ کوئی دو گھنٹے تک مسلسل بولتے رہے پھر خاموش ہو گئے۔

”امریکی ریاست مائن سے لیکر دریائے ریو گرانڈے کے کنارے تک امریکہ ہے اور میں اس امریکہ کا صدر ہوں۔ میں ایک ایک گاؤں، شہر، ڈیرے اور کارخانے پر جا کر لڑوں گا اور مر جاؤں گا لیکن اس غلامی کو قبول نہیں کروں گا۔ خدا نے سب کو آزاد پیدا کیا ہے تو ہم کون ہوتے ہیں انہیں غلام بنانے والے؟“ انہوں نے عالیہ کے کہے ہوئے الفاظ دہرائے اور سٹیج سے نیچے اتر آئے۔

”ایلی! جان دے سکتے ہونا اس مقصد کے لئے؟“ انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”سر! کہیں بھی، کسی بھی محاذ پر بھیجیں یہ ایلی کبھی پیچھے نہیں ہٹے گا۔“ میں ان کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور واپس چلے گئے۔

امریکہ میں تناؤ کی کیفیت تو بہت پہلے سے ہی تھی لیکن لنکن صاحب کی تقریر نے حلقی پر تیل کا کام کیا۔ پورے امریکہ میں ہنگامے پھوٹ پڑے اور امریکہ کی مغربی ریاستوں نے آزادی کا مطالبہ کر دیا۔ امریکی سول وار کا آغاز ہو گیا۔ یہ امریکہ کی تاریخ کی سب سے بڑی جنگ تھی۔ جو 1861ء سے لیکر 1865ء تک چار سال تک لڑی گئی۔ یہ انسانی حقوق کے لئے لڑی جانے والی دنیا کی پہلی اور آخری جنگ تھی جو امریکہ کی شمالی اور جنوبی ریاستوں کے درمیان لڑی گئی۔ امریکی صدر ابراہم لنکن کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ وہ آخری غلام کی آزادی تک لڑیں گے۔

چار سال کی اس طویل ترین جنگ میں دس لاکھ سے زائد لوگ مرے جن میں 80 ہزار سیاہ فام غلام بھی تھے۔ امریکہ کی جنوبی ریاستوں کا سارا دار و مدار کپاس کی کاشت پر تھا۔ کپاس کی کاشت کے لئے غلاموں کی ضرورت تھی۔ جنوبی ریاستیں اسی لئے غلامی کی حق میں تھیں لیکن صدر لنکن غلامی ختم کرنا چاہتے تھے۔ یہ

جنگ چار سال تک چلتی رہی۔ میں بھی اس جنگ میں ہر محاذ پر جا کر لڑتا رہا۔ خدا نے اس دنیا سے غلامی کو ختم کرنا تھا اس لئے کامیابی ہمارے ہاتھ میں آئی۔ امریکی افواج نے پورے یورپ پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ صدر براہم لنکن نے ایک تاریخی معاہدے پر دستخط کئے اور اس دنیا سے انسانی غلامی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔

”ایلی! خوش ہونا؟ آج ہم نے اس دنیا سے غلامی کی لعنت کو ختم کر دیا ہے۔ آج سے مائیں آزاد بنچے پیدا کریں گی اور ان کے بچے بڑے ہوں گے، مزدوری کریں گے، بچے پیدا کریں گے اور پھر مرجائیں گے۔ ایلی 1 وہ بچے آزاد مرین گے۔ آج کے بعد کوئی غلام نہیں ہوگا۔ سب آزاد جنیں گے اور آزاد مرین گے۔“ انہوں نے معاہدے پر دستخط کئے تو ہال تالیوں کی آواز سے گونج رہا تھا۔ میں بھی ان کے لئے تالیاں بجا رہا تھا۔ میں ان کے پیچھے کھڑا تھا۔ تالیوں کی آواز میں بھی مجھے ان کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”سر! یہ تاریخ ہمیشہ آپ کو زندہ رکھے گی۔ ساری دنیا آئے گی اور اپنی اپنی زندگی جی کر مرتی جائے گی لیکن آپ ہمیشہ لوگوں کے دلوں میں زندہ رہیں گے۔ ہماری آنے والی نسلیں آپ کو یاد رکھیں گی۔“ میں نے ان کے کندھے کو تھپتھپایا اور ہال کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں وہاں سے سیدھا اپنے گھر آ گیا۔ فلورین میرے دو سالہ بیٹے میکس براؤن کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ فلورین سے شادی کے بعد میرا ایک بیٹا میکس براؤن پیدا ہوا تھا۔ میں ان کے پاس جا کر بیٹھا اور میں نے اپنے بیٹے کو گلے سے لگا لیا۔

”ایلی! مبارک ہو آج تم جیت گئے ہو۔۔۔ انسانی غلامی کا آج خاتمہ ہو گیا ہے۔“ فلورین نے مجھے مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔

”فیلی! میکس کو لیکر واپس ٹیکساس چلی جانا وہیں برنٹ گاؤں میں۔۔۔ یہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ رہے گا تو اسے باپ کی کمی محسوس نہیں ہوگی۔“ میں اپنے بیٹے کو گلے سے لگاتے ہوئے بے اختیار روئے لگ گیا۔

”ایلی! تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں ادھر تمہارے ساتھ ہی رہوں گی۔“ فلورین نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

”فلورین! آج اگر عالیہ زندہ ہوتی تو وہ بھی آزاد ہوتی۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایلی! تم ابھی تک عالیہ کو بھولے نہیں ہو؟ تم آج بھی اس کی موت کا بدلہ لینا نہیں بھولے ہو؟“ اس

نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

”فلورین! یہ بدلہ نہیں ہے۔ عشق کرنے والے کبھی بدلہ نہیں لیتے۔“ میں نے دور خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

”تو پھر کیوں چھوڑ کر جانا چاہتے ہو؟“ اس نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”فلورین! میں عالیہ کی خوشبو کو محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ وہ اب بھی یاد آتی ہے اور پوری شدت سے یاد آتی ہے۔ میں اس کے گھر جانا چاہتا ہوں۔ ان گلیوں ان بازاروں کی مٹی کو آنکھوں سے لگانا چاہتا ہوں جہاں میری عالیہ کے قدم پڑے ہیں۔ میں باقی زندگی عالیہ کے علاقے میں گزارنے چاہتا ہوں۔“ میں نے ایک بار پھر بیٹے کو گلے سے لگا لیا۔ میں اسے سینے سے لگائے ہوئے تھا۔

”ایلی! عالیہ کی خوشبو تو برنٹ گاؤں میں بھی آتی ہے، پھر تم کیوں ہم سب کو چھوڑ کر جا رہے ہو؟“ فلورین میرے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

”ایلی پلیز! میرے لئے نہیں تو اپنے اس بچے کے لئے ہی رک جائیں؟“ اس نے میرے آگے ہاتھ باندھ دیئے۔

”فلورین! ادھر سینے میں میرے پاس دل ہی نہیں ہے۔ دکھ، درد، تکلیف، خوشی اور غمی مجھے کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا۔ جس دن عالیہ مری تھی نایا ایلی بھی اسی دن مر گیا تھا۔ یہ تو اس کا عشق ہے جو مجھے ابھی تک زندہ رکھ رہا ہے اور پتہ نہیں اور کتنے برسوں تک زندہ رکھے گا۔ اپنی اولاد سے محبت سبھی کو ہوتی ہے لیکن یقین کرو یہ محبت عالیہ کے عشق کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔“ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”فلورین! ریاست بہاولپور میں عالیہ کے ماں باپ ہوں گے بہن بھائی ہوں گے۔ میں وہاں ان کے ساتھ جا کر رہنا چاہتا ہوں۔ ان کے اندر سے عالیہ کی خوشبو آتی ہوگی، میں اس خوشبو کو سونگھنا چاہتا ہوں۔ اس ماحول میں رہنا چاہتا ہوں جس ماحول میں عالیہ نے آنکھ کھولی۔“ میں نے اپنے بیٹے میکس براؤن کے گالوں کو چومو اور باہر کی طرف چل پڑا۔

”ایلی! میرے گناہوں کی سزا اپنے بیٹے کو کیوں دے رہے ہو؟ اس کا کیا قصور ہے جو یہ بغیر باپ کے زندگی گزارے گا؟“ اس نے مجھے پیچھے سے آواز دی۔

”فلورین! قصور تو عالیہ کا بھی نہیں تھا۔ اسے بھی تم لوگوں نے بغیر کسی وجہ کے مارا تھا۔ محبت میں سب

جائز ہوتا ہے یہی کہا تھا نا تم نے؟ آج پھر شکوہ کس بات کا کر رہی ہو؟ وہ بھی محبت تھی اور یہ بھی محبت ہے۔ یہ عشق ہے جو ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتا۔“ میں نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔

واشنگٹن ڈی سی سے اسی دن میں بالٹی مور آ گیا۔ یہ واشنگٹن سے صرف 60 کلومیٹر کے فاصلے پر ایک بڑا شہر تھا۔ یہاں سے روزانہ ایک بحری جہاز برطانیہ اور یورپ کے لئے جاتا تھا۔ میں نے برطانیہ جانے والا بحری جہاز پکڑا اور ایک مہینے کا طویل سفر کر کے برطانیہ آ گیا۔ میرے پیچھے وائٹ ہاؤس میں لوگ مجھے ڈھونڈتے رہے لیکن میں وہاں سے نکل چکا تھا۔ برطانیہ پہنچنے کے بعد میں یہاں رکنے کی بجائے پہلے دستیاب جہاز سے ہندوستان آ گیا۔ اس زمانے میں ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ میں جہاز کے ذریعے پہلے بمبئی پہنچا تھا اور پھر وہاں سے سورت احمد آباد، جودھ پور اور بریکانیر سے ہوتا ہوا ریاست بہاوپور آ گیا۔ مجھے عالیہ کے گاؤں کا نمبر پتہ تھا۔ انگریزوں نے دریائے ستلج سے ایک بڑی نہر نکالی تھی جو آگے چولستان کے وسط تک جاتی تھی۔ یہ ڈیزل برائچ تھی۔ اس نہر کے کنارے پر درجنوں دیہات کو آباد کیا گیا تھا۔ عالیہ کا گاؤں اسی ڈی بی برائچ کے اوپر واقع تھا۔ میں آسانی سے اس کے گاؤں تک پہنچ گیا۔

عالیہ کے والد شجاعت محمد اور بھائی حیات محمد زندہ تھے۔ اس کی والدہ رشیدان بی بی فوت ہو گئی تھی۔ حیات محمد کی شادی ہو چکی تھی اور اس کے تین بچے بھی تھے۔ میں نے ان کے گاؤں نوکری کر لی۔ میں عالیہ کے بھائی حیات محمد کے کھیتوں میں کام کرنے لگا۔ تین سال کی مسلسل محنت کے بعد میں نے پیسے اکٹھے کئے کچھ رقم ادھار لی اور اپنی زمین خرید کر کھیتی باڑی کرنے لگا۔ خدا نے میرے کام میں برکت ڈالی تو بہت جلد ہی میں مزید زمین خریدنے کے قابل ہو گیا۔ میں نے وہیں گاؤں میں شادی کی۔ میرا بیٹا عبداللہ پیدا ہوا، یہ عدنان عبداللہ کا بیٹا اور میرا پوتا ہے۔ سر! میں نے سو سال سے زیادہ عرصہ اس ملک میں گزارا ہے اور اب واپس اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔“ میں نے اپنی کہانی ختم کر دی۔

صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔ سبھی لوگ خاموشی سے میرے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سبھی کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ صرف ایک میں ہی تھا جو رو نہیں رہا تھا کیونکہ میرے آنسو ختم ہو چکے تھے۔ ایک عرصہ ہوا میں نے رونا ہی چھوڑ دیا تھا۔ سفیر صاحب! میں صرف اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔ میں نے سامنے بیٹھے ہوئے امریکی سفیر کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”ارے بابا! جی کیوں شرمندہ کر رہے ہیں؟ میں کون ہوتا ہوں آپ کو روکنے والا۔۔۔“ سفیر صاحب

ترپ کراٹھے اور میرے پاس زمین پر بیٹھ گئے۔

”دادا! میں سمجھتا تھا کہ میرا عشق سب سے اوپر ہے لیکن آپ کے سامنے تو میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ میں تو عشق کی عین تک بھی نہیں پہنچا ہوں۔“ عدنان بھی میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

”باباجی! آپ نہادھو کر تیار ہو جائیں میں ابھی ایمپسی جا رہا ہوں۔ آپ سب کے کاغذات وہاں پڑے ہوئے ہیں۔ میں آپ کے ویزے نہیں بلکہ پاسپورٹ لے کر آتا ہوں۔ میں خود آپ کو جہاز تک چھوڑ کر آؤں گا۔“ وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

”بہت شکریہ سر!۔۔۔“ میں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ انہوں نے میری بات درمیان میں کاٹ دی۔

”باباجی! شکریہ تو مجھے آپ کا کرنا ہے۔ یہ تو میرے لئے اعزاز کی بات ہے۔“ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس سے آگے کی کاروائی آسان تھی۔ دوپہر تک وہ ہمارے کاغذات بنوا کر لے آئے۔ اسی دن شام کو ایک فلائیٹ نیویارک کے لئے نکلنی تھی۔ ہم جہاز میں بیٹھ کر پہلے نیویارک آئے اور پھر نیویارک سے ایک دوسری فلائیٹ پکڑ کر اٹلانٹا آ گئے۔ اس سے آگے کا سفر ہم نے ٹرین سے کرنا تھا۔ ٹرین ممفس سے ہو کر ڈلاس جاتی تھی اور ڈلاس سے آسٹن جاتی تھی۔

”عدنان بیٹا! میں ایک نظر ممفس کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ عاکون کی رسی سے لٹکی ہوئی لاش مجھے آج بھی رات کو خواب میں نظر آتی ہے۔“ عدنان ٹرین کی ٹکٹ لینے کے لئے جانے لگا تو میں نے اس سے کہا۔

”جی دادا! میں یہاں سے ممفس کی ٹکٹ لے لیتا ہوں۔ ہم ممفس شہر میں دو تین گھنٹے گزار کر پھر آگے آسٹن کی طرف چلے جائیں گے۔“ عدنان نے مسکراتے ہوئے کہا اور اندر ٹکٹ لینے کے لئے چلا گیا۔

اٹلانٹا سے ممفس 600 کلومیٹر دور ہے۔ ہم ٹرین کی مدد سے 5 گھنٹے میں ممفس پہنچ گئے۔ ہماری منزل ممفس سے اوپر تیس کلومیٹر کے قریب ملنگٹن تھی۔ یہ اوپر شمال کی طرف ممفس شہر کے مضافات میں تھی۔ ہم نے کرائے پر ایک وین لی اور ملنگٹن پہنچ گئے۔ عاکون کے مالک مارکوس کا ڈیرہ اب شہر کا حصہ بن چکا تھا۔ ہم جیسے ہی وہاں پہنچے ایک بہت بڑا پارک وہاں بنا ہوا تھا۔ وین والے نے گاڑی پارک کے باہر کھڑی کی اور ہم سب نیچے اتر آئے۔

”یہ پارک کب بنا ہے؟“ میں نے وین کے ڈرائیور سے پوچھا۔

”سر! یہ عاکون پارک ہے اور تقریباً پچاس سال پرانا ہے۔ عاکون امریکی سول وار کے سیاہ فام ہیرو ہیں۔ آزادی کی پہلی تحریک اسی شہر سے شروع ہوئی تھی اور وہ اسی مجاہد عاکون کی شہادت سے شروع ہوئی تھی۔“ ڈرائیور ہمیں باقی تفصیل بتا رہا تھا لیکن میں اسے چھوڑ کر آگے پارک میں داخل ہو گیا۔ پارک کے اندر درجنوں کے حساب سے مختلف چھوٹے چھوٹے سیاہ فاموں کے مجسمے بنے ہوئے تھے۔ یہ وہ سیاہ فام تھے جو ممفس کی لڑائی میں شہید ہوئے تھے۔ اندر ڈیرے کی جگہ پر ایک عجائب گھر بنا ہوا تھا۔ میں اندر جانے لگا تو ایک پہریدار نے روک لیا۔

”سر! بغیر ٹکٹ کے آپ اندر نہیں جاسکتے۔“ وہ مجھ سے ٹکٹ مانگنے لگا۔ میں نے اپنے پیچھے کھڑے عدنان کی طرف دیکھا۔

”اوہ سوری! آپ دادا جی کو جانے دیں میں ٹکٹ لے لیتا ہوں۔“ عدنان نے جلدی سے جیب سے بٹوا نکالتے ہوئے کہا۔

دو ڈالر کی ٹکٹ تھی۔ اس نے سبھی کی ٹکٹ لی اور ہم سب اندر عجائب گھر میں آ گئے۔ سامنے ہی عمارت کے بالکل درمیان میں ایک قد آور مجسمہ بنا ہوا تھا۔ جس کے گلے میں رسی ڈال کر پھانسی دی ہوئی تھی۔ یہ عاکون کا مجسمہ تھا۔ وہ مجسمہ ہو یہ ہو عاکون سے ملتا تھا۔ مجسمہ ساز نے انتہائی مہارت سے اسے بنایا تھا۔ مجھے سو سال پہلے کا زمانہ یاد آ گیا۔ بالکل ایسے ہی عاکون کی لاش اس دن لٹکی ہوئی تھی۔ یہ بالکل وہی جگہ تھی۔ میں دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔

”دادا یہ عاکون ہے؟“ عدنان میرے پاس آ کر پوچھنے لگا۔

”میرے بچے! یہ تمہارے عاکون دادا ہیں۔ عالیہ کے ساتھ میرا کوئی دنیاوی رشتہ تو نہیں تھا لیکن محبت اور عشق کا رشتہ ضرور تھا۔ وہ تمہاری دادی تھی اور یہ عاکون بھی تمہارا دادا لگتا ہے۔“ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر تک مزید رکنے کے بعد ہم نے واپسی کا ارادہ کیا اور عاکون کے مجسمے کو الوداعی نظر ڈال کر عجائب گھر سے باہر آ گئے۔ وین والا ابھی تک باہر ہی ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہم وین میں بیٹھے اور وہ ہمیں واپسی ممفس لے آیا۔ ممفس ایک بار پھر ہم نے ٹرین پکڑی اور آسٹن شہر پہنچ گئے۔ آسٹن شہر سے میرا گاؤں برنٹ 90 کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اس زمانے میں ایک بس ہر ایک گھنٹے بعد نکلتی تھی جو لینڈر، لبرٹی ہل اور برٹرام

تک چلی جاتی تھی۔ ہم بس میں بیٹھے اور دو گھنٹے میں برنٹ آ گئے۔

یہ میرا گاؤں تھا، ہم بس سے نیچے اترے تو بس آگے روانہ ہو گئی۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ سڑک کے دونوں طرف مکانات بنے ہوئے تھے۔ بہت چھوٹا سا گاؤں تھا۔ زیادہ سے زیادہ دو سو کے قریب مکانات تھے۔ (آج کا برنٹ گاؤں کافی بڑا ٹاؤن بن گیا ہے۔ گاؤں چونکہ مین شہر سے کافی دور تھا اس لئے زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی بلکہ اسی طرح پرانا گاؤں ہی تھا۔ بس سڑکیں اور گلیاں پکی ہو گئی تھی۔ کچھ مکانات بھی ڈبل سٹوری ہو گئے تھے۔ کچھ مکانات کا اضافہ ہو گیا تھا۔ گاؤں کی آبادی سو سال میں چار گنا بڑھ چکی تھی۔ باقی سب کچھ وہی تھا۔ ابھی بھی گاؤں کا سارا انحصار زراعت پر تھا۔ گاؤں کے اندر ہی کافی ڈیرے اور مویشی فارم بھی موجود تھے۔ گاؤں کے باہر کپاس کے کھیت بھی نظر آرہے تھے۔ میں نے اپنے پوتے عدنان کا ہاتھ پکڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔

”دادا! آپ کو اپنے گھر کا پتہ ہے یا پھر ادھر کسی سے پوچھ لیتے ہیں؟“ عدنان مجھ سے پوچھنے لگا۔

”عدنان بیٹا! انسان کبھی بھی اپنے گھر کا راستہ نہیں بھولتا۔ سو سال گزر جائیں یا ہزار سال انسان کو اپنے گھر کی خوشبودنیا کے دوسرے کونے میں بھی بیٹھے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ وہ آنکھیں بند کر کے بھی اپنے گھر واپس آ سکتا ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا اور آگے بڑھتا گیا۔

پہلی گلی چھوڑ کر دوسری گلی میں ہی ہمارا گھر تھا۔ میں نے جیسے ہی گلی کر اس کی مجھے اپنا گھر نظر آ گیا۔ بالکل ویسا ہی گھر تھا جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔ پورے گاؤں کے مکانات سکڑ کر چھوٹے ہو گئے تھے لیکن وہ گھر اب بھی اتنا ہی بڑا تھا۔ ایک ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا وہ گھر اب بھی ویسا ہی تھا۔ بیرونی دیوار اور دروازہ نیا ضرور تھا لیکن یہ ویسا ہی تھا جیسا سو سال پہلے تھا۔ دیواروں کے اوپر سے گھر کا صحن اور کمرے بھی نظر آرہے تھے۔ وہ بھی نئے ضرور تھے لیکن ان کی ترتیب اور ڈیزائن اب بھی پرانا ہی تھا۔ وہ پہلی نظر میں وہی پرانا گھر ہی نظر آتا تھا جسے نیا رنگ و روغن کروایا گیا ہو۔ میں لکڑی کے بھاری دروازے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

”دادا جی! یہی گھر ہے؟“ عدنان کی ہونے والی بیوی پروین نے پوچھا۔ وہ اور اس کا دادا نوید ہمارے ساتھ ہی آئے تھے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ عدنان نے آگے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹایا اور ہم سب باہر کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگے۔ آج میں اپنے ہی گھر کے باہر اجنبیوں کی طرح انتظار کر رہا تھا۔ ایک دس بارہ سال کے نوجوان لڑکے نے دروازہ کھولا۔

”جی! آپ کون ہیں؟“ بچہ ہماری طرف معصومیت سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے غور سے اس لڑکے کی طرف دیکھا تو مجھے اس میں اپنی شباهت نظر آئی۔ میں بھی بچپن میں بالکل اسی کی طرح دکھتا تھا۔

”بیٹا! میں ایلی ہوں، کبھی اس گھر میں رہا کرتا تھا۔ آپ کے گھر میں کوئی بڑا ہے تو اسے باہر بھیجو!“ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ میرے دل میں ایک بار پھر درد ہونا شروع ہو گیا تھا۔ وہ بچہ دوبارہ گھر میں چلا گیا۔ ایک منٹ سے بھی کم وقفے میں اندر گھر سے کسی کے بھاگنے کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ ایک چالیس پینتالیس سالہ آدمی نے دروازہ کھولا اور ہانپنے لگا۔

”آپ ایلی دادا ہیں؟ ایلس براؤن؟“ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”جی! میں ایلی ہوں، میں اسی گھر میں پیدا ہوا تھا۔۔۔“ میری بات ابھی درمیان میں ہی تھی کہ اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔

”دادا جی! میں آپ کا پوتا ہوں۔ آپ کے بیٹے میکس براؤن کا بیٹا ہوں اور میرا نام چارلی براؤن ہے۔“ وہ مسلسل بول رہا تھا۔

”تم۔۔۔ تم میکس کے بیٹے ہو؟ میرا بیٹا کیسا ہے؟“ میں نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔
”دادا! اب تو بیس سال پہلے فوت ہو گئے تھے۔ فلورین دادی ابھی تک زندہ ہیں اور آپ کا ہی انتظار کر رہی ہیں۔“ وہ ہمیں لے کر اندر آ گیا۔

سامنے ہی مجھے ایک بوڑھی عورت صحن میں بیساکھی کے سہارے کھڑی نظر آ گئی۔ وہ ہماری طرف ہی آ رہی تھی۔ ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں ہی میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ فلورین تھی۔ میں جیسے ہی اس کے نزدیک پہنچا۔ وہ نیچے میرے قدموں میں گر گئی۔

”ایلی! مجھے معاف کر دو، میں نے بہت بڑی غلطی کر دی تھی۔ میں نے اپنی محبت کے لئے دوسرے کی محبت کا خون کر دیا تھا۔“ وہ مجھ سے معافی مانگنے لگی۔

”ارے۔۔۔ ارے فلورین! کیا کر رہی ہو؟ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔“ میں نے جلدی سے اسے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

”ایلی! میں تمہاری اور عالیہ کی گناہ گار ہوں۔ میں نے اپنی محبت کو پانے کے لئے تم دونوں کو الگ کیا تھا، مجھے معاف کر دینا۔“ اس نے ایک بار پھر میرے آگے ہاتھ باندھ دیئے۔

”فلورین! میں نے تم کو معاف کیا۔۔۔ تم نے جو گناہ کیا تھا اس کی سزا بھی تمہیں ملی ہے۔ تم نے سو سال تک اس معافی کا انتظار کیا ہے اور تم نے سو سال کی سزا بھگتی ہے۔ اس سے بڑی اور کیا سزا ہوگی؟“ میں نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا اور اس کے ماتھے کو چوم لیا۔

”فلورین! تم میری بیوی ہو لیکن میں نے کبھی بھی تمہیں ایک بیوی کے حقوق نہیں دیئے۔ ایک چھوٹے سے بچے کے ساتھ اس امریکہ میں اکیلا اور تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔ اپنے بیٹے کو کبھی بھی ایک باپ کا نام نہ دے سکا۔ میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے اور آج اس زیادتی کی معافی مانگتا ہوں۔“ میں نے اس سے معافی مانگتے ہوئے کہا۔

”نہیں ایلی! مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ محبت تم نے بھی کی تھی اور محبت میں نے بھی کی ہے۔ تم نے بھی جو کیا وہ محبت کے لئے کیا اور میں نے بھی محبت کو پانے کے لئے کیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ زیادتی کی ہے اور دونوں ہی اس جرم کی سزا پا چکے ہیں۔“ وہ میرے سینے سے لگ کر رونے لگ پڑی۔ کافی دیر تک رونے کے بعد اس کا دل ہلکا ہوا تو ہم سب اندر کمرے میں چلے گئے۔

”فلورین! باقی لوگوں کا کیا حال ہے؟ میرے بعد یہاں کیا ہوا تھا؟“ میں نے بیٹھتے ہی سوال کیا۔

”ایلی! تمہارے جانے کے بعد زندگی مشکل تو بڑی ہو گئی تھی لیکن بحر حال اسے گزارنا بھی تھا۔ میں جوان تھی اور ایک بیٹا تھا جو صرف دو سال کا تھا۔۔۔ ماں باپ دوسری شادی کر وارہے تھے لیکن میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ تم ایک دن لوٹ کر ضرور آؤ گے۔ میں نے تمہارے والد سے یہ گھراؤ ڈیرہ خرید لیا تھا۔ وہ لوگ اسے گرا کر چھوٹے چھوٹے مکانات بنوانا چاہتے تھے۔ تمہارے دو بھائی اور ایک بہن تھی۔ ان کے آگے بھی اولاد تھی۔ براؤن فیملی کافی بڑی ہو گئی تھی۔ ایک گھر میں ان کا گزارا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے ان کو منہ مانگی رقم دیکر یہ گھر خرید لیا تھا اور پھر یہاں شفٹ ہو گئی تھی۔ تمہارے بیٹے میکس کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھی۔ تمہارا پوتا چارلی تو یہیں میرے ساتھ ہی رہتا ہے۔ دونوں پوتیاں بھی اسی گاؤں میں رہتی ہیں۔ تمہارے بھائیوں میں سے ایک بھائی جیکسن تو سب کچھ بیچ کر آسٹن چلا گیا تھا جبکہ دوسرا بھائی فلیکس اور بہن ازبیل یہیں رہ گئے تھے۔“ فلورین نے تفصیل بتائی۔

”فلورین ان میں سے کوئی زندہ بھی ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”صرف میں ہی ایک رہ گئی ہوں۔ میں بھی شاید اسی لئے زندہ تھی کہ میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے

تمہارا انتظار تھا، خدا نے تمہیں مجھ دے ایک بار ملانا تھا اسی لئے بس اس نے تمہیں اور مجھے زندہ رکھا ہوا ہے۔ ایلی! میں نے سو سال میں صرف ایک ہی دعا مانگی ہے اور وہ ہمارے ملن کی دعا تھی۔ تم عالیہ کے لئے نہیں میری دعا کے دھاگے سے بندھے یہاں تک آئے ہو۔“ وہ اب بھی عالیہ سے حسد کر رہی تھی۔ سو سال سے اوپر عرصہ گزر چکا تھا۔ اس کی عمر ایک سو بیس سال کے قریب ہو چکی تھی لیکن وہ اب بھی دوسری عورت کو برداشت نہیں کر رہی تھی۔ یہی عورت کی فطرت ہے۔

”فلورین! یہ میرا پوتا ہے، عدنان نام ہے اس کا۔“ میں نے اپنے پوتے عدنان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ایلی! یہ بالکل تم پر ہی گیا ہے۔ تم بھی جوانی میں ایسے ہی دکھائی دیتے تھے۔“ اس نے عدنان کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”ڈینیئل بیٹا! یہ تمہارے چاچا لگتے ہیں۔“ اس نے اپنے پڑپوتے ڈینیئل سے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”جاؤ بیٹا! اپنے چاچا کو ساتھ لیکر جاؤ اور ایلی آئی اور امیلیسا آئی کو بتاؤ جا کر۔۔۔ ان کو کہنا کہ ان کا ایلی دادا واپس آ گیا ہے۔“ فلورین نے اپنے چھوٹے پوتے ڈینیئل سے کہا تو وہ عدنان اور اس کی منگیتر پروین کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گیا اور ہم دونوں وہیں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

تھوڑی دیر تک خاندان کے دوسرے لوگ بھی آنے شروع ہو گئے۔ اگلے ایک گھنٹے تک ہمارا پورا گھر ہی بھر چکا تھا۔ براؤن فیملی سو سال پہلے صرف آٹھ افراد پر مشتمل تھی جبکہ آج وہی فیملی 60 کے قریب ہو چکی تھی۔ ہماری ایک گھر پر مشتمل فیملی آج سولہ گھروں تک پھیل گئی تھی۔ برنٹ گاؤں میں ہمارے سولہ گھر تھے۔ عدنان اور اس کی منگیتر پروین ان لوگوں میں گھل مل گئے تھے۔ دوپہر کا سارا وقت ان لوگوں کے ساتھ گزار کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اب عالیہ کی قبر پر جانا چاہتا تھا۔

”چارلی! میرا پوتا عدنان بہت اچھا لڑکا ہے، اسے امریکہ کی کشش یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ یہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔۔۔ بیٹا! اس کا خیال رکھنا۔“ میں اپنے پوتے سے کہنے لگا۔

”دادا! کیسی بات کرتے ہیں؟ یہ میرا بھائی ہے۔ اس کا خیال میں نہیں رکھوں گا تو اور کون رکھے گا؟“ اس نے پیار سے عدنان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ میں نے حسرت بھری نظروں سے اپنے سامنے بیٹھے پورے خاندان کو دیکھا اور گھر سے باہر آ گیا۔ میں گاؤں سے باہر نکل کر قبرستان کی طرف جانے لگا۔ یہ

گاؤں سے کافی ہٹ کر تھا۔ چارلی گاڑی لیکر آ گیا لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔ میں پیدل ہی چلتے ہوئے قبرستان آ گیا۔

”دادا جی! عالیہ دادی کی قبر اس طرف ہے۔“ چھوٹا ڈینیئل مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اس طرف لے جانے لگا۔ مجھے اس کی رہنمائی کی ضرورت نہیں تھی۔ میں عالیہ کی خوشبو سے ہی اس کی قبر پہچان سکتا تھا۔ وہ مجھے لیکر ایک الگ تھلگ قبر کے پاس آ گیا۔ یہ عالیہ کی قبر تھی۔ کچی مٹی کی قبر۔ جس کے سرہانے پرسفید سنگ مرمر کا کتبہ لگا ہوا تھا۔ فلورین نے اس کی قبر کی حفاظت بھی کی تھی۔ قبر کے ساتھ ہی تھوڑا ہٹ کر بادام کا ایک درخت بھی لگا ہوا تھا جس کی چھاؤں عالیہ کی قبر پر پڑ رہی تھی۔ میں آہستگی سے درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

”ایلی! کیسے ہو؟“ میں نے آنکھیں بند کیں تو وہ ا یکدم سے میرے خیالات میں آ گئی۔

”ٹھیک ہوں عالیہ! جی رہا ہوں۔“ میری آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔

”ایلی! میرا گھر کیسا ہے؟ میرے ماں باپ کیسے ہیں؟“ اس کی آواز میں بھی نمی آ گئی تھی۔ اس کی آواز بھی شدت جذبات سے لڑکھڑانے لگی تھی۔

”عالیہ! میں تمہارے والد سے ملا تھا اور تمہارے چھوٹے بھائی سے بھی۔۔۔ حیات محمد تمہیں بہت یاد کرتا تھا۔ دیکھو! تمہاری پوتی بھی آئی ہوئی ہے۔“ میں نے ایک پل کے لئے آنکھیں کھول کر عدنان اور پروین کی طرف دیکھا اور دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ عالیہ واپس چلی گئی۔

”عالیہ۔۔۔ عالیہ۔۔۔!“ میں کافی دیر تک اسے پکارتا رہا لیکن وہ واپس نہیں آئی۔

”دادا! انھیں گھر چلتے ہیں، شام کو سردی ہو جاتی ہے۔“ چارلی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”کونسا گھر؟ میرا تو کوئی گھر نہیں ہے۔۔۔ نہ پاکستان میں اور نہ امریکہ میں۔۔۔ یہ عالیہ کی قبر ہی تو میرا گھر ہے۔ میں نے اس کو چھوڑ کر کہاں جانا ہے؟“ میں خالی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”دادا! وہ آپ کا گھر ہی تو ہے، ہم سب آپ کے اپنے ہیں۔ ہم سب آپ سے محبت کرتے ہیں۔“ وہ میرے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا۔

”چارلی! تو نے اپنی عالیہ دادی کو دیکھا نہیں ہے۔ وہ بہت خوبصورت تھی یار! بہت زیادہ

خوبصورت۔۔۔ اس کے لمس کی خوشبو آج بھی میرے ان ہاتھوں میں محسوس ہوتی ہے۔ وہ۔۔۔ وہ صرف میرے لئے ہی بنی تھی۔ ہم دونوں بالکل راجہ رانی کی طرح تھے۔ یہ چاند ستارے بھی ہماری محبت کو دیکھنے کے لئے نیچے آتے تھے۔ یا راہ عالیہ بہت خوبصورت تھی۔ میں اس کی ایک جھلک کے لئے ہی پوری زندگی غلامی میں گزار سکتا ہوں۔ وہ خوبصورت آنکھوں والی لڑکی عالیہ اس دنیا کی آخری غلام تھی۔ عالیہ وہ غلام تھی جس پر اس دنیا کے ہزاروں بادشاہ قربان تھے۔“ میں نے ایک ہچکی لی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ پچھلے سو سال سے لٹکی ہوئی جان ایک پل میں ہی نکل گئی۔ میں مر چکا تھا۔ میری موت خدا نے عالیہ کی قبر پر لکھی تھی۔ چارلی نے مجھے کندھے سے پکڑ کر ہلایا تو میں ایک طرف کو گر گیا۔ اسی رات فلورین بھی مر گئی۔ وہ بھی میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ دوسرے دن صبح برنٹ گاؤں سے دو جنازے نکلے اور عالیہ کی قبر کے دائیں بائیں دفنا دیئے گئے۔ دنیا کی آخری غلام عالیہ کی کہانی آج ختم ہو گئی ہے۔

ختم شد

ضروری گزارش:

لکھاری سے محبت کتاب سے محبت ہوتی ہے۔ دی عالیہ ناول چھ مہینے کی مسلسل محنت کے بعد مکمل ہوا ہے۔ ناول کیسا ہے اس کا فیصلہ تو قارئین ہی کریں گے۔ میری قارئین سے گزارش ہے کہ اگر انہیں دی عالیہ ناول پسند آیا ہے تو پلیز اس ناول کا حق بھی ادا کریں۔ اس کے بارے میں اپنی قیمتی آراء سے مصنف کو ضرور آگاہ کریں اور اسے جتنا ہو سکے آگے اپنے دوستوں اور چاہنے والوں سے ضرور شیئر کریں۔

میں تین سال سے مسلسل لکھ رہا ہوں لیکن ابھی تک میرے ناولز دس لوگوں سے آگے جاتے ہی نہیں

ہیں۔ دوست احباب پڑھتے ہیں اور ڈیلیٹ کر دیتے ہیں۔ محبت کے لئے لکھتا ہوں محبت کرتا ہوں۔ اگر درس لوگوں سے آگے یہ محبت جاتی ہی نہیں ہے تو کیا فائدہ اس محنت کا۔ بڑے بڑے اچھے لکھاری قلم چھوڑ چکے ہیں ایک دن میں بھی لکھنا چھوڑ دوں گا۔

قارئین کی حوصلہ افزائی کے لئے اگلے ناول میں ہم اپنے تمام چاہنے والے مستقل قارئین کی تصاویر بمع نام اور ایڈریس، ان کے تعریفی پیغامات اور بیش قیمت مشوروں کو ناول کے آخر پر شائع کریں گے۔ اگر آپ بھی اپنی تصویر بمع نام اور ایڈریس، ناول کے بارے میں تعریفی پیغام یا اپنا قیمتی مشورہ ناول میں چھپوانا چاہتے ہیں تو ناول پڑھنے کے بعد کم از کم دس وٹس اپ یا فیس بک گروپس میں ناول کی PDF فائل یا فائل کا لنک شیئر کریں، مصنف کو تعریفی پیغامات بھیجیں یا اپنی قیمتی رائے دیں۔ اگلے ناول میں آپ کی تصویر بمع نام اور ایڈریس، آپ کے تعریفی پیغامات اور آپ کی قیمتی رائے ہمارے ناول کی زینت بنادی جائے گی۔

رضوان علی گھمن

Whatsapp: 0049 152 1122 9099

Facebook: Rizwan Ali Ghuman



رضوان علی گھمن اردو کے ان چند ناول نگاروں میں سے ایک ہیں جو انتہائی نامساعد حالات میں بھی اردو ادب کی ترقی اور ترویج کے لئے کوشاں ہیں۔ رضوان علی گھمن ناول نگاری کے میدان میں ایک نیا چہرہ ہیں جو تیزی سے ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ یہ موجودہ دور کے ناول نگار ہیں اور ان کے کریڈٹ پر رومانی، ایکشن، ایڈونچر اور تھرلر ناولز کے علاوہ سفر نامے بھی ہیں۔

انہوں نے سیاست کے موضوع پر بھی کتابیں لکھی ہیں جبکہ بچوں کے لئے بھی ان کی کافی کہانیاں شائع ہو چکی ہیں۔ نیز پنجاب کی رومانی داستان ہیرا، انجھا بھی اردو لکھ چکے ہیں۔ امریکی سول وار کے بیک گراؤنڈ میں ایک تاریخی رومانی اردو ناول بھی ان کے کریڈٹ پر موجود ہے۔

رضوان علی گھمن بہاولپور کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں اور 2007ء سے روزگار کے سلسلے میں یورپ کے مختلف ملکوں میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اردو اور انگلش کے علاوہ یونانی، اٹالین اور جرمن زبانوں پر عبور رکھتے ہیں اور متعدد یورپی اخبارات و جرائد میں کالم لکھ چکے ہیں۔ ان کے ناولز میں یورپی معاشرے اور یورپین کلچر کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔

رضوان علی گھمن کے ناولز اور سفر نامے نئے اور اچھوتے موضوعات پر مبنی ہوتے ہیں اس لئے قارئین ایک بار ضرور پڑھیں۔ ان کے ڈائلاگ اور ناولز دوسرے عام رومانی ناولز سے منفرد حیثیت کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہوتے ہیں۔ امید ہے زیر نظر ناول بھی قارئین کو پسند آئے گا۔

قارئین سے گزارش ہے کہ ناول پسند آنے پر مصنف کو ضرور اپنی قیمتی آراء سے نوازیں اور اپنے دوست احباب کو بھی شیئر کریں۔ آپ کی حوصلہ افزائی سے ہی رضوان علی گھمن مزید نئے اور قارئین کے ذوق کے مطابق ناول لکھتے رہیں گے۔ رضوان علی گھمن کے کسی بھی ناول کے بارے میں اپنی قیمتی رائے دینے یا کسی ناول کی فری PDF فائل حاصل کرنے کے لئے ان سے نیچے دیئے گئے نمبر پر براہ راست رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

رضوان علی گھمن

Whatsapp: 0049 152 1122 9099

Facebook: Rizwan Ali Ghuman